سوزِ ناتمام

تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور

سوزِ ناتمام

از

عاشق حسین بٹالوی

ناشران

تاج کمپنی لمیٹڈ ریلوے روڈ۔ لاہور

فہرست

انتساب

اُس عقیدت و نیاز مندی کے ادنےٰ اظہار
کے لئے جو مجھے آپ کی ذاتِ گرامی سے ہے مَیں
اس ناچیز ادبی کاوش کو اپنے محترم دوست،
خان بہادر نواب احمد یار خاں دولتانہ کے
نامِ نامی سے معنون کرتا ہوں۔

"ع"

لاہور
۱۰؍ دسمبر ۱۹۳۶ء

مقدّمہ

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے

غالبؔ کے مندرجہ بالا شعر میں جس بلیغ حقیقت کی طرف اشارہ ہے اس کا اظہار تنقید و ادب کی دُنیا نے مختلف پیرایوں میں اس کثرت سے کیا ہے کہ اس کی تکرار بعض لوگوں کو شاید گراں گزرتی ہو لیکن ادبیات بلکہ تمام فنونِ لطیفہ میں، یہ نکتہ ایک ایسے بنیادی مسئلے کی حیثیت رکھتا ہے کہ اس کو اچھی طرح سمجھے بغیر ان فنون کی تخلیقات پر کوئی صحیح تنقید کرنا ممکن نہیں ہے۔ ہر صنّاع اپنی تخلیقاتِ فن میں "اپنے دل کا معاملہ کھولتا ہے۔" اسی سے اُن کو زندگی ملتی ہے اور اُن کے خال و خد میں دلکشی و رعنائی، حرکت و ارتعاش اور روانی و گفتار پیدا ہوتی ہے جب افلاطون نے اربابِ فن کی تخلیقات کو ان کی اولاد سے تشبیہ دی تھی تو کچھ غلط نہیں کیا تھا۔ اعلےٰ درجے کی صنّاعی کبھی صنّاع کے تجربۂ حیات سے بے نیاز

نہیں ہوتی۔ بلکہ یوں کہئیے کہ صناع کے لئے اس کے سوا چارہ ہی نہیں ہے کہ اپنی روح تخلیقات میں ڈال دے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زندگی اپنے اظہار کے لئے یا بقول غالب اپنے آپ کو "رسوا" کرنے کے لئے ہر وقت بیتاب رہتی ہے اور جب یہ بیتابی رخصت ہو جائے تو زندگی اپنی میعاد ختم کر کے موت کی صورت میں منقلب ہو جاتی ہے تخلیق فن کی تہ میں بھی زندگی کا وہی اصول کار فرما ہے جس سے صبح خوان طیور کے نغمے پیدا ہوتے ہیں۔ ہر ادبی تصنیف سے اس کے مصنف کی شخصیت صاف صاف یا بذریعہ اشارہ تعبیر ضرور آشکار ہوتی ہے۔ اس کے بغیر وہ تصنیف ایک قالب بے جان ہے جب کوئی شخص ایک اچھی کتاب پڑھتا ہے تو وہ اس کتاب کے اوراق ہی سے نہیں بلکہ اسکے مصنف سے بھی دو چار ہوتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ پڑھنے والا اُس فہم و ذکاوت سے بہرہ در ہو جس کے بغیر کتاب کا مضمون اور مصنف دونوں صفحۂ قرطاس سے نہیں ابھر سکتے غالب نے اس حقیقت کو بھی اپنے خاص انداز میں بڑی خوبی سے بیان کیا ہے ؎

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبع خریدار دیکھ کر

جب میں نے اپنے دوست جناب عاشق حسین بٹالوی کی کتاب سوزِ ناتمام کو پڑھنا شروع کیا تو غالب کا یہ شعر رہ رہ کر میرے ذہن میں آیا۔ ہمارے عہد میں شاید ہی کوئی ایسی کتاب شائع ہوئی ہو گی جس نے مصنف کی شخصیت کو اس شدت سے منکشف کیا ہو۔ یہ افسانے نہیں ہیں مصنف نے ہمیں اپنے دل و جگر سے دعوتِ لختِ لخت دی ہے۔ اس انکشافی پہلو کے اعتبار سے ان افسانوں کے

بے پناہ جوش و قوت کی نوعیت ایسی ہے کہ مقابلے کے لئے ہمیں دنیا کی بعض مشہور خود نوشتہ سوانح عمریوں تک جانا پڑتا ہے لیکن مصنّف کی شخصیّت کا اظہار ہی کسی کتاب کا ابتدا و منتہا نہیں ہوتا۔ ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ جن خیالات و افکار کو وہ قید تحریر میں لایا ہے وہ کیا ہیں، زندگی کے مختلف مسائل کے متعلق اس کا طرز فکر و احساس کیا ہے اور آخر میں اُسکے اندازِ بیان اور اسلوبِ تحریر کو پیشِ نظر رکھ کر اس کا بھی لحاظ کرنا ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتا ہے اُسے کامیابی کے ساتھ کہہ بھی سکا ہے یا نہیں۔ گویا نقاد کا کام یہ ہے کہ زیر بحث مصنّف کے متعلق بہ وضاحت ان تین سوالوں کا جواب دے کہ وہ کون ہے۔ کیا کہتا ہے اور کس طرح کہتا ہے؟

حضرتِ عاشق بٹالوی کون ہیں؟ ان کے حلقۂ احباب میں اس سوال پر شاید ہنسی کی ایک گونج پیدا ہو لیکن درحقیقت یہ استفسار اتنا بے معنی نہیں ہے جتنا بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے ؎

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

حضرتِ عاشق کی شخصیت کی تصویر دکھانے کے لئے اگر میں ہندوستان کی گذشتہ صدی کی تاریخ اور بالخصوص ہنگامہ ۵۷ء کی طرف رجوع کروں تو شاید وہ خود بھی چونک کر میری طرف دیکھیں گے لیکن سچ ہے کہ دُنیا کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی حقیقت ایسی نہیں جس کو پوری طرح سمجھنے کے لئے صرف

اس کا حاضر الوقت میکانکی تجزیہ کافی ہو۔ گھاس کی ایک تھرتھراتی ہوئی پتی، درختانِ صحرا کا ایک برگِ سبز لاتعداد اسباب و علل کی کسی زنجیر کی محض ایک کڑی ہوتا ہے۔ اس مختصر سی تشریح کے بعد اگر میں اپنے اصل دعوے کی طرف عود کروں اور کہوں کہ ان افسانوں کا بیج (معنوی طور پر میں ان افسانوں اور حضرت عاشق میں کوئی تمیز نہیں کرتا) ہنگامہ ۵۷ء میں بویا گیا تھا تو قارئینِ کرام زیادہ متعجب نہ ہونگے۔ یہ افسانے اور انکے بین السطور کی پنہاں بے قراریاں مغربی اور مشرقی، انگریزی اور ہندوستانی تمدنوں کی آویزش کا ثمر ہیں۔ اس آویزش کا آغاز دراصل اُسی دن ہو گیا تھا جس دن آج سے ٹھیک تین سو برس پہلے شہنشاہِ ہند نے اپنی نورِ نظر جہاں آرا بیگم کا علاج ڈاکٹر باٹن سے شروع کرایا۔ اُس دن سے لے کر آج کے دن تک ہم اس کشمکش میں قدم بہ قدم پسپا ہو رہے ہیں۔ تجارت، دولت، حکومت، علم و حکمت کوئی میدان ایسا نہیں جہاں ہم نے شکست نہ کھائی ہو۔ اور ہماری ہر سیاسی اور تمدنی، عقلی اور مذہبی ہزیمت تپتے لوہے کے داغوں کی طرح ہماری رُوح میں اپنا جلتا ہوا سراغ نہ چھوڑ گئی ہو۔ اُنیسویں صدی کے وسط میں جب ہماری ذہنی اور جسمانی محکومی ایک غیر مشتبہ حقیقت کی طرح ہمارے سامنے آ گئی تو ہماری مشرقیت نے اپنی ہستی کو برقرار رکھنے کے لئے اپنے منتشر قوا کو مجتمع کر کے ایک آخری کوشش سے ہنگامہ ۵۷ء برپا کیا۔ اس خونریز جنگ نے ہماری رہی سہی بربادی کا پیمانہ لبریز کر دیا اور انگلستان

کے ہاتھوں ہمیں ایک ایسی خوفناک شکست کا مُنہ دیکھنا پڑا جس کی مثال سے ہماری قدیم تاریخ کے اوراق یکسر خالی تھے۔ انگلستان کو ہم پر عظیم الشان فتح حاصل ہوئی لیکن یہ فتح عظیم تر فتوحات کا پیش خیمہ تھی۔ ہنگامہ ۵۷ء سرحد کا ایک خونریز معرکہ تھا جسے ہندوستان کی تسخیر کی تمہید کہہ سکتے ہیں اس کے بعد میدانِ کارزار ہندوستان کے قلب میں برپا ہوا۔ اب مشرق و مغرب کی صحیح آویزش شروع ہوئی۔ لیکن اس آویزش میں ۱۸۵۷ء کے بعد عرصہ پیکار ہمارے دل تھے نہ کہ ہمارے ملک کے وادی و صحرا۔ ہمارے دلوں کے اندر ایشیا اور یورپ کی جنگ جاری رہی اور یہاں بھی ہمارے عساکر ناگزیر طور پر پسپا ہوتے گئے۔ قوموں کی آویزش کے بعد اب تمدنوں کی آویزش جاری تھی اور فاتح قوم کا تمدن ہمارے دل و دماغ کے گوشے گوشے میں ہمارے قومی تمدن پر غالب آ رہا تھا۔

یہ عظیم تر شکست جو ہندوستان کو اپنی روح سے بیگانہ بنا رہی تھی اس قدر خوفناک ثابت ہوئی کہ ہنگامہ ۵۷ء سے نصف صدی بعد تک ہندوستان میں خاکِ مذلت سے سر اُٹھانے کی ہمّت بھی نہ تھی۔ ادبیات کا شجرِ بلند جس کی جڑوں کے ننّھے ننّھے ریشے اپنے حالاتِ گرد و پیش سے غذا حاصل کرتے ہیں۔ اور جس کے پتّے صرف اپنی قومی تہذیب کے آفتاب سے زندگی کا رس چوس سکتے ہیں۔ اس زہریلی فضا میں تاراج ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ہمارے سب سے بڑے شاعر غالبؔ نے ناگہاں اپنی زبان بند کر لی۔ اب وہ اپنے دوازدہ سالہ دورِ نثر میں داخل ہوا مگر اس

کی انشاء پردازی دوستوں کے ساتھ اپنا دل بہلانے تک محدود تھی۔ نوجوان نسل کے شعراء میں سے بعض نے دلِ زندہ کی رام کہانی ہمیشہ کے لئے چھوڑ دی اور بعض نے ہندوستانی ریاستوں کے ظلِ عاطفت کے نیچے سر جا چھپایا جہاں کی فضا ان کی قابلیتوں کے لئے زیادہ سازگار تھی۔

دراصل اچھا ادب صرف ایک پختہ تمدن کا ثمر ہوتا ہے جب تک کوئی مستقل تمدنی روایات پیچھے نہ ہوں، ادب کے لب و لہجہ میں نہ وہ لطافت پیدا ہوتی ہے اور نہ وہ عظمت جس کے بغیر نہ بولنا بولنے سے بہتر ہے یہی وجہ ہے کہ عرب میں ظہورِ اسلام کے بعد جب دورِ جاہلیت کے مخصوص طرزِ تمدن کی بنیادیں ہل گئیں تو اس دور کے شعرا خود بخود خاموش ہو گئے۔ ان شعرا کو فنا کرنے کے لئے اسلام کو قانون کی طاقت سے کام نہ لینا پڑا بلکہ جو معاشرتی و روحانی انقلاب اسلام اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس نے خود بخود جاہلیت کی شاعری سے اس کا آب و رنگ چھین لیا۔

انگریزی عہد کے سیاسی و تمدنی انقلاب نے اُردو ادب پر ایک کاری ضرب لگائی۔ اب بھی لوگ شعر کہتے تھے، مگر بقولِ اسمٰعیل میرٹھی ؎

گاہے ماہے اور وہ بھی جھوٹ موٹ

دہلی کی فرسودہ زندگی میں اب وہ بات ہی نہیں رہی تھی جو شاعری کے مضمون سجھاتی۔ فکر و عمل، علم و اخلاق اور تمدن و معاشرت کے وہ تمام سرچشمے جو ہندوستانی فنون میں زندگی کی رو دوڑا رہے تھے خشک ہو چلے تھے۔ خواجہ حالؔی نے یہ فرق محسوس

کر کے اُسے اپنے بہترین انداز میں ظاہر کر دیا ہے

ہوا کچھ اور ہی عالم میں چلتی جاتی ہے   ہنر کی عیب کی صورت بدلتی جاتی ہے

اس صورتِ حال میں اُن تمام شعرا کا یک قلم خاموش ہو جانا ناگزیر تھا جن کا کمال ایک خاص سیاسی و عمرانی ماحول کی ترجمانی یا بالفاظ دیگر اس ماحول کے پس منظر پر شخصی جذبات و واردات کا اظہار تھا کہ اسی پر دراصل شاعری کا مدار ہے۔ غالبؔ سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے غزل گو شاعر تک سب اسی اصول کے ماتحت آجاتے ہیں۔ خواجہ حالیؔ اُن چند شعرا میں سے تھے جو شخصی زندگی کے دائرے سے نکل کر جماعتی زندگی کے تصوّر تک پہنچ سکے۔ ان کے کلام کا بہتر و بیشتر حصّہ قوم کی مرثیہ خوانی پر مشتمل ہے۔ اپنی قوم کی تاریخی عظمت کا خیال حالیؔ کو اپنے اُن معاصرین سے بہت بلند کر دیتا ہے جو دورِ گزشتہ کے متغزلین کی تقلید میں نظم کو اپنے شخصی جذبات کے اظہار کا مصنوعی ذریعہ بنا رہے تھے۔ اُردو شاعری کے بہترین حصّے کی یہ روش اب تک قائم ہے اور ہمارے عہد نے جماعتی زندگی کے حقائق کا سب سے جلیل القدر ترجمان پیدا کیا ہے۔ اقبالؔ کسی ہزیمت خوردہ فوج کے اُس سالار کے مانند ہے جو اپنے منہدم شدہ شہر کے کھنڈروں پر کھڑا ہوا فتح کا نقارہ بجاتا اور آنے والی کامیابیوں کی بشارت دیتا ہے یہ اس لئے کہ جہاں حالیؔ نے ہر طرف یورپ کی قوتوں کا غلبہ دیکھا تھا، ہاں اقبالؔ نے اُن دھندلے آثار کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے جو ایک سیلاب ہلاکت کی طرح خود یورپی تہذیب کو غرق کرنے کے لئے مستعد ہو رہے ہیں۔ لیکن اُردو ادب کے جماعتی

زنگ نے شخصی رنگ کو ہمیشہ کے لئے دبا نہیں دیا۔ ہمارے وہ ادیب جو قومی زندگی کے تصوّر سے وابستہ نہ ہو سکے اپنے شخصی جذبات کے اظہار کا کوئی موزوں وسیلہ نہ پا کر پہلے نظم میں اور پھر ناول اور افسانے میں ترجمے کے ذریعے سے اپنے ذوقِ ادب اور احساسِ جمال کو تسکین دینے لگے۔ ترجمہ شدہ یا ترجمہ نما نظموں اور افسانوں کا ایک طوفان رسائل کے ذریعے سے ملک کی ادبی فضا پر چھا گیا۔ ترجمے کے دور کی اس ہمہ گیری سے پہلے آج سے سَتّر اسّی برس قبل پیارے لال نے "من سُکھی اور سندر سنگھ" اور "خوشحال چند اور ہیرا" کے قصّے لکھے جو صحیح معنوں میں طبعزاد تھے۔ اور اس صنفِ ادب کے زندۂ جاوید شاہکاروں میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔ مگر پیارے لال کا خمیر حالیؔ نذیر احمد اور آزاد کی طرح قدیم دہلی کی خاک سے اُٹھا تھا اور قدیم دہلی کی اس آواز کے خاموش ہوتے ہی انگریزی افسانوں کے ترجمے تقریباً نصف صدی تک اردو افسانہ نگاری کا تنہا سرمایہ بنے رہے۔ مگر اس نصف صدی کے عرصہ میں زمانہ پھر ایک بار کروٹ لے چکا تھا۔ ہندوستان کے نوجوان ادیبوں نے ایک نئے مکتب میں ایک نئی زبان اور نیا لب ولہجہ سیکھ لیا تھا۔ جس کی مدد سے وہ اپنے دل کی داستان سُنا سکتے تھے۔ اب ہمارے شاعر اور فسانہ نگار بولتے ہوئے الفاظ میں اپنی شخصیت کی تصویر دکھانے لگے۔ مگر یہ شخصیت کیا تھی؟ شکستوں، سرگردانیوں اور بے تابیوں کا مرقع! ہماری مشرقی طینت اور ہماری مغربی تربیت کی ناسازگاری ہمارے دلوں کو ایک عرصہ سے پیکار بنا رہی تھی۔ ۱۸۵۷ء سے لیکر اب تک ہمارے فکر و احساس، علم و اخلاق اور

تمدّن و معاشرت نے یورپ کی افواجِ ظفر موج سے جو شکستیں کھائی تھیں۔ اب اُنکی تاریخ شاعری اور افسانے کے خونیں اوراق پر مرتسم ہونے والی تھی۔ ہندوستان کے دل کا سوزِ ناتمام اب دہکتے ہوتے انگاروں کی طرح بول اُٹھا تھا۔ اور چند بے حد ذکی الحس ادیبوں کا ایک گروہ اس کا ترجمان بنا ہوا تھا۔

یہاں تک ہم نے ۱۸۵۷ء سے لے کر اب تک کی ادبی تاریخ پر ایک سرسری نگاہ ڈالی ہے ہم مختصر طور پر ان واقعات کو دیکھ چکے ہیں جن کے پیدا کئے ہوئے ماحول میں سوزِ ناتمام جیسی تصنیف کا ظہور ممکن ہی نہیں بلکہ قرینِ قیاس ہو جاتا ہے۔ یہ ماحول مشرق و مغرب کے تمدّن کی آویزش اور اس آویزش میں ہماری شکست کے احساس سے پیدا ہوا ہے۔ بہت سے حقائق جو ہمارے خالص مشرقی دور میں یقینیات کا درجہ رکھتے تھے مغربی خیالات کی ٹکّر سے ظنّیات میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں بہت سے مستقل معیار مٹ چکے ہیں اور اس انقلاب نے ہمیں ایک دورِ استفہام ایک دورِ اضطراب میں لا ڈالا ہے۔ "سوزِ ناتمام" کے افسانے اس دورِ اضطراب کے بہترین شارح ہیں۔

لیکن سوال پیدا ہو گا کہ مشرق و مغرب کی آخر وہ کونسی قوتیں ہیں جن کی آویزش نے اس دورِ استفہام و اضطراب کو پیدا کیا ہے؟

سب سے پہلے تو اقتصادی کشمکش کا ذکر کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اس میدان میں ہماری شکستِ فاش اس قدر قطعی ہے کہ اس باب میں اختلافِ رائے کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ انگلستان کو پہلے پہل تجارت کی ہوس ایسٹ انڈیا کمپنی کی شکل میں ہندوستان

لائی تھی اور اسکے موجودہ سیاسی تفوق کا یہ تجارتی پہلو اب تک قائم ہے اس کا اثر ہندوستان میں تاجر و غیر تاجر ہر فرد بشر پر پڑا ہے۔ دُنیا میں شاید ہی کوئی ملک ایسا ہو گا جہاں یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل نوجوان عسرت کی اُس بھیانک منزل میں داخل ہونے پر مجبور ہوں جہاں خودکشی کے سوا زندگی کے عقدے کا کوئی اور حل ممکن ہی نہ ہو۔ ۱۹۱۴-۱۸ء کی جنگِ عالمگیر نے پڑھے لکھے بیکاروں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ کر کے اس مسئلے کو اور بھی پیچیدہ بنا دیا۔ اس صورتِ حال کی جھلک "سوزِ ناتمام" کے صفحات میں ایک دُھندلے سے پس منظر کی طرح بار بار آتی ہے اور مجموعے کے پہلے افسانے "زندگی" کا ہیرو اصغر تو اسی قسم کے واقعات کا شکار یا یوں کہیے کہ شکاری ہے۔

مشرق و مغرب کی جنگ کا ایک خوفناک میدان مذہب ہے۔ اقتصادی پریشانیوں سے بعض خوش نصیب بچ بھی گئے لیکن اس رُوحانی خلفشار سے شاید ہی کوئی محفوظ رہ سکا ہو۔ مغربی سائنس کی ٹکر نے قضا و قدر اور معجزات و خوارقِ عادات کے متعلق اکثر نوجوانوں کے اعتقاد کو متزلزل کر دیا۔ نیکی اور بدی کے متعلق بھی خیالات میں مختلف قسم کی اہم تبدیلیاں ہونے لگیں۔ یہ کیفیت ہمارے عہد میں آ کر اپنے پورے جوش کے ساتھ ظاہر ہوئی لیکن حالی نے شاید اسی قسم کے کسی ابتدائی احساس سے متاثر ہو کر بہت پہلے کہا تھا کہ زمانے کا انقلاب خود عیب اور ہنر کی صورت کو بدل رہا ہے۔ جمہوری اور اشتراکی خیالات کی رَو نے بادشاہ اور حاکم کی حیثیت بلکہ ہر قسم کے اقتدار یہاں تک کہ والدین اور شوہر کے اقتدار کے متعلق بھی طرح طرح کے شبہات اور اعتراضات پیدا کر دیئے۔

اس کا اثر لازماً خدا کے تصوّر پر بھی پڑا۔ اور جناب باری تعالےٰ کی ذات و صفات کے متعلق طرح طرح کے وسوسے دماغوں کو بے چین کرنے لگے۔ صاحبِ فہم و احساس نوجوانوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جسے موجودہ عہد کے مضطربانہ استفہام نے زندگی کی کسی نہ کسی منزل میں اس قسم کے سوالات سے دوچار نہ کیا ہو۔

"کون سمجھ دار انسان گھڑی بھر کے لئے باور کر سکتا ہے کہ قدرت کا ہر فعل بہتری پر مبنی ہے؟ کیا یہ ظلم اور فساد، قحط اور تباہیاں دُکھ اور مصیبتیں کسی بہتری کے لئے ہیں؟ دُنیا میں خوشی ناپید ہے ہم میں سے ہر شخص کسی نہ کسی تکلیف اور پریشانی کا شکار ہو رہا ہے۔ جدھر دیکھو مصیبت ہی مصیبت نظر آتی ہے۔ ایک دُکھ کا مداوا کرو تو دوسرا ابھار ہے اور اس طرح مصیبتوں کے ایک لامتناہی سلسلے کا نام ہم نے زندگی رکھ لیا ہے کہتے ہیں مرنے کے بعد انسان کو ابدی راحت ملتی ہے مَیں پوچھتا ہوں اگر موت ہی راحت کا دروازہ ہے تو پھر قدرت کو تخلیق انسانی سے کیا مقصود تھا؟"

سب سے آخر میں، مگر زیرِ بحث افسانوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے سب سے بڑھ کر معاشرتی خیالات کا وہ تصادم ہے جس نے ہماری سوسائٹی کو مختلف النوّع عناصر کا ایک عجیب و غریب مرکب بنا دیا ہے۔ میرے خیال میں کسی سوسائٹی کی ہیئتِ ترکیبی کو سمجھنے کے لئے یہ جان لینا کافی ہے کہ اُس سوسائٹی میں پہلے خدا اور پھر عورت کی حیثیت کیا ہے۔ خدا کا اور عورت کا تصوّر دراصل ایک ہی معاشرتی حقیقت کے دو رُخ

ہوتے ہیں کسی شخص کے لئے یہ ناممکن ہے کہ عورت کی فطرت کے متعلق شبہات کا شکار ہو جائے اور خدا کی ہستی کے متعلق اس کے دل میں شکوک پیدا نہ ہوں۔ شوپنہار کی شہرۂ آفاق عورت دشمنی کے ساتھ اس کی شہرۂ آفاق خدا دشمنی لازماً شامل تھی۔ مغربی تمدن نے جو ہماری روح کے گوشے گوشے کی تسخیر پر تُلا بیٹھا تھا خدا کو ٹھکانے لگا کر اب عورت پر وار کیا مگر اُس کی حمایت کے رنگ میں۔ اس نے ہمیں اکبر مرحوم کے الفاظ میں بتایا کہ عورت "چراغِ خانہ" بن کر رہنے کے لیے نہیں بلکہ "شمعِ انجمن" کی طرح فروزاں ہونے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ گزشتہ صدی کے رُبع سوم تک شریف عورتیں کم و بیش ایک عضوِ معطل کی طرح گھروں میں اپنی شرافت کا ثبوت دے رہی تھیں۔ اب وہ اپنی قدیم طرز بود و ماند کے گوشۂ عافیت سے نکل کر زندگی کی محفل میں داخل ہوئیں۔ پردے کے مسئلے اور حقوق نسواں کی تحریک نے ہماری سوسائٹی میں جتنا خلفشار پیدا کیا اتنا مغرب کے لائے ہوئے کسی انقلاب نے شاید نہیں کیا۔ اور یہ خلفشار بجا بھی تھا۔ کیونکہ یورپ کا یہ وار ہماری معاشرتی زندگی کی بنیاد پر پڑ رہا تھا۔ شعرا میں اکبر الہ آبادی نے اس انقلاب کو سب سے زیادہ اضطراب کے ساتھ دیکھا۔ حالی نے بھی شروع میں ہندوستان کی "ماؤں بہنوں بیٹیوں" کو اُن کی قدیم تہذیب کا واسطہ دے دے کر اس گمشدہ بہشت کی طرف بُلانا چاہا جواب بتدریج بے کیف و بے رنگ ہوتی جا رہی تھی[1]۔ لیکن اکبر کی زمانہ

---

[1] شلے دے کے، اے ستونتیو! دنیا میں اب ست تم سے ہے۔"

شناس آنکھ نے حقیقت کا بے رحم چہرہ ایک نظر میں دیکھ لیا تھا ؎

حرم سرا کی حفاظت کو تیغ ہی نہ رہی　　تو کام دینگی یہ چلمن کی تیلیاں کب تک

اکبر کے بعد دوسری نسل کے ادیبوں میں مولانا ظفر علی خاں نے اس معاشرتی انقلاب کو شدت کے ساتھ محسوس کیا ؎

کیا ہے ایکا دماغ و دل نے　　نئے نئے گل لگے ہیں کھلنے

کسی نے بُرقع اُتار پھینکا　　کسی نے چلمن ہی توڑ ڈالی

مولانائے ممدوح کا یہ انداز خیال آج تک قائم ہے۔ اس صدی کے آغاز میں آپ نے "پردے کا جنازہ" کے عنوان سے ایک افسانہ تحریر فرمایا تھا۔ اس کے بعد غالباً سیاسی مصروفیتوں نے افسانہ نگاری کا موقعہ نہیں دیا مگر جس نئے "ہنگامی" انداز شاعری کے سب سے بڑے اُستاد آپ ہیں۔ اس میں آپ نے وقتاً فوقتاً انہیں خیالات کا اظہار کیا ہے۔ آزادیِ نسواں کے متعلق مولانا ظفر علی خاں کا اضطراب ایک طنز آمیز عناد کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ اکبر کے اضطراب کے ساتھ طنز شامل ضرور ہے۔ تاہم یہ طنز بارہا ایک افسردہ تبسم کی یاد دلاتی ہے لیکن ذاتی درد کی جو کسک "سوزِ ناتمام" کے اوراق میں ملتی ہے۔ وہ اس سے پہلے اُردو ادب میں کہیں نظر نہیں آتی۔ وجہ یہ ہے کہ اکبر اور ظفر علی خاں کی تصانیف میں ایک جماعت کے احساسات کی ترجمانی کا حق ادا کیا گیا ہے۔ مگر "سوزِ ناتمام" کے الفاظ میں ایک بے قرار شخصیت بول رہی ہے۔

گزشتہ صدی میں عورتیں گھروں کی زینت اور بقائے نسل کی ضامن تھیں۔ اُن کی دلچسپیاں محدود تھیں اور خانگی زندگی کی ذمہ داریاں اُنہیں مطمئن رکھتی تھیں۔ اُن کو بے حد عزت و آسائش حاصل تھی مگر مردوں کی ذہنی و روحانی رفاقت سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ مرد روح و دماغ کی لطیف ترین رفاقت کے لئے اپنے دوستوں کی صحبت ڈھونڈتے تھے۔ مرزا غالبؔ جب کوئی اچھی غزل کہتے تھے تو اُس کی داد لینے کے لئے اپنی بیگم صاحبہ سے رجوع نہیں فرماتے تھے۔ اُنکے کلام کی تحسین کا حق نیرؔ و شیفتہؔ اور عارفؔ و حالیؔ جیسے احباب ہی ادا کر سکتے تھے۔

ان حالات و مقتضیات نے دوستی کو ایک مستقل معاشرتی ادارہ بنا دیا تھا مردوں اور عورتوں کی ملی جُلی مجلسیں گرم کرنے کے لئے تعلیم یافتہ و شائستہ طوائفوں کا طبقہ موجود تھا۔ ازبسکہ گھروں کی مقدس چاردیواری میں نامحرموں کا بار پانا خارج از بحث تھا۔ مگر جوں ہی زمانے کے انقلاب نے ہندوستان کی زمامِ حکومت انگریزوں کو سپرد کی یہ حالات بدلنے لگے۔ مردوں کی باہمی دوستی میں وہ گرمی و ہنگامہ نہ رہا اور طوائفوں کی تعلیم و شائستگی اور اثر و رسوخ بتدریج زائل ہونے لگا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دوستوں اور طوائفوں نے جن معاشرتی ضرورت کو پورا کر رکھا تھا، اب اُسے گھروں کی خواتین بوجہ احسن پورا کر رہی تھیں۔

یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ "سوزِ ناتمام" کے اوراق میں جو چیز ہمیں سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ دوستی کے قدیم تصور کے ساتھ مصنف کی

والہانہ وابستگی ہے عجب نہیں کہ ہماری تہذیب اپنے دور آغاز میں کسی حد تک دوستی کے قدیم یونانی نصب العین سے متاثر ہوئی ہو۔ اس خیال میں اگر صحت نہ بھی ہو تب بھی یہ حقیقت بہر حال قائم ہے کہ پرانے قصص و حکایات میں دوستداری کو زندگی کا مقدس ترین تعلق ظاہر کیا گیا ہے اور صاحب "سوز ناتمام" نے گویا اسی روایت کو جدید ہندوستان کی فضا میں جاری رکھا ہے۔ انگریزی ہندوستان کی عورت کے متعلق اس کے دل میں حسن ظن نہیں ہے۔ اس کا تقریباً ہر فسانہ عورت کی طرف ایک کینہ آمیز اشارہ کر کے گویا زبانِ حال سے یہ کہتا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیز اور مرد دوستوں کی جگہ لے سکے! عجیب اتفاق ہے کہ "سوزِ ناتمام" کی دُنیا میں جو ایک طوائف ہمیں ملتی ہے وہ بھی بدقسمتی سے اپنا قدیم پیشہ ترک کر کے گھر کی شریفانہ زندگی اختیار کر لیتی ہے۔ اور ہمیں تنہا چھوڑ جاتی ہے لیکن غنیمت ہے کہ ہمارے دوست ابھی ہاتھ سے نہیں گئے۔ دوستانہ تعلقات کے حسین و جمیل مرقعے ہمیں "سوزِ ناتمام" کے ورق ورق میں ملتے ہیں۔ جونہی مصنّف ہمیں دوستوں کی کسی محفل میں لے جاتا ہے اُس کی زبان میں وہ ملاطفت اور شیرینی پیدا ہو جاتی ہے جسے ہم عام طور پر عشق کے نازونیاز سے مخصوص سمجھتے ہیں۔ "حکایتِ خونچکاں" میں افضال اپنے دوست کو جو خطوط لکھتا ہے۔ اُن کا انداز دیکھئے اور ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھتے جائیے کہ دوستوں کے تعلقات کا نقشہ دکھانے کے لئے واقعیت کا اصلی رنگ اس تحریر میں کس طرح جھلکتا ہے:۔

(۱) تم بعض دفعہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں پوچھ بیٹھتے ہو کہ مجھے تمہاری اس مین میخ کی داد دینا پڑتی ہے۔ گزشتہ خط میں تم نے پوچھا تھا کہ میرے کھانے کا انتظام کیا ہے۔ تمہاری اس ہمدردانہ توجہ کا بہت شکریہ لیکن تم بیفکر رہو میں ندیا میں بیٹھ کر لاہور سے کھانا نہیں منگواؤنگا . . . .

(۲) تم چونکہ ہر روز شام کا وقت ایک تفریحی پروگرام کے ماتحت صرف کرنے کے عادی ہو اسی لئے بار بار پوچھتے ہو کہ میری شام کیونکر گزرتی ہے۔ مَیں اگر اس نگارستانِ ہند میں ہوتا جسے عرفِ عام میں لکھنؤ کہتے ہیں تو شاید اپنے مجروح و درماندہ قلم کی زندگی کی آخری رمق کو کام میں لاکر شام اودھ کی لٹی ہوئی بہاروں کا ہلکا سا نقشہ کھینچ دیتا۔ لیکن وائے قسمت کہ ندیا میں ہوں۔ جہاں نہ لاہور کی مال ہے اور نہ لکھنؤ کا چوک۔ پھر ان حالات میں مجھ سے میری شاموں کی تفصیل طلب کر کے میری سوگواریوں میں اضافہ کرنا ہی مقصود نہیں تو کیا ہے؟

(۳) تم پوچھتے ہو ندیا کیسی جگہ ہے۔ میرا جواب ہے ندیا خوب جگہ ہے . . . .

(۴) تمہارا خط میرے پیشِ نظر ہے اور مَیں تمہاری زجر و توبیخ کا جواب دینے سے معذور ہوں۔ مجھے دیوانہ کہو یا حواس باختہ، گنہگار قرار دو یا مصلحت اندیش لیکن خدارا میری معصومیِ جذبات کی تحقیر اور میری پاکیزگیِ خیال کی تضحیک نہ کرو . . . . مَیں آگ کے شعلوں میں سے زندہ بچ نکلا تو میرے دوستوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن کسے معلوم تھا کہ اب کف آلود موجوں کی طغیانیاں

اور بادو باراں کی تباہ کاریاں مُنہ کھولے بیٹھی ہیں۔ تم مجھے عقل و خرد کا درس دیتے ہو لیکن یہاں یہ حالت ہے کہ ہوش و حواس کے ماتم کی فرصت بھی نصیب نہیں ہے صبر و شکیب کی طاقت کہاں سے لاؤں جبکہ یہاں دلِ ناصبور کی پذیرائی کے لئے سوائے بجلیوں کے ہے ہی کچھ نہیں...

دوستی کا یہ تصوّر مُصنّف کے لئے محض ایک ادبی تکلف کی حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ اس کے احساس زندگی کا ایک نہایت اہم پہلو ہے جس کے آثار تقریباً ہر افسانے میں نمایاں ہیں۔ خوش قسمتی سے مصنّف کا ایک حقیقی خط اپنے دوست سیّد سلامت اللہ بی اے کے نام اس مجموعے میں شامل ہے جس کا مفہوم قدرتاً اس قدر روشن اور بدیہی ہے کہ اس کے متعلق کسی ادبی تنقید یا نفسیاتی تجزیے کی ضرورت نہیں پڑ سکتی۔ اُوپر ہم دیکھ چکے ہیں کہ مصنّف کی چابکدستی کس طرح افسانے کو حقیقت کا رنگ دے سکتی ہے لیکن مندرجہ ذیل خط کے اندازِ بیان کی شعریت سے ہم پر ظاہر ہو گا کہ مصنّف کی وہی صنّاعی حقیقت کو افسانے کے قالب میں ڈھال دینے پر قادر ہے۔ اس خط میں ایک ایسے مکان کے انہدام کا ماتم کیا گیا ہے جس میں مصنّف نے اپنے بعض احباب کے ساتھ کبھی مسرت افروز مجلسوں میں شرکت کی تھی۔ اس مکان کو دوستوں نے "النجد" کا نام دے رکھا تھا۔ اور اس میں آزادی اور بے فکری کی بہت سی گھڑیاں گذاری تھیں۔ ظہورِ اسلام سے پہلے عربی شعرا کا یہ دستور تھا کہ سفر کرتے کرتے تھوڑی دیر کے لئے اُس جگہ ضرور رُک جاتے

تھے جو کبھی محبوب کی فرودگاہ رہ چکی ہوتی یا جہاں کہیں محبوب کے ساتھ چوری چھپے کی ملاقات میں خوشی کی چند ساعتیں گزاری ہوتیں۔ بہت سے عربی قصائد کی تشبیب منزل محبوب کی اس قسم کی حسرت آمیز یاد پر مشتمل ہے۔ امرءالقیس کا مشہور مطلع ہے ؎

قفا نبک من ذکری حبیبٍ و منزلِ

میرے دونوں رفیقو، یہاں تھوڑی دیر کے لئے ٹھیرو تاکہ محبوب کو یاد کر کے رولیں، اور اس کی فرودگاہ کو دیکھ کر اشکبار ہوں۔

بسقط اللوی بین الدخول فحوملِ

جو ریت کے ٹیلے کے کنارے دخول اور حومل کے درمیان نظر آتی ہے

اس کے بعد اقتباس ذیل کو پڑھئے:۔

پیارے سلامت! کئی ہفتوں کی پیوستہ تنہائی، مسلسل عزلت اور منفعل گوشہ نشینی کے بعد میں کل شام اپنے کلبۂ احزاں سے جو ضیائے مسرت و ضیائے آفتاب دونوں سے محروم ہے، نکلا۔ میں نہیں کہہ سکتا میرے پیش نظر کوئی خاص مقام تھا یا نہیں۔ بہرحال گزشتہ سولہ سال سے چونکہ اسی خطے کی خاک چھان رہا ہوں۔ اس لئے پاؤں خودبخود ایک راہ پر چلنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ میں اس سڑک پر جا رہا تھا جس کو ہم بیڈن روڈ کہا کرتے تھے اور جسے اب میونسپل کمیٹی کے تصرفات نے دل محمد روڈ کا نام دے رکھا ہے۔ دماغ ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی شگفتگی سے معرا تھا۔ میں

نے دیکھا کہ مزدوروں کا ایک جمِّ غفیر، کدالوں، بیلچوں اور پھاوڑوں سے مسلّح ایک مکان کو گرا رہا ہے۔ غور کیا تو معلوم ہوا کہ جو مکان گرایا جا رہا ہے وہ 'یادش بخیر' النّجد ہے۔ ع

سلامٌ علیٰ نجدٍ ومن حلّ بالنّجد

آہ کچھ نہ پوچھو اس منظر کو دیکھ کر دلِ حزیں کی کیا کیفیّت ہوئی۔ دل جو حوادثِ روزگار سے پہلے ہی چھلنی ہو چکا ہے۔ اس نظّارے کی تاب نہ لا سکا اور میں قدموں میں سرعت پیدا کر کے آگے نکل گیا۔ لیکن تمام راہ یاس و حرماں، کرب و اضطراب اور رنج والم کے سیاہ بادل قلب و دماغ پر چھاتے رہے اگرچہ عرصۂ دراز سے النّجد بیکانیری مزدوروں، چماروں اور دھوبیوں کا مسکن بن رہا تھا لیکن اس کس مپرسی کے عالم میں بھی وہ اُن روایات کا حامل، اُن داستانوں کا مرکز اور اُن ہنگاموں کا خزینہ تھا جن کی یاد لاہور کی اہلِ دل آبادی کے ایک قابلِ قدر حصّے کا سرمایہ نشاط و متاعِ حیات ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لاہور کی آنے والی نسلیں، نہیں نہیں موجودہ نسلیں بھی، کہ آج کون ایسا دیوانہ ہے جو تاج محل کو دیکھ کر ایک غریب کے جھونپڑے کو تصوّر میں لانا پسند کرے گا، بھول جائیں گی کہ یہاں ایک ایسی چار دیواری بھی تھی جہاں اس زمانے میں جبکہ تمدنِ جدید کی برکات پانی کی طرح عام ہو رہی ہیں، بجلی کی روشنی نہ تھی۔ جہاں چند دیوانے علی الرغم مصائبِ حیات اکٹھے ہو کر زندگی کی

اُلجھنوں کو مسرت و شادمانی کے قہقہوں میں فنا کر ڈالتے تھے جس کی کشش کا یہ عالم تھا کہ بٹالہ، سرگودھا، گوجرانوالہ، پسرور، شاہجہانپور اور خدا جانے کہاں کہاں کے افراد کھنچے چلے آتے تھے، جس کی مٹی کو یہ تاثیر میسّر تھی کہ خاک کو سونا بنا دیتی تھی۔

انجمن چشمِ ظاہر بین کے لئے مٹ گیا لیکن اب بھی ایک جماعت ایسی ہے جس کے لئے زمین کا یہ ٹکڑا ہمیشہ مقدس و معزز رہے گا ..... یہ وہ مقام ہے جس کی فضا اب بھی سرمستیوں سے معمور اور نشاط افروزیوں سے مخمور ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جس کی ایک ایک اینٹ میں عشق کا سوز اور محبت کی بیکسی رچی ہوئی ہے۔ یہ وہ عمارت ہے جس کے در و دیوار میں ہماری آنکھیں لگی ہوئی ہیں ....

حقیقت یہ ہے کہ صاحبِ "سوزِ ناتمام" کی شخصیت دوستی کے لئے جس قدر موزوں ہے۔ اُسی قدر ہندوستانی عورت کی رفاقت کے لئے ناساز گار ہے۔ خود اسی کتاب کی ایک عبارت اس مسئلے پر نہایت فلسفیانہ انداز میں روشنی ڈالتی ہے۔ موجودہ عہد کے اکثر نوجوان اس احساس سے ناآشنا نہیں ہونگے اس لئے کہ مغربی اور مشرقی تمدن کا ہماری سوسائٹی میں بیک وقت نافذ ہونا ایک زبردست ذہنی کشمکش کا باعث ہو رہا ہے۔ آج سے پچاس سال قبل مولانا نذیر احمد نے "ابن الوقت" میں ہماری ظاہری وضع و قطع کے انقلاب کے خلاف احتجاج

کیا تھا "بیکن" کوٹ پتلون کے معرکے" میں انگلستان میں عرصہ سے شکست فاش دے چکا ہے اور ہماری سوسائٹی کے قدامت پسند عناصر قدیم لباس کو رو دھو کر اب صبر کر چکے ہیں۔ انہوں نے محسوس کر لیا ہے کہ یورپ کا تمدن لباس سے زیادہ قیمتی چیزوں پر حملہ آور ہو رہا ہے حقیقت یہ ہے کہ اس سے پہلے مشرق و مغرب کی معاشرتی آویزش کا احساس ہندوستان کو کبھی اس شدت سے نہیں ہوا جیسا اب ہو رہا ہے۔ مرزا محمد سعید دہلوی کے ناول "خواب ہستی" اور "یاسمین" جو اس صدی کے آغاز میں لکھے گئے تھے۔ نوجوان ہندوستان کے اسی احساس کا پرتو ہیں۔ تمدنوں کی آویزش میں ہندوستان اب اس حد تک مسخر ہو چکا ہے۔ کہ ہم ایک ہی وقت میں انگریز بھی ہیں اور ہندوستانی بھی۔ ہمارے نوجوان ٹینی سن کے الفاظ میں، دو دنیاؤں کے درمیان سرگرداں ہیں جن میں سے ایک مر چکی ہے اور دوسری میں اتنی قوت نہیں کہ پیدا ہو سکے"

شادی کے بعد عورت کی زندگی کا صرف ازدواجی پہلو ہم پر واضح ہو سکتا ہے اور اس حالت میں بھی وہ ہم سے بے تکلف نہیں ہوتی۔ کیونکہ ماحول و مراسم سے متاثر ہو کر وہ ہمیشہ اپنے آپ کو ہم سے کمتر سمجھتی ہے اور جب تک اختلاف مراتب کا یہ احساس قائم ہے۔ آپس میں گھل مل کر ایک دوسرے کی فطرت سے کماحقہٗ آگاہ ہو جانا ممکن نہیں۔ دوستوں کے ساتھ ہمارے تعلقات ابتدا میں معمولی ہونے کی حیثیت سے رسمی علیک سلیک تک محدود ہوتے ہیں۔ پھر روزمرہ کی ملاقات اور تبادلۂ خیالات سے وہ

تعلقات غیر شعوری طور پر بڑھتے بڑھتے دوستی کی حد تک پہنچ جاتے ہیں اور بالآخر وہ دوستی روح کی ایک اشتہا بن جاتی ہے جس سے علیحدگی بعض اوقات ہماری زندگی تلخ کر دیتی ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ دوستی پیدا کرنے میں فریقین کی جانب سے کبھی کوشش نہیں ہوتی اور عجیب بات یہ ہے کہ جب کبھی اس معاملے میں قصد و ارادہ سے کام لیا گیا ہے حصولِ مقصد میں ہمیشہ ناکامی کا سامنا ہوا ہے۔ جب تک معاشرت میں عورت کے لئے مناسب مقام نہیں بنایا جاتا اور جب تک ہندوستان کی فضا میں یہ خوشگوار تبدیلی نہیں ہوتی کہ عورت سے جائز دوستی جس کا نتیجہ مناکحت نہ ہو، قائم ہو سکے عورت کی فطرت کو سمجھنا محال کیا ناممکن ہے۔

دوستی اور نسائیت کا یہ تصوّر دراصل قدیم یونانی دُنیا کا تصوّر ہے۔ اہلِ یونان روشن ضمیر اور باذوق دوستوں کے ساتھ عقلی مذاکرات کو دُنیا کی بہترین مسرتوں میں شمار کرتے تھے۔ اس قسم کی پُر لطف گفتگو کے نظّارے ہمیں "سوزِ ناتمام" میں جا بجا نظر آتے ہیں اور ان نظّاروں سے خود مصنّف کی لطف اندوزی غیر مشتبہ طور پر ظاہر ہوتی ہے۔

"تم بار بار کہتے ہو کہ خارجی دُنیا میرے لئے ختم ہو چکی ہے آخر اس کا مطلب کیا ہے؟"

"اس کا مطلب؟ نہایت صاف واضح اور بیّن۔"

"یعنی؟"

"یعنی یہ کہ خارجی زندگی کے مظاہر اپنے اندر میرے لئے کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتے۔ سالہا سال کی تیز و تند کشمکشِ حیات نے میرے دل و دماغ کو وہ کیفیت بخش دی ہے کہ بیرونی دُنیا کا مدّ و جزر اُس پر قطعاً اثر انداز نہیں ہو سکتا......"

"سکونِ یاس اسی کیفیّت کا نام ہے۔"

"تم اسے سکونِ یاس کہتے ہو! حالانکہ اُمید و رجا کے ولولہ انگیز، جوش و مسرت کا احساس ہی مجھے آج ہوا ہے۔"

"تو کیا تم اشیاء کی خارجی حقیقت سے انکار کرتے ہو؟"

"مَیں اشیاء کی خارجی حقیقت سے کیونکر انکار کر سکتا ہوں لیکن ان کی عظمت و اہمیّت کا معیار سراسر مختلف ہے......"

مگر دوستی کے یہ درخشاں نظارے صرف اس لئے ہیں کہ نسائیت کا وہ تاریک نقطہ جو ان افسانوں کا مرکز ہے اپنی پوری شانِ ظلمت آرائی کے ساتھ اس صاف پس منظر پر ہویدا ہو سکے۔ "سوزِ ناتمام" کا اہم ترین موضوع مسئلہ جنس ہے۔ اس مسئلے پر ہم یہاں اسی رستخیز اضطراب سے دوچار ہوتے ہیں جس نے سویڈن کے شہرہ آفاق دشمنِ نسواں اور "تمثیلاتِ جنسی" کے مصنّف سٹرنڈبرگ کو انجام کار دیوانہ بنا دیا تھا۔ دوستوں کی نکتہ شناسانہ ملاطفت،

ہم آہنگیٔ روح و دماغ اور پُر لطف نوک جھونک کے یہ دل آرا مناظر جس ادلمپیائی سعادت کے عرش پر ہمیں پہنچا دیتے ہیں اُس کی بلندی سے ہم زیادہ وضاحت کے ساتھ دیکھ سکتے ہیں کہ عورت ایک ظالم و جاہل ہستی ہے۔" تبدیلِ نظریہ" میں تفضّل تپ محرقہ میں مبتلا بتدریج موت کی طرف جا رہا ہے اور اس کی بیوی ایک" بنے ٹھنے" بانکی وضع کے جامہ زیب نوجوان" ہمسائے کے ساتھ نامہ و پیام کی راہ نکال رہی ہے اور اس کا دوست اسحاق ؟

"یقین کرو۔ میں یہ خبر سُن کر پاگل ہو گیا۔ تفضّل کی چارپائی پر سر رکھ کر میں پہروں روتا۔ اس لئے نہیں کہ وہ بسترِ مرگ پر اپنی قیمتی زندگی کی آخری گھڑیاں پوری کر رہا تھا بلکہ اس لئے کہ دُنیا کس قدر بے حیائی اور بداخلاقی سے لبریز ہے۔"

حضرتِ عاشق کی خصوصیّاتِ فن میں یہ ایک نمایاں چیز ہے کہ افسانے کا آغاز چند دوستوں کے باہمی تعلقات سے ہوتا ہے۔ پھر ایک دوست غائب ہو جاتا ہے اور ایک عرصے کے بعد دوسرے دوست سے ملتا ہے اس عرصے میں اُسکی زندگی کسی نیک یا بد رُوحانی انقلاب کے تھپیڑے کھانے کے بعد کسی روشن یا تاریک ساحل تک پہنچ چکی ہوتی ہے اور پھر جلتے اور جلاتے ہوئے لفظوں میں اس طوفانی سفر کی روئداد افسانے کا مرکز بن جاتی ہے۔" زندگی" اور" عذرِ گناہ" میں بھی قرینہ ملحوظ رکھا گیا ہے۔ لیکن بیشتر افسانوں میں یہ انقلاب نہایت شدّ و مد اور وضاحت

کے ساتھ کسی عورت کی بداخلاقی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اور اس زہر کا علاج یا موت ہے یا (بشرطِ زندگی) دوستوں کی مروّت۔

لیکن صاحبِ "سوزِ ناتمام" کے نزدیک عورت میں ایک خوبی بھی ہے اور وہ اُس کا جسمانی حسن ہے۔ وہ شوپنہار کی طرح عورتوں کو ایک "ٹھنگنی، تنگ شانوں، چوڑے کولہوں اور چھوٹی چھوٹی ٹانگوں والی مخلوق" نہیں سمجھتا جسے مرد کی کوربینی نے "صنفِ جمیل" کا نام دے رکھا ہے اور جسے انسانی زندگی میں دراصل اتنی بھی اہمیت حاصل نہیں ہونی چاہیئے کہ اُسے ایک "ناگزیر شر" کا مرتبہ دیا جائے۔ "سوزِ ناتمام" کے مصنّف کو یہ تسلیم ہے کہ عورت زندگی کے لئے ایک ناگزیر شر ہے۔ وہ عورت کے حسنِ ظاہری سے بے انتہا متاثر ہے اور اس تاثر کا اعتراف کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتا لیکن جس طرح شوپنہار کا فلسفۂ نسائیت عورت کو تمام عقلی و روحانی صفات سے معرّا قرار دیتا ہے اسی طرح "سوزِ ناتمام" کی عورت بھی (اپنے جہاں آشوب حسن و جمال کے باوجود) حُسنِ باطن سے بیگانہ محض ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "سوزِ ناتمام" میں عورت کا تصوّر دو مختلف منزلوں میں سے گزرتا ہے اور اگرچہ "سوزِ ناتمام" میں کہیں بھی افسانوں کی ترتیبِ زمانی کا اظہار نہیں کیا گیا مگر ان کا مضمون خود اپنی غمّازی کر رہا ہے اور تھوڑا سا غور کرنے پر اس میں مطلق شُبہ نہیں رہتا کہ کون سے افسانے پہلے دَور کے لکھے ہوئے ہیں اور کون سے دوسرے دَور کے۔ پہلے دَور میں عورت

ایک خوبصورت تیتری ہے جس کی چمک دمک سے مرد کے چمنِ حیات کی زینت ہے۔ اس دور میں مصنّف اس زرق برق نفاست کی داد دل کھول کر دیتا ہے لیکن یہاں بھی یہ حقیقت بداہتہً ظاہر ہو رہی ہے کہ وہ باطنی اوصاف جنہیں مغربی تمدن عورت سے منسوب کرتا ہے۔ اور جن کی بنا پر اسے بارہا مرد سے کچھ اُونچا مرتبہ دیتا ہے۔ ان کی کوئی جھلک حضرتِ عاشق کے دورِ اوّل کی عورت میں نظر نہیں آتی۔ زمانہ حال میں ہمارے بعض ادیب نسائیت کے اس تصوّر کو بدلے ہوئے حالات اور مغربی مصنّفین کے اثر سے بتدریج قبول کر رہے ہیں لیکن صاحبِ "سوزِ ناتمام" کے لئے عورت شبلی کی اصطلاح میں ایک "حیوانِ جمیل" ہے۔ مگر اس سے زیادہ نہیں۔ اس موضوع پر مشرقی اور مغربی نصب العین کی کشاکش دراصل اب تک جاری ہے۔ اور سمجھوتے کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی نہ ہو سکتی ہے۔ "سوزِ ناتمام" کے مصنّف کا مغربی دماغ رہ رہ کر مردوں اور عورتوں کے زیادہ آزادانہ میل جول کا تقاضا کرتا ہے۔ مگر اس کا مشرقی احساس کبھی نسائیت کے ایشیائی نصب العین سے اُوپر پرواز نہیں کرتا۔ عورت اس کے لئے حسن ہے مگر صداقت نہیں ہے۔ با ایں ہمہ جب وہ اس حُسن کی تعریف کرنے کے لئے زبان کھولتا ہے تو اس کے مُنہ سے پھول جھڑنے لگتے ہیں۔ ذیل کی تحریر یقیناً دورِ اوّل کی یادگار ہے:۔

. . . . . تو برقِ تبسّم سے خرمنِ صبر و شکیب کو جلاتی، آنکھوں

کی جلوہ ریزیوں سے متاعِ ہوش و خرد کو تباہ و برباد کرتی اور بے پرواندموں کی ٹھوکروں سے سوتے فتنوں کو جگاتی یکا یک یوں نمودار ہوتی جیسے کالی بدلی میں سے چاند نکل آئے۔ پھر دفعۃً ۔ ۔ ۔ ۔ تُونے باغی آنچل کو سمیٹا۔ عرقِ انفعال سے بھیگے ہوئے چہرے کی درخشانی کو، اُوہ درخشانی جس کے سامنے آفتاب و ماہتاب بھی خجل ہوں، نقاب کی آڑ میں چھپا لیا اور سمٹ سمٹا کر ایک طرف کو ہو گئی آہ ! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تیرے لئے اس چشم زدن میں ختم ہو جانے والے واقعے کی بڑی سے بڑی اہمیت یہی ہو سکتی ہے کہ ایک اجنبی کی گستاخ نظر تیرے حسنِ محجوب پر پڑ گئی ۔ ۔ ۔ مگر میں تمناؤں کے اُس محشرستان آرزوؤں کے اتھاہ سمندر اور افکار کے قلزم بے کراں سے کیونکر نکلوں۔ جسے تیری ایک نگاہ میرے سینے میں ہمیشہ کے لئے موج زن کر گئی۔ ۔ ۔ ۔ تیری لانبی لانبی گھنی پلکوں اور زہد شکن ابروؤں کے اندر سے نکلا ہوا تیر اس شدت سے جگر میں پیوست ہو چکا ہے کہ میں ڈرتا ہوں اُسے نکالنے کی کوشش میں میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ جائیگا۔

اس قسم کی تحریروں کے بعد مصنّف کے ذہنی ارتقا کا دورِ ثانی شروع ہوا۔ عورت اب بھی وہی پیکرِ حسن و جمال تھی۔ لیکن اُس کے حُسن کے لئے مصنّف کی غیر مشروط شیفتگی اب ایک عناد کی صورت میں بدل چکی تھی۔ عورت اب اس

کے لئے ترکیبِ کائنات کے ابدی تضاد کا تاریک عنصر تھی۔ نور اور ظلمت، یزداں اور اہرمن، مرد اور عورت!

. . . . . میں کہوں گا کہ حسن و لطافت کی ان تمام رعنائیوں کے ساتھ وہ ایسی ابتلا ہے جس کی تحریصِ ہلاکت کا دنیا میں کوئی حریف نہیں ہو سکتا۔ کون ہے جو یہ کہہ سکے کہ وہ عورت کی محبت میں انسان سے فرشتہ بن گیا؟ ہاں ہزاروں نہیں لاکھوں ایسے ہیں جن کے لئے ارتکابِ گناہ کی سب سے بڑی محرک عورت ہوئی ہے۔ انسانی جنگ و جدل کی تاریخ کی ورق گردانی کرو تو دیکھو گے کہ زمین پر نصف سے زیادہ خون عورت کی وجہ سے بہایا گیا۔

زندگی کے اس "نیم شبی نقطہ نظر" کے بعد استہزائی قنوطیت کی منزل بالکل سامنے آجاتی ہے چنانچہ چند ہی سطور کے بعد ہم ذیل کے الفاظ سے دوچار ہوتے ہیں جو ہمیں بے اختیار شوپنہار کی یاد دلاتے ہیں:۔

اس کے ابرو کے اشارے اور لبوں کے تبسم پر ہم اپنی جانیں کھو دیتے ہیں۔ اس کی سحرکار محبت کے زیر اثر ہم ہپناٹزم کے ادنےٰ معمول کی طرح اندھا دھند ایسے خوفناک کاموں میں کود پڑتے ہیں جن کا تصور حالتِ طبعی میں اعصاب میں تھرتھری پیدا کر دیتا ہے۔ دنیا اس جنون یا جذبے کو محبت کے نام سے پکارتی ہے۔ بعض کہتے ہیں محبت سلگتی ہوئی آگ ہے جو انسان کے

اندر داخل ہو کر تپ دق کی طرح اس کی ہڈیوں کو پگھلا دیتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ مگر میرا عقیدہ ہے کہ محبت سلگتی ہوئی آگ نہیں۔ بھڑکتا ہوا شعلہ ہے جس کی زندگی اگرچہ مختصر مگر ہلاکت آفریں ہوتی ہے۔

یاس و قنوط کی اس منزل میں داخل ہونے کے بعد عورت کے تنہا کمال یعنی اس حسن جسمانی کا مصنّف کے نزدیک تھوڑی دیر کے لیے مشتبہ قرار پانا ہمیں تعجب انگیز ...وم نہیں ہوتا۔

ہمارے محدود تمدن میں اتنی گنجائش تو ہے نہیں کہ ہماری شاعرانہ بلند پروازیاں حد تکمیل تک پہنچ سکیں یا ہماری جوانی کے محبوب و مرغوب خواب برروئے کار آجائیں اس لئے مجبوراً ہم اس شعریت کو جو دراصل ہماری ہی طبائع کا جزو ہے جنس مقابل میں منعکس دیکھتے اور نادانی سے سمجھتے ہیں کہ عورت سراسر شعریت اور سراپا لطافت ہے۔

ان تمام افسانوں میں ایک بھی افسانہ ایسا نہیں ہے جس کی ہیروئن کمال ...ت کا بہترین نمونہ نہ ہو۔ مگر صرف دو ایک افسانے ایسے ہیں جن میں ہیروئن کا نقص ...رت تباہی اور ہلاکت کا سرچشمہ ثابت نہیں ہوتا۔ اس لحاظ سے "جوانی کی لغزش" ...ناز اس مجموعے کی سب سے زیادہ دردناک اور عذاب انگیز ہیروئن ہے۔ اسکے ...ں "فریب حسن" میں زلیخا سے اور "دھمکی" میں شمسہ سے ہماری توقعات اس ...م ہیں کہ ان کی بدروشی ہمیں زیادہ رنج نہیں پہنچاتی اور نہ ان کے جرائم کو فراموش

کرنے میں ہمیں زیادہ دقت پیش آتی ہے۔" حیاتِ تازہ" میں بھی ہم اسی کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں۔ یہاں بھی شہید کی بیوی کو مصنف نے اپنے مخصوص نظریۂ نسائیت کا تختۂ مشق بنایا ہے لیکن بڑی حد تک وہ ایک دھندلے ققنے کے پردے کے پیچھے حرکت کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ہماری دلچسپی کا اصل مرکز افسانے کا ہیرو شہید ہے۔ اور عجب نہیں کہ شہید کی سیرت کشی میں حضرت عاشق نے اپنی سیرت کے بہت سے پہلوؤں کا آب و رنگ مستعار لیا ہو" قدرت کا انتقام" عورت کی فطرت پر مصنف کا شاید سب سے تلا ہوا وار ہے۔ ڈاکٹر سہیل زہرہ۔ مشورے سے اُس کے شوہر کامرآن کو قتل کر دیتا ہے۔ "آہ! بدنصیب کامران اُسے اپنی کامرانی کی بہت زیادہ قیمت ادا کرنا پڑی۔" لیکن اس قتل کے بعد مرد اور عورت کی فطرت کا پُر اسرار امتیاز عجیب و غریب طریقے پر ظاہر ہوتا ہے۔ کامراں کا قتل اُس کی بیوی کو مضطرب نہیں کرتا بلکہ اس کی بیوی کے عاشق کو! "جب دشمن درمیان سے اُٹھ گیا تو خود میرے ہی اندر اُس کا ایک دوست پیدا ہو گیا۔" سہیل کی اس کیفیت کو دیکھ کر سراپا نسوانیت زہرہ نے ایک اور پلٹا کھایا۔ اُس نے وعدہ معاف سرکاری گواہ بن کر کامرآن کے قتل کی داستان من و عن پولیس سے کہہ دی۔

اس تمام قضیے میں جو سوال رہ رہ کر مصنف کے سامنے آتا ہے۔ وہ درا صل شادی کا سوال ہے۔ اس سوال نے ہمارے عہد میں بے انتہا پیچیدگی

ر اہمیت حاصل کر لی ہے۔ موجودہ نسل کے لئے شادی چیستانِ ابوالہول بن گئی
ہے۔ نوجوانوں کے لئے لازم ہے کہ اس چیستان کو حل کریں اور اس کا حل دریافت
ر سکنے کی صورت میں اپنے آپ کو قتل کے لئے پیش کریں تاکہ اُن کے پُرزے
ا دیئے جائیں۔ اس پریشان کن پیچیدگی کی تہ میں ہماری فرنگیشیائی سوسائٹی کی یہ
جیب و غریب کیفیت ہے کہ نوجوان نسل کی عورتیں نہ پوری طرح آزاد ہیں اور نہ پُوری
طرح پابند۔ وہ بھی ہمارے نوجوانوں کی طرح دو دُنیاؤں کے درمیان سرگرداں ہیں مرد
ی کے برابر کے رفیقِ حیات بھی ہیں اور اُن کے مجازی خدا بھی۔ اس صورتِ حال میں اُن
ی زندگی کی تلخی و نامرادی کا اتنا ہی امکان ہے جتنا مردوں کی داژگوں بختی کا۔
شہیدِ تغافل" میں ریاض انگلستان چلا جاتا ہے۔ اور اُس کی بیوی ممتاز اُس کے
ق میں گُھل گُھل کر مر جاتی ہے۔ عورت کے متعلق مصنّف نے جو کلّیہ قائم کیا ہے۔
اں ہم اگرچہ اس کے ناگزیر استثناء سے دوچار ہوتے ہیں۔ لیکن اس افسانے
ں بھی دراصل مسئلہ جنس اسی طرح زیرِ غور ہے جس طرح "جوانی کی لغزش" میں "جوانی
لغزش" میں ممتاز نے شوہر سے بے وفائی کی اور "شہیدِ تغافل" میں ممتاز کا شوہر
و فا نکلا۔ سوال پھر بھی یہی رہا کہ شادی کی اس چیستان کا حل کیا ہے؟

اس وقت ہماری سوسائٹی میں انتخابِ زوج کے دو طریقے رائج ہیں۔ بزرگوں
ذریعے سے رشتے کی تلاش اور معاشقہ۔ "سوزِ ناتمام" میں ان دونوں طریقوں کی
زمائش کر کے دونوں کو قطعاً ناقص اور مایوس کن ٹھیرایا گیا ہے۔ " تبدیلِ نظریہ"

میں تفضّل نے سالہاسال کے معاشقے کے بعد شادی کی مگر اس کی بیوی نے وہی کیا
جس کی توقع "سوزِ ناتمام" کی دُنیا میں اس سے کی جا سکتی تھی چنانچہ تفضّل کے
دوست اسحاق کو عورت کے متعلق اپنا وہ نظریہ بدلنا پڑا جو اُس کی مغربی تربیت کے
آثار فیض میں سے تھا۔

جس دُنیا میں بیویوں کا معیارِ اخلاق وہ ہو جو ہم دیکھ چکے ہیں، اس میں رشک
رقابت کے جذبے کا اپنی درد انگیز ترین شکل میں ظاہر ہونا یقینی ہے۔ چنانچہ
مصنّف نے کہیں کہیں اس جذبے کی تصویر کشی میں اپنا بہترین زورِ قلم صرف کیا
راقم الحروف کی رائے میں یہ مضمون اس سے پہلے اُردو ادب میں، اس جوش و قوت
کے ساتھ کبھی بیان نہیں ہوا۔ اُردو اور فارسی شعراء نے ایک خاص قسم کے رشک
کا مضمون غزل میں نہایت کثرت سے باندھا ہے لیکن اُس رشک کی نوعیت
کچھ اور تھی۔ گھروں کی شریف خواتین اور بیاہتا بیویوں سے اُسے کوئی تعلق نہ تھا
"سوزِ ناتمام" کے جس رشک کا ذکر ہم کر رہے ہیں اس کی مثال ہمیں صرف مغربی
ادبیات میں مل سکتی ہے، اور وہاں غالباً "آتھیلو" اس کی بہترین یا کم از کم مشہور ترین
پیداوار ہے۔ گوئٹے نے اپنے ویرٹر سے اسی جذبے کی ایک خاص رومانی کیفیت
منسوب کی ہے۔ مگر اس نرم اور شاعرانہ کیفیت کی جھلک ہمیں "سوزِ ناتمام" کے صرف
افسانے "حکایت خونچکاں" میں نظر آتی ہے۔ ورنہ یہ جذبہ بالعموم کرب و عقوبت
کی انتہائی حشر انگیزیوں کا سامان اپنے ساتھ لاتا ہے اور اس میں نارِ جہنّم کے شعلوں

کی وہی لپیٹ ہے جسے اناطول فرانس نے اپنے معرکہ آرا ناول "لالۂ احمر" کا موضوع بنایا ہے۔

چاندنی رات تھی۔ ہلکی ملگجی روشنی شش جہت میں پھیل کر کائنات کو بقعۂ نور بنا رہی تھی۔۔۔۔۔ اس نشہ آور ماحول اور ان خمار آفریں اثرات کے اندر صرف وہ خاموش و مضمحل، بستر پر پڑا جاگ رہا تھا۔ اُس کا دماغ پریشان خیالات کی حدّت سے کھولتے ہوئے پانی کی طرح اُبل رہا تھا۔ جذبات کی تندی بعض اوقات اس کی حرکتِ قلب کو اس قدر تیز کر دیتی تھی کہ خون ہیبتناک سرعت کے ساتھ اُس کی رگوں میں دوڑنے لگتا اور اُس کا جسم ایک خوفناک تھرتھری سے کپکپا اُٹھتا تھا۔ پھر دوسرے ہی لمحے میں روح کو منجمد کر دینے والا مبہم و بے معنی خوف، بارِ گراں کی طرح اس کے رگ و ریشہ پر مسلط ہو کر اسے اس قدر ناتواں بنا دیتا تھا کہ وہ گھبراجاتا کہ کہیں اُس کے جسم و جاں کا رشتہ منقطع ہونے کا وقت تو نہیں آپہنچا۔۔۔۔

ایک ہفتے سے وہ اس جاں گسل کشمکش کا شکار ہو رہا تھا۔۔۔۔۔ وہ ٹکٹکی باندھے آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کا چہرہ مرے ہوئے انسان کی طرح ساکن و بے نور تھا۔ لیکن دل ناقابلِ توضیح اضطراب میں جسم کی ایک ایک رگ کو شعلہ زار بنا رہا تھا۔ وہ نصف گھنٹہ یوں ہی بے حس و حرکت، لیٹا رہا اور آخر اضطراری جنبش کے ساتھ یکلخت بستر سے

اُٹھا لیکن فوراً ہی نیم مردہ انسان کی طرح چارپائی پر گر پڑا۔ اُسے یوں محسوس ہوا کہ کوئی دندانہ دار آری آہستہ آہستہ اس کے اعضاء کو کاٹ رہی ہے ...... یکایک اُس کا سینہ پھیلا اور جذباتِ پنہاں کی خاموش و طویل جنگ نے ایک دردناک آہ کی صورت اختیار کی۔ اس کے ہونٹوں سے ایک مدھم سی چیخ نکلی اور عالمِ انتشار میں اپنے ہاتھوں کو بیتابی سے ملتے ہوئے اُس نے کہا۔ "میرے اللہ، مجھے اس قیامت سے نجات دے اگر اس خبر میں صداقت ہے تو، اور اگر یہ افترا ہے تو بھی مجھے حقیقت سے آگاہ کر دے کہ میں یہ جاں کنی کا عذاب برداشت کرنے سے عاجز ہوں۔"

اُس نے بے اختیار ہو کر تکیے کے نیچے سے ایک شکن آلود کاغذ نکالا ....

آہ یہ نوشتۂ خونیں، کاش اسے کبھی نہ ملتا ..... وہ زندگی کے بقیہ ایام اسی عشرتِ جہالت میں بسر کر دیتا جس کا وہ ہمیشہ سے عادی چلا آ رہا تھا۔ اکرام نے یہ خط بھیج کر یقیناً اُس پر بے انتہا ظلم کیا تھا ... اُس نے کاغذ کے پرزے کو چاند کی ناکافی روشنی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا، چند سطریں تھیں جن کے الفاظ جلاد کی خونخوار آنکھوں کی طرح گھور گھور کر اسے لرزہ براندام کر رہے تھے ..... کیا ایک عورت حقوقِ زوجیت کو ہوس کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھا کر خاوند کے پہلو میں یوں بے غل و غش محوِ خواب ہو سکتی ہے؟

نسوانی اخلاق و اعمال کی یہ تصویریں ہمارے دل پر دہشت طاری کر دیتی

ہیں، مگر نسائیت کی روح جس کے خلاف فصیح و بلیغ انشاء پردازی اور نفسیاتی منظر کشی کی یہ قوتیں صف آرا کی گئی ہیں، اپنے خاموش انتقام سے غافل نہیں رہی۔ وہ چپکے سے "سوزِ ناتمام" کی دُنیا کو چھوڑ کر نکل گئی ہے تاکہ مرد صرف اپنے دوستوں کے ساتھ جگمگاتی ہوئی محفلیں سجائیں یا کرب و عذاب کے جہنّم کی اُن ہولناک گہرائیوں تک پہنچیں جہانتک صرف مرد کی روح اُتر سکتی ہے۔ جہانتک اُسے صرف عورت کی محبّت گرا سکتی ہے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ دوستوں کی گفتگو میں مصنّف کی بہترین صنّاعی کس طرح زندگی کی روح بھر دیتی ہے۔ عورت کے ساتھ وہ یہ سلوک صرف اس لئے کرتا ہے کہ اس کے افسانے کا مرکز ہمیشہ مرد کی محبّت، مرد کی مظلومی و تلخ کامی، مرد کا روحانی ارتقا ہوتا ہے۔ صرف ایک موقع پر وہ اپنے اصولِ کار کو چھوڑتا ہے۔ شاید اس روایت کا لحاظ کرتے ہوئے کہ پہلی عورت آدم کے پہلو سے نکلی تھی وہ ہمیں ایک حقیقی عورت سے بھی دوچار کر دیتا ہے۔ "میں ہوں اپنی شکست کی آواز" میں زینت ایک زندہ ہستی ہے جس کی رگوں میں انسانی خون دوڑتا ہے، جس کی نبض ہاتھ لگانے سے تڑپتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، جس کے دل کی دھڑکن کو ہم سُن سکتے ہیں۔ زینت جدید ہندوستان کی اُن عورتوں میں سے نہیں ہے جن کے خلاف مصنّف کے دل میں بغض و عناد ہے، وہ ایک طوائف ہے۔ شاید اسی لئے اس کے خال و خد کو ہمدردانہ کاوش کے ساتھ نمایاں کرتے ہوئے کسی قسم کی نفرت و کراہت مصنّف کو دامنگیر نہیں ہوئی اور اُس نے جزئیات کی پوری تفصیل کے ساتھ نسائیت کا ایک حسین و جمیل مرقع ہمارے

سامنے رکھ دیا ہے۔ یہ افسانہ حسنِ آغاز کے لحاظ سے بھی اپنی مثال آپ ہے۔

وہ آج بھی حسبِ معمول بہت دیر سے اُٹھی۔ سورج کبھی کا طلوع ہو چکا تھا۔ اس کی نرم اور روپہلی کرنیں مسہری کے پردوں پر رقص کر رہی تھیں۔۔۔۔ اُس نے بائیں طرف کروٹ لیتے ہوئے نیم وا آنکھوں کے اندر سے لانبی گھنی پلکوں کو چیرتی ہوئی ایک بے پروا نگاہ جانبِ مشرق ڈالی جہاں سے دھوپ کی سنہری شعاعیں مسہری کی جالیوں میں سے چھن چھن کر اس کے یاسمینی بدن پر پڑنے لگی تھیں۔ روزمرہ کی طرح آج بھی اس کی نیند پوری نہ ہوئی تھی کہ شہسوارِ مشرق کے تیروں کی بارش شروع ہو گئی۔ اُس کا جسم دُکھ رہا تھا۔ اور وہ تمام اعضاء میں ایک ناقابلِ بیان شکستگی، ایک بعید از فہم اضمحلال محسوس کر رہی تھی۔ موتیا کے باسی ہاروں کو گردن سے اُتار کر اُس نے پرے پھینک دیا۔۔۔۔۔ اس کے شکن آلود ریشمیں لباس سے ہلکی ہلکی خوشبو، جو طبقہ اناث سے خاص ہے، نکل نکل کر فضا کے محدود حلقے میں تعطّر کی ایک لہر دوڑا رہی تھی۔ وہ بالوں کی برہمی سے بے خبر، لباسِ حریر کی پریشانی سے بے نیاز نرم و گداز بستر کی بغاوت سے غافل، آنکھیں کھولے لیٹی ہوئی تھی۔ تمازتِ آفتاب کی تیزی اب اُسے اُٹھنے پر مجبور کر رہی تھی لیکن وہ حرکت کرنا نہ چاہتی تھی، حرکت کرنے سے ڈرتی تھی کہ مبادا اُس کا بند بند ٹوٹ جائے۔

اس قسم کے پانچ زرنگار صفحے مصنّف نے صرف ایک لمحے کے بیان میں صرف کئے ہیں۔ اس کے الفاظ و تراکیب کی برجستگی اور فراوانی جگہ جگہ ہم سے خراجِ تحسین حاصل کرتی ہے۔ اُسے خوبصورت الفاظ سے عشق ہے اور وہ ان کی باہم آمیزی سے قوسِ قزح کے الوان پیدا کرتا ہے۔ اُس کے لئے اُس کے الفاظ یاقوت و گوہر کی قیمت رکھتے ہیں اور وہ انہیں ایک جوہری کی محنت اور محبت سے استعمال کرتا ہے۔ ہندی الفاظ کے ساتھ فارسی ترکیبوں کی آمیزش میں اُسے خاص سلیقہ ہے۔

(۱) آلامِ حیات کے ستائے ہوئے لوگ زندگی کے بکھیڑوں کو موسیقی کے دلنواز سُروں میں کھو دینے اور اپنے ٹھٹھرے ہوئے قلوب کو آتشِ سیّال کے ایک گھونٹ سے گرما دینے کے لئے ہر شام اُس کے ہاں جمع ہوتے تھے . . . . اُسے شب و روز لوگوں کے جذبات سے کھیلنے کے سوا کوئی کام ہی نہ تھا۔ کبھی ان کے ارمان بھرے دلوں کو ایک نگاہ التفات سے فریبِ الفت میں گرفتار کر دیتی، کبھی انہیں شوقِ وصال و کاہشِ فراق کی اُلجھنوں میں مبتلا کر کے اُن کی بڑھتی ہوئی آرزوؤں کا جائزہ لیتی رہتی اور پھر یکایک چشمِ سحر کار کی ایک جنبشِ احتراز سے تمام حسین و جمیل امیدوں کو ملیامیٹ کر ڈالتی تھی۔

(۲) یکایک مجھے یوں معلوم ہونے لگا کہ زہرہ گویا ایک پیکرِ مرمریں تھی جسے میرے ہاتھوں نے اپنے جذبات کی پذیرائی کے لئے پرستیدۂ خیال

بنا کر تراشا تھا۔

(۳) جو شخص طعنِ خلق سے ڈرتا ہے وہی مٹ کر رہ جاتا ہے اور جو دھڑلے سے سوسائٹی کے خود ساختہ معیارِ اخلاق وضابطۂ معاشرت کو پسِ پُشت ڈال کر لوگوں کو دعوتِ مبارزت دیتا ہے وہی پھلتا پھولتا ہے۔

"سوزِ ناتمام" میں اندازِ بیان کی ایک اور نمایاں خصوصیت مصنّف کا حُسنِ تخیّل ہے۔ اُسے مبداءِ فیاض سے ایک شاعر کا تخیّل ملا ہے۔ وہ روزمرّہ کے واقعات کو اُٹھا کر شاعری کی دُنیا میں لے جاتا ہے۔ جگہ جگہ اس کی عبارت ایک منثور شعر بن جاتی ہے۔ یہ کیفیت ہم کئی اقتباساتِ ماسبق میں دیکھ چکے ہیں یہاں صرف ایک اور کا حوالہ دیتے ہیں:۔

"مَیں نے جب پہلے پہل تجھے دیکھا تو تو ایک کلی تھی ناشگفتہ، اک نغمہ تھی زیرِ لب، اک خواب تھی حسین و روح پرور۔ معصومیت کی الوہیتیں چہرے پر بکھیرے آنکھوں میں ضیائے مسرت کی کرنیں سمیٹے گویا ابھی آفتاب طلوع ہوا ہے اور رخِ روشن پر سماوی تجلیاں نمایاں ہو گئے تو صحنِ چمن میں یوں پھر رہی تھی گویا ایک نازک و رنگین تیتری ہے جو قوسِ قزح کے نظر فریب الوان سے مزین، باغ کی معطر فضاؤں میں، رنگ و بُو کا رُوح افزا ارتعاش پیدا کرنے کے لئے آئی ہے۔ تیرے نازک نازک پاؤں جو مخملیں سلیپروں کے اندر سے یوں جھانک رہے تھے۔ جیسے سبز پتّوں میں چھپے ہوئے موتیا کے پھول

اس سرعت و بے تکلفی سے باغ کی روشوں پر پڑ رہے تھے کہ ہر ہر قدم پر تیر انور و لطافت کے خمیر سے گندھا ہوا بدن دوہرا ہو ہو جاتا تھا۔ مجھے شک ہوا کہ تو بھی پھولوں کی ایک ڈالی ہے جو ہوا کے ہر جھونکے سے لچک لچک کر رہ جاتی ہے

لیکن "سوزِ ناتمام" کا مصنف اپنی قدرتِ کلام سے صرف شاعرانہ تخیل کی مینا کاری کا کام نہیں لیتا۔ وہ اپنے تجربۂ حیات کو بارہا فلسفہ و حکمت کا لباس بھی پہناتا ہے جس کے بعض نمونے گزشتہ عبارتوں میں ہماری نظر سے گزر چکے ہیں۔ نفسیات و اخلاق کے حقائق کو وہ ایسی بے تکلفی سے ایک پُر مغز فقرے میں بند کر دیتا ہے جس سے ہم کو خبر بھی نہیں ہونے پاتی کہ اُس نے ہم کو عقلیات کی سرحد پر لا ڈالا ہے اس قسم کے جواہرِ حکمت کتاب میں جا بجا بکھرے ہوتے ہیں۔

خود غرضی کی ابتدا محبت کی موت ہے۔

عورت کی تمام بیماریوں کا علاج مرد کی محبت ہے۔

وہ خیال جس کا پشتیبان عمل نہ ہو انسانی زندگی کے لئے کبھی مفید ثابت نہیں ہوتا۔

کسی چیز کو یاد رکھنے کا آسان طریقہ یہی ہے کہ اُسے بھول جانے کی کوشش کی جائے۔

میرے نزدیک زندگی کی اوّلین شعاع نفس سے پھوٹتی ہے اور خارجی دُنیا اسی شعاع سے حرارتِ حیات حاصل کرتی ہے۔

جس طرح روشنی کی شدّت آنکھوں کو چندھیا کر اِک نور کو ضایع کر دیتی ہے اسی طرح عشرت کی فراوانی اُس حسِ لطیف کو فنا کر دیتی ہے جس سے لوگ غم و شادی میں امتیاز کر سکتے ہیں۔

ہماری موجودہ خوشی کی قاتل یہی دو چیزیں ہیں، غمِ ماضی اور فکرِ فردا۔

ہر شخص کی اپنے اپنے حالات و واقعات اور معیارِ عیش و نشاط کے مطابق الگ الگ جنّت ہے اور وہی جنّت ہم میں ایک دوسرے کے نزدیک جنّت الحمقاء ہے۔

مسائلِ اخلاق میں ایک نکتے پر صاحبِ "سوزِ ناتمام" نے بہت غور کیا ہے اور اسکے کئی افسانے رہ رہ کر اسی محور کے گرد گھومتے ہیں۔ گناہ کیا چیز ہے؟ اس مسئلے پر اس کی توجہ بار بار جاتی ہے اور مناسب یہ ہے کہ یہاں اس موضوع پر کسی قدر وضاحت سے روشنی ڈالی جائے۔ سقراط کے شہرۂ آفاق قول نے کہ "نیکی نام ہے علم کا" اخلاقیات کی تاریخ میں موافق و مخالف آرا۔ کا عظیم الشان سرمایہ جمع کر دیا ہے "سوزِ ناتمام" کا فلسفہ گناہ بھی سقراط کے اسی قول کی شرح کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ "قدرت کا انتقام" اپنے ہیرو کی خودکشی سے پہلے اسکی آخری تحریر میں یہ معنی خیز فقرہ اُسکے ہاتھ سے لکھواتا ہے:-

وہ زبردست گناہ اور خوفناک جرائم جو اپنے نتائج کے لحاظ سے انسانی زندگی

کو بالکل دو حصوں میں کاٹ کر ماضی وحال کو ایک دوسرے سے قطعاً

بے تعلق کر دیتے ہیں اور جن کے مہلک اثرات ہماری زندگی کو ایک جدید

شاہراہ پر ڈال دیتے ہیں، سابقہ غور وفکر کا نتیجہ نہیں ہوتے۔

"عذرِ گناہ" میں ہمیں صراحتہً بتایا گیا ہے کہ "ہم گناہ صرف لاعلمی کی وجہ سے کرتے ہیں"

اس افسانے کا ہیرو اسلم اُن نوجوانوں میں سے ہے جن کے لئے گناہ وثواب کے قدیم معیار

نابود ہو چکے ہیں اور عہد جدید کے ہنگامہ وغوغا میں اُنہیں کوئی نیا تشفی بخش معیار نہیں ملتا۔

چنانچہ وہ تجربتہً گناہ کی زندگی اختیار کر لیتا ہے کیونکہ اسکے نزدیک "صحیح علم صرف تجربات

کی آگ میں کودنے ہی سے حاصل ہوتا ہے۔" اسی طرح سہیل خدا کی ہستی کے متعلق یاس وقنوط

کا شکار ہو کر خودکشی کر لیتا ہے تو اس کا دوست اس کی داستانِ حیات سُناتے ہوئے کہتا ہے

سہیل نے جو کچھ کیا وہ ٹھیک تھا یا غلط، اس کا صحیح محاکمہ کرنیکے میں اب قابل ہوا ہوں

مجھے یقین ہے کہ اگر سہیل میرے ساتھ مراحلِ زندگی طے کرتا ہوا یہانتک

آپہنچتا ہے تو جس طرح دنیا کے نشیب وفراز آج میری آنکھوں کے سامنے بے نقاب ہو رہے

ہیں۔ اسی طرح وہ بھی زندگی اور اسکے مختلف پہلوؤں پر حاوی ہو جاتا۔

گناہ ومعصیت کو ناواقفیت کا نتیجہ قرار دے کر "سوزِ ناتمام" کا مصنّف سوسائٹی سے

تعزیرِ جرم کا حق چھین لینا چاہتا ہے، سوسائٹی کے افراد جو بسا اوقات اعلےٰ درجہ کے

فہم واحساس سے نابلد ہوتے ہیں جب کسی خطاکار کو سزا دینے میں اپنے جوش وغضب کا

اظہار کرتے ہیں تو مصنّف حسرت ویاس کے لہجے میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔

دُنیا میں کون ہے جس نے عمر بھر کبھی غلطی نہیں کی؟ لیکن لوگ بڑے سنگ دل ہیں۔ اپنی کمزوریوں کو بھول جاتے ہیں۔ اپنے گناہوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور شاید انتقام کے لیے اُس شخص پر ٹوٹ پڑتے ہیں جو اپنی کسی اتفاقی لغزش سے، لغزش بھی وہ جس پر اُسے اپنے جذبات کا لحاظ کرتے ہوئے بالکل قدرت حاصل نہ تھی، نادم ہو کر ان کے طعنوں کا ترکی بہ ترکی جواب نہیں دے سکتا۔

اس کے علاوہ مصنّف کے نزدیک ہر گناہ اپنی سزا اپنے ساتھ لاتا ہے۔ بلکہ قدرت کا انتقام زیادہ شدید اور قطعی ہے۔ اس صورت میں سوسائٹی کے درندوں کی ہائے وہُو مصنّف کو خصوصیّت سے دلخراش معلوم ہوتی ہے:۔

جس طرح مجھ پر عرصۂ حیات تنگ کیا جا رہا ہے اس کی مثال میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ اوّل تو ہمارے ہاں سوسائٹی سرے سے مفقود ہے لیکن آبادی کے جس بہیمانہ عنصر اور تماشائیوں کے جس غیر تربیت یافتہ گروہ کو تم سوسائٹی کہتے ہو۔ اس کے خلاف بھی تو مَیں نے کوئی جرم نہیں کیا کہ یوں تحت الثرٰی کی خبیث روحیں مجھ پر پنجے جھاڑ کر پل پڑتیں۔

اس تمام چھان بین اور آزمائشی سرگردانی کے بعد مصنّف "حیاتِ تازہ" میں گناہ کے ایک نئے تصوّر تک پہنچتا ہے۔

ہم میں سے ہر شخص اپنی اپنی بساط کے مطابق قطع منزل و حصولِ مقصد کی تگ و دو

میں مصروف ہے۔ ہر انسان چھوٹے پیمانے پر خود ایک خالق ہے اور ان تخلیقی قوتوں کو ضائع کرنے کا نام ہی گناہ ہے عملی نقطہ نظر سے برا کام کرنے والا انسان اُس شخص سے بہتر ہے جس کی قوتیں زنگ آلود ہو کر بیکار ہو چکی ہیں۔

اس نئے معیارِ اخلاق سے منحرف ہونے والوں کے لئے تعزیرات کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ قدرت خود بڑی سختی سے اُن کے اعمال کا احتساب کرتی ہے۔

ہر شخص کی تباہی اور بربادی کے ظاہری اسباب اگرچہ مختلف ہوں لیکن باطنی سبب ایک ہی ہوتا ہے اور وہ تمام ناکام اشخاص میں مشترک ہے۔ جو انسان اپنے خیالات پر قابو کھو دے اور ضبطِ نفس کی قوت سے محروم ہو جائے اس کے ایک ہاتھ میں تم آفتاب دے دو اور دوسرے میں ماہتاب، اُس کے قدموں میں بیش قیمت خزانے لاکر ڈال دو، اور اس کے سر پر دنیا کے سب سے بڑے شہنشاہ کا تاج لاکر پہنا دو، وہ کامیابی سے محروم اور اصلی طاقت سے ہمیشہ بے بہرہ رہے گا۔

اس تمام ذوقِ عمل اور فلسفیانہ ادراک کے ہوتے ہوئے بھی "سوزِ ناتمام" کی دنیا مسرت و نور کی دُنیا نہیں ہے۔ رُوح کی تھکن اور افسردگی اور یاس و اضمحلال کی کالی گھٹا ایک تاریک رات کی طرح اس کے آسمان پر منڈلا رہی ہے اور بے اختیار ہم اپنے دل سے یہ سوال کرتے ہیں۔ کہ کیا اس دُنیا میں زندگی اس قابل ہے کہ بسر کی جائے؟ اس فضائے آبنوس میں ایک روح کے کراہنے کی آواز ہمیں آتی ہے۔

ایک بیحد ذکی الحس روح اپنی بڑھی ہوئی ذکاوتِ احساس کی وجہ سے خود اپنے آپ کو عذاب دے رہی ہے۔ یہ تعذیبِ نفس سے اُس کا انتقام ہے۔ اس لئے کہ زندگی بُری ہے عورتیں بے وفا ہیں۔ خدا اپنی مخلوق کے درد و الم سے ماورا اور بے نیاز ہے۔ دُعا کی تاثیر ایک تباہ ہوتی ہوئی دُنیا کی آرزوؤں کا واہمہ ہے۔

زندگی نام ہے اَن گنت تکلیفوں کے ایک مجموعے کا جس کا شیرازہ صرف موت ہی بکھیر سکتی ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد کی شکستوں میں ہماری قومی تہذیب نے جو زخم کھائے اُن کے درد کی کسک "سوزِ ناتمام" کے اوراق میں ایک چُبھتی ہوئی ٹیس بن گئی ہے۔ "مجروحِ احساس" میں دورِ استفہام و اضطراب کا قنوط افسانے کی پردہ پوشیوں کو بیتابی سے جھٹک کر پوری عریانی سے ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ مجموعے کا پہلا افسانہ اگرچہ ایک خاص قسم کی رجائیت کا حامل ہے اور ان افسانوں کی تمام قنوطیت سے اُس کا انداز الگ ہے۔ لیکن دراصل یہ رجائیت پر مصنّف کا سب سے زیادہ پُرکارانہ وار ہے۔ یہاں ہمیں بتایا گیا ہے کہ "کامیاب زندگی کا راز یہی ہے کہ زندگی کو اہمیّت نہ دو۔" حیاتِ دُنیا کا باطل و بے قیمت ثابت ہونا ایک قسم کی سلبی تسلّی ہے جس پر ہم اپنی مسرت کے قصر تعمیر نہیں کر سکتے۔ "رات کی خاموشی میں" جس تحریر کا عنوان ہے۔ اُسے پڑھئے تو یہ صاف ظاہر ہوگا کہ اس مضمون کے لکھنے والے کے لئے غم

کوئی کتابی فلسفہ نہیں، ایک زندہ حقیقت ہے۔

رات کی خاموشی میں، تنگ و تاریک جھونپڑے کی گلا گھونٹنے والی ہوا کے اندر، فرشِ خاک پر لیٹے ہوئے کئی مرتبہ میں نے چاہا کہ اب ایسی نیند سو جاؤں کہ پھر نہ اٹھوں۔ گناہ کا بار سینے پر لئے ہوئے اس طرح غائب ہو جاؤں کہ دُنیا اور دُنیا والوں کے لئے کوئی نشانِ عبرت بھی باقی نہ رہے۔ مگر ہر صبح جب صبحِ قیامت کے استقبال کو اُٹھتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہی روزمرّہ کا سُورج اپنی آتشیں شعاعوں کے ساتھ پھر ایک بار مجھے دُنیا کی راز جُو نگاہوں کے سامنے عریاں ہدفِ استہزا بنانے کے لئے چمک رہا ہے ...... ہر شب آسمان پر تیرہ و تار بادل چھائے رہتے ہیں۔ اور کائنات ایک گھٹاٹوپ اندھیرے میں ملفوف رہتی ہے۔ لیکن اس وقت بھی گاہے گاہے بجلی چمک کر زمان و مکاں کو ایک لمحہ کے لئے ہی سہی، پُرنور کر جاتی ہے۔ مگر آہ میرا مطلعِ خیالات !!!! سالہا سال گذر جانے پر ایک امیدِ گریزاں، ایک فریبِ نفس میں مبتلا ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا ہوں۔ کہ شاید اس کے اُفقِ تاریک پر بھی کوئی روشنی جلوہ گر ہو........

ہاں اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں بھی روشنی کی ایک کرن پھُوٹتی ہے۔ اس نافرجام دُنیا میں دوستداری کا نہ چھُوٹ سکنے والا رشتہ ابھی باقی ہے۔

جب مصنّف اپنے مرصّع طرز نگارش سے احباب کی محفلیں سجاتا ہے تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے۔ کہ وہ فطرت سے مسرت و شادمانی کی نامحدود استعداد لے کر آیا تھا۔ مگر قضا و قدر کے فرشتے نے اُسے ایک بے کیف و رنگ مرتی ہوئی دُنیا میں پھینک دیا۔ وہ دراصل عہدِ قدیم کا ایک یونانی تھا جس کے چمکتے ہوئے دل و دماغ کو تقدیر نے کوئلے اور لوہے اور بھاپ اور دُھوئیں کے تمدن کی غلیظ تاریکی میں مقید کر دیا۔ پھر بھی اُس کے یونانی احساس نے اپنے لئے مسرت کی ایک راہ نکال لی۔ اُسے دوستی کی محبّت و رفاقت پر کامل اعتماد ہے اور یہ اسی لازوال اعتماد کا کرشمہ ہے کہ کبھی کبھی زندگی کے ابرِ سیاہ کے دامن سے صبحِ امید مُسکراتی ہوئی نظر آتی ہے۔

حمید احمد خاں

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اِس میں ہاتھ ہمارے قلم ہُوئے

غالب

زندگی

صبح چند مہمان آجانے کی وجہ سے تمام دن اُن کی خاطر مدارات میں صرف ہو گیا۔ عصر کے قریب میں بمشکل مطالعہ کے لئے وقت نکال سکا اور شام تک پڑھتا رہا۔ اسی ضمن میں سہ پہر کی ہوا خوری بھی ضائع ہو گئی۔ جب چراغ روشن ہوئے تو کتابوں سے دل برداشتہ ہو کر صحیفۂ فطرت کا مطالعہ کیجئے یا یونہی چہل قدمی کے لئے میں مکان کی چار دیواری سے باہر نکلا۔ ابھی دس قدم بھی نہ گیا ہونگا کہ کسی نے آہستہ سے میرے پیچھے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ مڑ کر دیکھا تو ایک دُبلا پتلا چھریرے قد کا آدمی میلی سی اچکن پہنے کھڑا تھا۔ گہری شام کے غلیظ دھندلکے میں اُسے پہچاننے میں مجھے کچھ دقت ہوئی لیکن جب اُس نے مانوس اور شیریں آواز میں، اور یقیناً وہ آواز دُنیا میں صرف ایک ہی شخص کی ہو سکتی تھی، میرا نام لے کر پکارا تو میں حیرت سے "اصغر" کہہ کر بے تحاشا اُس سے لپٹ گیا۔ معانقہ ختم ہوا تو سب سے پہلے میں نے اُس کی ظاہری وضع قطع پر لب کشائی کی جس کی وجہ سے وہ بالکل اجنبی معلوم

رہا تھا۔ پرانے بے تکلّفانہ انداز میں اُس کی کمر پر زور سے تھپکی دیتے ہوئے میں نے کہا۔ "خیریت تو ہے؟ تم نے یہ حالت کیا بنا رکھی ہے؟ اگر تم بولتے نہ تو شاید میں تمہیں پہچان بھی نہ سکتا۔"

اُس نے رُکتے رُکتے کہا۔ "میں ملتان سے آ رہا ہوں، راستے میں میرا کپڑوں کا بکس چوری ہو گیا۔"

ہمدردی کی بجائے میرے مُنہ سے بے اختیار قہقہہ نکل گیا، پھر ہنسی ضبط کرتے ہوئے میں نے کہا۔ "واللہ قدرت بھی عجب ستم ظریف واقع ہوئی ہے۔ تمہارے کپڑوں کے بکس کا گم ہو جانا اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایسا ہی افسوسناک سانحہ ہے، بلکہ اس سے بھی شدید، جیسا کسی مصوّر، نقّاش یا سنگتراش کی اختراعات فائقہ اور عمر بھر کی عرقریزی سے جمع کئے ہوئے نوادر کا کھویا جانا۔ یقیناً اس حادثے سے صنعت اور فنونِ لطیفہ کی دُنیا کو بہت نقصان پہنچے گا۔ کہو یہ واقعہ کیونکر پیش آیا؟"

اُس نے کہا۔ "بندۂ خدا مذاق پھر کر لینا۔ پہلے یہ تو پوچھو کہ میں آیا کیوں ہوں۔ میرے قیام و طعام کا بندوبست کرو۔ میں تمہارے یہاں ٹھہرونگا۔"

"بسم اللہ۔ آئیے۔"

میں سیدھا اُسے اپنے مکان میں لے گیا۔ جب ہم اطمینان سے آرام کرسیوں پر دراز ہو گئے۔ اور لمپ کی روشنی اُس کے چہرے پر پڑی،

تو مَیں نے دیکھا کہ اصغر بہت زرد اور نحیف ہو رہا ہے۔ اگرچہ اُس نے مخصوص انداز میں اپنی تُرکی ٹوپی کو نہایت لاابالیانہ طریق سے اُتار کر میز پر پھینک دیا۔ اور زیرِ لب گنگنانے لگا۔ لیکن اس کی ہیئتِ مجموعی سے صاف پتہ چل رہا تھا۔ کہ وہ بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ دراصل آج کا اصغر اُس اصغر سے جسے مَیں جانتا تھا کوئی نسبت نہ رکھتا تھا۔ اُداس، منحنی سا چہرہ، معمولی ادنےٰ درجے کے لباس میں ملبّس آنکھوں میں کھویا پن اور کہاں وُہ چاق چوبند، خوش طبع، انگریزی معاشرت کا دلدادہ اصغر جو اپنی سحر کار شخصیت اور نُدرتِ کلام سے حاضرین کو مبہوت کر دینے کے علاوہ لطیف بذلہ سنجیوں اور فلک شگاف قہقہوں سے بزم کی بزم کو کشت زعفران بنا دیتا تھا۔ اُس کا حُسنِ مذاق مسلّم اور اُس کی رائے خصوصاً پوشاک اور آرائش کے معاملات میں ہمیشہ ہمارے حلقۂ احباب میں سند کے طور پر پیش کی جاتی تھی۔

چند لمحے خاموشی میں گذر گئے۔ تو مَیں نے کہا۔ "ہاں، تو تم نے بتایا نہیں وہ بکس کیسے گُم ہو گیا؟"

"ارے بھائی کوئی بات ہو تو کہوں۔ سراسر میری ہی غلطی تھی۔ مَیں ملتان سے چلا تو بہت سراسیمگی اور ذہنی انتشار کے عالم میں تھا۔ یہ اچکن کھونٹی پر لٹک رہی تھی۔ اسی پریشانی میں جلدی سے اُتار کر پہن لی، اور

باقی تمام کپڑے اور چند کتابیں ٹرنک میں بند کر لیں۔ ریل میں بیٹھا تو بھی وہ اُدھیڑ بن طاری رہی اور مَیں اُس ڈبے کے باقی مسافروں کا بخوبی جائزہ بھی نہ لے سکا۔ بعد ازاں مَیں نے محسوس کیا کہ وہاں دو شخص ایسے موجود تھے۔ جو اپنی حرکات سے بہت مشکوک چلن کے معلوم ہوتے تھے۔ راستے میں اتفاق سے میری آنکھ لگ گئی اور خانیوال اسٹیشن پر جاگا تو کیا دیکھتا ہوں۔ کہ ٹرنک غائب۔ کمرے میں میرے سوا اور کوئی مسافر نہ تھا۔ مَیں نے گارڈ، اسٹیشن ماسٹر اور پولیس کے افسر کو فوراً اطلاع کی۔ وہ کہنے لگے کہ اپنا سفر منقطع کر کے وہیں ٹھہر جاؤں تاکہ اُن کو تلاش و تفتیش میں سہولت ہو۔ مگر مَیں نے سوچا مضیٰ ما مضیٰ، قسمت اچھی ہوئی تو بکس بھی مل جائیگا ورنہ جان تو باقی ہے۔ اُن کو ضروری ہدایات دے کر مَیں چلا آیا۔ اگر یہ نقصان بعض اور حالات کے ماتحت ہوتا تو شاید مَیں بالکل ہی محسوس نہ کرتا مگر جیسا مبہم پروگرام اب میرے پیشِ نظر ہے اور جس قسم کی غیر مستقل زندگی سے مَیں دو چار ہونے والا ہوں وہاں لباس ایسی اہم چیز کی عدم موجودگی سے ضرور رنج ہوگا۔"

مَیں نے ایک لمبا سانس لیا اور کہا۔ "اصغر، ہم ہندوستان میں کتنی جلدی بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ میری مراد جذباتی بڑھاپے سے ہے۔

تم اور ذہنی انتشار کے عالم میں گھر سے چلو اور پھر تمام سفر ایک اُوجھیڑ بُن میں گزار دو۔ خدا کی قسم میں باور نہیں کر سکتا۔ مگر جب دیکھتا ہوں کہ یہ بُڑھاپا ہر لحظہ ہم پر شدت سے وار کر رہا ہے اور بہت کم لوگ ہیں جو اپنے اندر قوت مدافعت رکھتے ہیں تو میرے لئے حیرت کی کوئی وجہ نہیں رہتی اور تمہاری گذشتہ زندگی سراسر ایک تعلّی معلوم ہوتی ہے۔"

"تعلّی؟" اصغر چیک کر اُٹھ بیٹھا۔ "تم دیکھو گے کہ میں اصول سے سرِ مو انحراف نہیں کرتا۔ باقی رہا یہ کہ میں خاص احوال میں کیوں سراسیمہ ہوا تو عرض ہے کہ میں نے اس بات کا تو کبھی دعوے نہیں کیا کہ میرے اعصاب فولاد اور قلب و دماغ پتھّر کے ہیں۔ ہر ذی حیات شعوری یا غیر شعوری طور پر زندگی کی ارتقائی منازل طے کر رہا ہے۔ اور منجملہ اُن بالا از شمار نفوس کے ایک میں بھی ہوں جسے اسرارِ حیات کو سمجھ لینے کا دعوےٰ تو نہیں ہاں جس نے بزعم خود ایک ایسا راز جان لیا ہے جس سے زندگی کی غایت پر روشنی پڑتی ہے۔ اسی روشنی میں میں نے اپنے لئے چند اصول وضع کر لئے ہیں۔ جو میری رہبری کر رہے ہیں۔ تم ان باتوں پر ہنستے ہو لیکن ایسی ہنسی میں پہلے کئی مرتبہ دیکھ چکا ہوں۔ تم مجھے نور کو تاریکی اور تاریکی کو نور کہنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ لاریب مجھ میں

بہت سی خامیاں ہیں جن کو رفع کرنے کے لئے میں ہمیشہ جدوجہد میں مصروف رہتا ہوں۔ آخر انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں ہوں۔ کہ گردشِ مدام سے گھبرا نہ جاؤں۔ ہر چند کہ جانتا ہوں یہ گھبراہٹ سراسر بے سود اور تکمیلِ حیات میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے لیکن میرے عمل کی کوتاہی سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ زرّیں اصول جس کی حقانیت اور صداقت پر مجھے دو اور دو چار والا اعتقاد ہے اپنے اندر کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ تم اسے وہم کہتے ہو۔ لیکن خدارا مجھے بتاؤ ہماری زندگی میں کوئی ایسی چیز، مادی یا غیر مادی، بھی ہے جس کی بُنیاد وہم نہ ہو؟ عزیز دوست، انسان کے تمام اعمال و معیار اعتباری ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو کامیابی پر آپے سے باہر ہو جانے اور ناکامی پر گریہ وزاری کرنے کے کیا معنی؟ تم میرے ہی کہنے سے اُس اصول کو جسے میں صداقت اور تم وہم سے تعبیر کرتے ہو ایک مرتبہ تو اپنی زندگی میں جاری و ساری ہو جانے کا موقع دو۔ پھر دیکھو کہ حجابات یک قلم اُٹھ جاتے ہیں یا نہیں؟ علّت و معلول کی اس دُنیا میں جہاں جاندار اور بے جان سبھی ایک غیر مختتم سلسلے میں منسلک ہیں۔ اسباب و نتائج کی طبعی کڑی سے کیونکر آزاد ہو سکتا ہوں۔ باقی انسانوں کی طرح میں بھی حسبِ منشاء نتائج اخذ کرنے کے لئے اسباب پر قدرت حاصل کرنے کا متمنی ہوں مگر بسا اوقات

ناکامی سے واسطہ پڑتا ہے۔ ناکامی ہماری طبائع پر کیونکر اثرانداز ہوتی ہے۔ بس یہیں سے میرے تمہارے راستے الگ الگ ہو جاتے ہیں۔"

ابھی خدا معلوم وہ اس لے میں کیا کچھ کہہ جاتا کہ میں نے دفعتاً ایک قہقہہ لگا کر اُسے خاموش کر دیا۔

مَیں نے کہا۔ "سبحان اللہ کیا کہنے ہیں آپ کی لسّانی کے۔ آئینہ لاؤں حضور کے سامنے کہ آپ کو اپنے اصول کی حقانیت پر ایمان آ جائے۔ ذرا اس چہرے کو دیکھو جس میں خونِ زندگی کا قطرہ تک نظر نہیں آتا۔ اپنی جھرّیوں سے اٹی ہوئی پیشانی دیکھو۔ رخساروں سے زردی اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے دیکھو۔ اپنے ہاتھوں سے اپنے جسم کی ہڈّیاں گن لو۔ ایک جھلتی ہوئی نگاہ اپنے لباس پر بھی ڈال لو کہ یہ اُس شخص کا لباس ہے جو زیادہ عرصہ نہیں گزرا ذوقِ جمال و آرائشِ لباس کے معاملہ میں مجتہد کا درجہ رکھتا تھا۔ اور پھر مجھے بتاؤ کہ اگر غیر فانی شباب اسی کا نام ہے تو ننگِ شباب کی اصطلاح کس پر عائد ہوتی ہے؟"

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اصغر کے متعلق قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کروں تاکہ یہ گفتگو پس منظر کی روشنی میں زیادہ دلچسپ اور واضح ہو سکے۔ یہ کہنا کہ اصغر میرا دوست تھا چنداں قابلِ التفات بات نہیں کیونکہ طالب علمی کا زمانہ تو ہر شخص پر دوستی کا ملمع چڑھا دیتا ہے۔

اصغر اور مَیں چار سال ایک ہی کالج اور ایک ہی ہوسٹل میں رہے۔ جن میں سے ایک سال کے لئے مَیں اور وہ "ہم کمرہ" بھی تھے۔ اصغر کے حقیقی بہن بھائی کوئی نہ تھا۔ اور والد کے ساتھ بھی اس کے تعلقات کشیدہ نہ تھے۔ تو بہت زیادہ خوشگوار بھی نہ تھے۔ طوعاً و کرہاً وہ اس کے تعلیمی اخراجات کے کفیل ہو رہے تھے۔ ان ہی وجوہ سے اصغر کی صرف اپنی زندگی اس کی تمام تر توجہات اور دلچسپیوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ چھٹیوں میں بھی وہ بہت کم مکان پر جاتا تھا۔ کبھی میرے ہاں کبھی آپ کے، یونہی فرصت کا وقت گزار لیتا یا اگر جیب گرم ہوئی تو ہندوستان کے مختلف شہروں کا چکر لگانا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ حالات کی اس ناساعد روش نے، جو یقیناً مجھ ایسے ذکی الحس انسان کے لئے بے حد تکلیف دہ اور ضرر رساں ثابت ہوتی، اصغر کی طبیعت میں ایک خاص قسم کی بے نیازی اور قوّتِ ارادی پیدا کر دی۔

سماج میں فرد کی حیثیت سے انسان پر بہت سے ایسے فرائض بھی عائد ہوتے ہیں جن کو اس کے طبعی رجحان اور حقیقی ذوق کے ساتھ چنداں تعلق نہیں ہوتا۔ والدین کی خدمت، دوستوں کی مروّت، بیوی بچّوں کی اُلجھن، بھائی بہنوں کی محبّت، تعلقات کی ایسی سیکڑوں زنجیروں نے ہمیں سماج کے مختلف شعبوں سے اس طرح باندھ رکھا ہے کہ انفرادی

زندگی کا کوئی مفہوم ہی نہیں رہا۔ دراصل انسانی زندگی ایسے ہی خونی رشتوں اور جذباتی تعلقات کے مجموعہ کا نام ہے۔ ان بندھنوں سے جیتے جی آزاد ہونا محالات سے ہے۔ لیکن ہم ایسی زندگی کا تصوّر ضرور کر سکتے ہیں اور اُس کا قیام بھی ممکن ہے جہاں انسان محض اپنے لیے زندہ رہتا تھا۔ ایسا قائم بالذّات شخص جو طعن و تشنیع کے دغدغے سے بے نیاز اپنی ہر ممکن الحصول خواہش کی تکمیل کے لئے آمادہ کار ہو جائے۔ جس کے لئے کل کائنات سمٹ سمٹا کر اس کی اپنی زندگی میں محدود ہو گئی ہو، جس کی آرزوئیں رسمیات عہد کے دباؤ اور جس کے ارادے خندۂ استہزا کے خوف سے یکسر آزاد ہوں بلاشبہ اپنی زندگی میں ایک خاص لذّت رکھتا ہے۔ بعض دُنیادار شاید اس حالت کو آوارگی سے تعبیر کریں۔ لیکن سچ پوچھئے تو ہر جذبہ اپنی آخری منزل میں بے عنان ہو کر آوارگی ہی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ آج سے کئی سال قبل جب میں اوّل اوّل اصغر سے ملا تو اُس کی اسی قسم کی آزادی وبے عنانی نے مجھے بھونچکا سا کر دیا۔ کہاں کالج کا ایک مبتدی اور کہاں یہ باغیانہ طبیعت۔ ذہانت کے لحاظ سے وہ اپنے ہم جماعت طلبہ میں بہت کم حریف رکھتا تھا۔ لیکن چونکہ اُس نے اوقات بہت بے ڈھنگے طریق سے تقسیم کر رکھے

تھے۔ اس لئے بعض دفعہ وہ کئی کئی ہفتے کسی کتاب کو نہ چھوتا۔ پڑھنے پر آتا تو زاہدِ شب زندہ دار کی طرح رات کو آنکھ جھپکنا بھی حرام سمجھتا تھا۔ میں کبھی اُس کے لااُبالی پن پر لب کُشا ہوتا تو وہ یہی جواب دیتا تھا کہ "مَیں طالب علمانہ شہرت حاصل کرنے کا خواہاں نہیں ہوں۔ کہ کتابوں میں سر کھپانا مقصودِ زندگی قرار دے لُوں۔ کتب بینی جو مشاہدے کی صلاحیت سلب کرلے ایک ذہنی بیماری ہے۔ میرے لئے تو اسی قدر مطالعہ کافی ہے۔ جس سے امتحان میں کامیابی حاصل ہو سکے" اور پھر عالمِ سرخوشی میں یہ شعر پڑھ دیتا۔

مومن بہشت و عشقِ حقیقی تمہیں نصیب

ہم کو تو رنج ہو جو غمِ جاوداں نہ ہو!

دو سال کے بعد جب اتفاق سے میری اور اُس کی رہائش ایک ہی کمرے میں ہوگئی تو اُس کے حالات و اطوار زیادہ وضاحت کے ساتھ مجھ پر عیاں ہونے لگے۔ اُس کا معمول تھا۔ کہ سرِشام کھانا کھا کے نکل جاتا اور رات کے گیارہ بجے واپس آتا۔ حالانکہ قواعد کی رو سے کوئی طالب علم نو بجے کے بعد اپنے کمرے سے باہر نہیں رہ سکتا تھا۔ خوبیٔ قسمت سے دارالاقامہ کے مہتمم بہت بامذاق اور زندہ دل تھے۔ اُنہوں نے جب بھی سرزنش کی۔ اصغر نے ہنس کر جواب دیا۔ "حضرت!

نوعِ انسان پر ایک ہی قسم کے قوانین عائد کرنا دانشمندی نہیں۔ بعض کو قدرت مستثنیات کے لئے پیدا کرتی ہے۔ بندہ بھی انہیں میں سے ہے۔"

اُس کی صحبت یقیناً افزائشِ مسرت کا موجب تھی مگر جب وہ آدھی رات کو آکر سوتوں کو جگاتا اور دروازہ کھٹکھٹا کر میرے آرام میں بے طرح مخل ہوتا تو طبیعت جھنجھلا اُٹھتی تھی، اور پھر ایک روز کی بات ہو تو مضائقہ نہیں، اُس کا تو مہینے میں تیس دن وطیرہ ہی یہی تھا۔ ایک رات وہ خلافِ معمول بہت دیر سے آیا۔ شاید دو بجے ہو نگے۔ صبح ہوئی تو میں نے سامان باندھنا شروع کر دیا۔ بڑی بیتابی سے پوچھنے لگا۔ "خیر ہے۔ کہاں کا ارادہ ہے؟"

میں چلّانے لگا۔ "تمہارے ساتھ رہ کر میں اپنی صحت خراب کرنا نہیں چاہتا۔ غضب خدا کا دن بھر تو کالج کی بک بک میں صرف ہو جاتا ہے۔ رات کو آرام کا وقت تم یوں برباد کر دیتے ہو۔ اگر ایسی ہی آوارگی دماغ میں سما گئی ہے تو کالج کو خیرباد کہہ دو۔ تم ایسے جہاں گردوں کے لئے خدا کی زمین تنگ نہیں ہے۔"

وہ بستر سے اچھل کر مجھ سے آلپٹا۔ "دوست خفا ہو گئے؟ سچ پوچھو تو تمہارے ہی بھروسے پر یوں بے فکری سے گزر رہی ہے ورنہ مجھ ایسے سیلانی کو ہوسٹل کی قید و بند میں رہنے کا سلیقہ کب تھا۔ یار تم بھی کسی کٹھ ملّا سے کم نہیں۔ کئی بار میں نے کہا کہ کتابی کیڑا بننا ہی طالب علمی کی غایت نہیں ہے۔

انسان تو عمر بھر طالب علم رہتا ہے اور حصولِ علم کی سیکڑوں راہیں دُنیا میں کھلی ہیں، لیکن تم ہو کہ کالج کے کمرے اور درسی کتابوں کے گنبد سے نکلنا ہی نہیں چاہتے۔ خدا کے لئے کوئیں کا مینڈک نہ بنو۔ ذرا چلو پھرو۔ دُنیا جہان کی سیر کرو۔ زندگی کا مختلف پہلوؤں سے نظارہ کرو۔ حواس کو آزاد چھوڑ دو۔ پھر دیکھو کہ نفسیات کا علم کتابوں کے مطالعہ سے حاصل ہوتا ہے یا ذاتی تجربات سے۔"

اصغر سخت کثیر الاحباب تھا۔ لیکن دوستی کے متعلق اس کا نظریہ بھی عجیب تھا۔ وہ کہتا تھا "مجھے ان لوگوں پہ ہنسی آتی ہے جو دوستی کو لازمہ حیات تصوّر کرتے ہیں۔ چودھویں صدی کی شعلہ آشام دوستیاں پانی کے بُلبلے اور آنکھ کے اشارے سے جلد فنا ہو جاتی ہیں، پھر ایسی ناپائدار چیز کو ہم کیونکر روح کی غذا بنا سکتے ہیں۔ وہ لوگ جو دوستوں کی صحبت کے بغیر زندگی گذارنے کی اہلیت نہیں رکھتے خطرناک فریب نفس میں مبتلا ہیں۔ تم نے بہت سے فریب خوردہ اشخاص کو دیکھا ہوگا جو گزشتہ صحبتوں کی یاد میں آٹھ آٹھ آنسو رونے اور ایّامِ رفتہ کو یاد کر کر کے آہیں بھرنے کے عادی ہیں۔ یہ بے چارے اُسی قماش کے بزرگ ہیں جو بسراوقات کے لئے دوستی کو دو وقت کی روٹی کی طرح ضروری سمجھتے ہیں۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ اپنی وفا کیشیوں اور جاں سپاریوں کے عوض میں دوسروں سے بھی تسلیم و وفا کی توقع رکھتے ہیں۔

نادان نہیں سمجھتے کہ اس تغیّر پذیر عالمِ اراضی میں اکثریت اُن کی ہے جو نہیں جانتے وفا کیا ہے۔ بھائی! سچ جانو میں تو شطرنج اور ٹینس کی طرح دوستی کو بھی وقت فرصت گزارنے کا ایک کھیل سمجھتا ہوں۔ جب کام سے طبیعت اُکتائی دو گھڑی کے لئے کسی دوست کو جا پکڑا۔ جس طرح شطرنج نہ کھیلنے کے باوجود تمام عمر خوش رہ سکتا ہوں اسی طرح دوستوں سے قطع تعلق کر لینے پر بھی میری زندگی میں ملال پیدا نہیں ہو سکتا۔"

اصغر صرف لباس کے معاملے میں محتاط تھا۔ کچھ تو مزاج طبعاً خوش پوشی کی طرف راغب تھا اور کچھ اس کا خیال تھا کہ دُنیا کو صرف لباس کے ذریعے سے دھوکا دیا جا سکتا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ "میں بڑے بڑے جہاں دیدہ لوگوں سے ملا ہوں جو بزعم خود علم و فضل کے مجسمے بنے بیٹھے ہیں۔ اور جن کا خیال ہے کہ انہیں زندگی کے نشیب و فراز اور حیاتِ انسانی کی باریکیوں سے کامل آگاہی حاصل ہے۔ لیکن کوئی ملاقات ایسی نہ تھی جس کے اختتام پر میں نے اُن کی سادہ لوحی پر قہقہے نہ لگائے ہوں۔ تمدنِ جدید کے مطابق شاندار لباس زیبِ تن ہو اور واقعاتِ عالم پر فصاحت کے ساتھ گفتگو کرنے کا ڈھنگ تمہیں آتا ہو تو دُنیا کو اُلّو بنا لینا بڑی بات نہیں۔"

ایک دفعہ تو اس نے غضب ہی کر دیا۔ بڑے دن کی تعطیلات سے قبل کالج کا سالانہ ڈنر تھا جس میں شرکت کے لئے اُس نے بڑے ٹھاٹھ کا

سوٹ سلوایا تھا۔ ڈنر کے روز جب اُس نے اپنے کپڑوں کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ نئے سوٹ کے ساتھ پہننے کو کوئی حسب پسند نکٹائی نہ تھی۔ اُدھر مہینے کا اخیر تھا۔ اور اُس کی جیب خالی ہو چکی تھی اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ فلسفے کی درسی کتاب (جسے اس نے ابھی چند روز ہوئے بازار سے خریدا تھا) ایک کتب فروش کے ہاں نصف قیمت پر فروخت کر دی۔ اور بازار سے نئی نکٹائی خرید لایا۔

اپنی خصوصیات کی بوقلمونی کے لحاظ سے اصغر ایک اچنبا تھا۔ ہمیشہ مقروض رہتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر کارکنانِ قضا و قدر نے کبھی حکومتِ پنجاب کی کرسیِ وزارت مجھے بخشی تو پانچ ہزار روپیہ مشاہرہ پانے کے باوجود میں تھوڑا بہت مقروض ضرور رہوں گا۔" جن لوگوں کو اُس سے زیادہ واقفیت نہ تھی وہ اُسے ایک سطحی نگاہ رکھنے والا شخص تصوّر کرتے تھے جسے حالاتِ دُنیا کا بغور مطالعہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ چونکہ کسی شے کو اہمیت دینے کا عادی نہ تھا۔ اس لیے بعض سنجیدہ مزاج لوگوں کو بھی اس سے شکایت تھی۔ لیکن دراصل اصغر کو دُنیا والوں کی کمزوریاں اور تعلّیاں دیکھ دیکھ کر زہرخند ہونے کی عادت ہو گئی تھی۔ عیب و ثواب کی کوئی راہ نہ تھی جس پر وہ گامزن نہ رہ چکا تھا اور نیکی بدی کا شاید ہی کوئی کوچہ ہو گا جس کو اُس نے پامال نہ کیا ہو۔ میں اس کی وقّتِ نظر کا ہمیشہ معترف

رہا ہوں۔ بے خبری اور جہالت کو مسرت کا ضامن قرار دیا جاتا ہے لیکن وہ اُن چند در چند نفوس میں سے تھا جو سوچتے ہیں اور پھر مسرور رہتے ہیں۔ اصغر یقیناً ایک رجائی تھا لیکن اُس کی رجائیت جہالت پر مبنی نہ تھی۔ اُس نے زمانے کا سرد و گرم چکھا۔ خار دار جھاڑیوں میں اُلجھ کر دامن کو تار تار کیا۔ پھولوں کے تختوں میں سے نسیم سحری بن کر گزرا اور پھر اس نتیجے پر پہنچا کہ اپنی نگاہ میں رنگینی داخل کر لو اور کل کائنات قوسِ قزح کی طرح نظر فریب ہو جائیگی۔ طبیعت میں استغنا پیدا کر لو تو جھونپڑوں میں محلوں کے عیش اٹھاؤ گے۔

ایک روز ہم سب بیٹھے تھے۔ ہمارا دوست وحید بھی تھا۔ وحید تھا تو بہت ذہین لیکن اُس کی ذہانت اُس کے لیے وبال بن گئی تھی اُس کا تخیّل طوفان زدہ جہاز کی طرح ہمیشہ پریشان و مضطرب رہتا تھا۔ کچھ شاعر، کچھ وہمی، قدرے مریض اور اُس پر طرّہ یہ کہ محبّت کا زخم خوردہ۔ وہ اکثر عزلت نشینی کو پسند کرتا اور عہد ماضی کی نوحہ خوانی میں مصروف رہتا تھا۔ یا پھر مستقبل کے خواب دیکھ دیکھ کر حال کو اور زیادہ افسردہ بنا دیتا تھا۔ وہ اصغر کو ہری چُگ کے نام سے پکارتا تھا۔ اور اصغر صاحب تھے کہ اس نام کی موزونیت پر لوٹ پوٹ ہوئے جاتے تھے۔ اصغر نے اُس روز وحید کو مخاطب کر کے دیر تک سلسلۂ کلام جاری رکھا اور

سچ پوچھے تو ہماری معلومات میں دل خوش کن اضافہ کیا۔ وہ کہنے لگا۔ "دیکھو بھائی وحید اگر چندے تمہاری یہی حالت رہی تو قیس کی دیوانگی اور فرہاد کی کوہ کنی کو دنیا یقیناً فراموش کر دے گی اور تم اُن کے جانشین کی حیثیت سے مسندِ تاریخ پر رونق افروز نظر آؤ گے۔ اگر بقائے دوام کے خواہشمند ہو یا شہیدانِ عشق کی فہرست میں نام لکھانا چاہتے ہو تو تمہارا یہ طریق عمل بہت موزوں ہے لیکن اگر زندہ رہنا اور زندگی کی حلاوتوں سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہو تو خدا کے لئے اُس 'نیک بخت' کو بھلا دو۔ زندہ قوموں کا عشق بھی حیات افروز ہوتا ہے لیکن ہمارے ہاں عشق اور تپ دق ہم معنی الفاظ ہیں۔ اور پھر اس ملک میں رہ کر عاشق بننا تو فطرت کے خلاف جنگ کرنا ہے۔ مَیں سُنتا ہوں کہ تمہاری محبوبہ ہندوستان کے جذبات کش طرزِ انتخاب کے ماتحت کسی اور کے حوالے کر دی گئی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو تم کیوں ہمالیہ سے ٹکرا کر سر کو لہولہان کر رہے ہو۔ محبّت تو جذبات کی انتہائی کمزوری کا نام ہے۔ اور ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ہر دعوے دار اپنی محبّت کو بے لوث ظاہر کرتا ہے۔ جہاں خون کا جوش زیادہ ہوا محبت کے جراثیم پیدا ہونا شروع ہو گئے۔ میں حیران ہوں کہ اس "غلام آباد" میں اور مصائب کیا کم ہیں کہ عشق کا روگ ایزاد کر دیا جائے۔ سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہم میں زندگی بسر کرنے کی صلاحیت نہیں۔ بات بات پر آنکھوں کو آنسوؤں سے ڈبڈبا لینا، ہر وقت ٹھنڈی آہیں بھرنا،

دُنیا کو دھوکے کی ٹٹّی کہنا، ہر ہنسنے والے کو خدا سے باغی اور قہقہہ لگانے والے کو گنہگار خیال کرنا یہاں دینداری میں داخل ہے۔ تم گردن جُھکا کر، آنکھیں بند کر کے چُپ چاپ گزر رہے ہو۔ درحالیکہ چھوٹی چھوٹی چیزیں، معمولی معمولی واقعات جن کے اندر مسرت و شادمانی کے لازوال خزانے پوشیدہ ہیں تمہیں زبانِ حال سے پکار پکار کر اپنی طرف متوجہ کر رہے ہیں۔ کوئی بسترِ علالت پر کراہ رہا ہے اور کوئی عسرت و تنگدستی کے ہاتھوں نالاں ہے۔ کوئی کسی عزیز کی موت پر نالہ کناں ہے اور کوئی فکرِ فردا و غمِ ماضی میں جان گُھلا رہا ہے۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ ہم ابھی تک بحرِ حیات کی موجوں کے تھپیڑے کھا رہے ہیں۔ کوئی نہیں چاہتا کہ سطح کے نیچے جا کر دیکھے کہ کیسے کیسے گرانقدر دفینے اور زر و جواہر کے عظیم الشان انبار مدفون ہیں۔ کامیاب زندگی کا راز یہی ہے کہ زندگی کو اہمیت نہ دو۔ زندگی تو مسرور و معطر ہوا کا جھونکا ہے جو سن سے گزر جاتا ہے اور تم اس نسیم جانفزا کو روکنے کی فکر میں ہو۔ یہ جھونکے اسی طرح آتے اور گزرتے جائیں گے۔ تمہارا فرض بس اتنا ہے کہ اُن کی عطر بیزی سے اپنے دل و دماغ کو مسرور بناؤ اور چلتے جاؤ۔ کائنات کی وسعتِ بے پایاں کو دیکھو جس میں اس دُنیا جیسی ہزاروں دُنیائیں آباد ہیں۔ اور پھر ان دنیاؤں میں جاندار مخلوق بھری پڑی ہے۔ اس بے شمار جاندار آبادی کا نقشہ چشمِ تخیّل کے سامنے لاؤ۔ اور سوچو کہ ارض و سما کے درمیان اور اس پہنائے عظیم کے اندر ایک تمہاری ہستی بھی ہے جو فنا کے غارِ عمیق

کے کنارے کھڑی بادِ مخالف کی تُندیوں سے ہر گھڑی کپکپا رہی ہے تمہاری تو حقیقت ہی کچھ نہیں۔ اجل کا ادنےٰ سا اشارہ تمہیں ملیامیٹ کر سکتا ہے سہ روزہ زندگی کی ناپائداری پر غور کرو کہ کل صبح تمہیں اپنے بستر پر سے صحیح وسالم اُٹھنے کا یقین بھی نہیں اور پھر آلام و تفکرات کے اُس لا متناہی سلسلہ پر غور کرو جس نے تم پر خواب و خور حرام کر کے رات کی نیند اور دن کا چین چھین رکھا ہے کیا تمہارے اوہام و تردّدات تمہاری کم فہمی کی دلیل نہیں؟ دماغ کو برتو اور سوچو کہ تمہاری کل پریشانیاں کیا اس نقطہ پر نہیں آٹھہرتیں کہ تمہیں پیٹ بھر کر کھانا اور تن ڈھانکنے کو کپڑا درکار ہے؟ اور پھر خدارا مجھے بتاؤ کہ کیا تم نے کبھی کسی کو فاقوں مرتے یا شارع عام پر برہنہ جسم پھرتے دیکھا ہے؟ یقین جانو کہ ہر شخص قوتِ لایموت کے مطابق کھا رہا ہے اور منظر عام پر برہنہ پھرنے والے کو خود حکومت لباس مہیا کر دیتی ہے۔ پھر تم کیوں خیالی ہموم و غموم سے مرے جا رہے ہو؟ اگر ریشم کی قمیص نہیں تو نہ سہی گاڑھے کا کُرتہ پہن لیں گے۔ ولایتی ساخت کا پمپ میسّر نہیں تو بلا سے دیسی جوتا اس سے زیادہ مضبوط اور آرام دہ ہے۔ عزیز دوست، دُنیا کو ایک اسٹیج تصوّر کرو اور ہر مرد و زن کو ایکٹر۔ تفریح و تفنّن اور رنج و حرماں کے کل مظاہر درحقیقت کامیڈی اور ٹریجیڈی کے کھیل ہیں۔ جن سے متاثر ہونا قرینِ قیاس نہیں۔ ہر واقعہ کو ایک بے غرض و غیر جانبدار تماشائی کی حیثیت سے ملاحظہ کرو لیکن اس دوران میں اپنے

احساس کو واقعہ کی نوعیت سے آلودہ نہ ہونے دو۔ اس عالمِ متغیر میں جس کی کسی شے کو ثبات نہیں اور جہاں ہر گذرنے والا لمحہ ایک نئی زندگی کی آفرینش کا پیغام دے جاتا ہے زمانے کی نیرنگیوں اور انقلابات دہر سے اثر پذیر ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ تمہیں اپنے دل و دماغ پر قابو نہیں۔ واقعات عالم کا تماشا کرتے وقت ایک سائنسدان کی طرح اپنے حسّیات کو بالکل علیحدہ رکھو ورنہ یہاں گریہ و زاری کی تو بے حد ارزانی ہے۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ ہندوستان میں ہم اس قدر جلد بوڑھے کیوں ہو جاتے ہیں۔ میرے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم زندگی کو غیر معمولی اہمیّت دینے کے علاوہ اس میں کوئی جدّت پیدا نہیں کرتے۔ پیدائش سے موت تک ہم ایک ہی ماحول میں رہتے ہیں۔ وہیں پرورش پائی، وہیں بڑھے اور وہیں مر گئے۔ کسی چیز سے پوری طرح بہجت اندوز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اُس کے مختلف پہلوؤں سے تمام امکانی حظ حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ طالب علم اگر صبح سے شام تک کتابوں میں سر کھپائے اور کھیل کود حرام کرے تو مطالعہ کا مقصد فوت ہو گیا۔ وکیل اگر گھر سے کچہری اور کچہری سے گھر تک ہی زندگی محدود کر لے یا ایک طبیب اگر دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کر کے امراض کی تشخیص اور مریضوں کے معائنے تک ہی اپنے آپ کو وقف کر دے تو اُس نے زندگی کا صرف ایک پہلو دیکھا ہے اور

باقی پہلوؤں کے لئے وہ اندھا ہے۔ ایک ہی قسم کے ذائقہ سے طبیعت جلد سیر ہو جاتی ہے۔ مصروفیتوں میں ردّ و بدل کرتے رہو گے تو دنیا کی چیزیں بہت زیادہ خوبصورت اور جاذبِ توجہ ثابت ہوں گی۔ کبھی "فقیروں کا بھیس بنا کر" تماشائے اہلِ کرم" دیکھو تو کبھی اہلِ کرم بن کر فقیروں کا تماشا دیکھو"

بی اے تک ہم اکٹھے رہے اس کے بعد میں ایم اے میں آگیا اور اصغر گھر بے کار بیٹھا رہا۔ میرا خیال تھا کہ اب وہ زندگی کا بے کاری کے نقطۂ نگاہ سے مطالعہ کریگا۔ لیکن بعد ازاں معلوم ہوا کہ اُس کے والد اُسے تعلیم دینے کے حامی نہ تھے۔ اس لئے اصغر کو مجبوراً لاہور کی جاں بخش درس گاہوں سے محروم رہنا پڑا۔ ایک سال گزر گیا اور اگلے برس اصغر نے لا کالج میں داخل ہو کر سب دوستوں کو حیران کر دیا۔ کہاں اصغر اور کہاں قانون کی کٹھن منزل لیکن شاید اس نے اپنی آبلہ پائی کا یہی علاج سوچا تھا کہ وکالت کی وادی پرخار کے کانٹوں کی پیاس بجھائی جائے۔ ہم جانتے تھے کہ اس بیل کا منڈھے چڑھنا مشکل ہے۔ سال بھر اصغر قانون کی ضخیم اور خشک کتابوں کا پلندا اُٹھائے دو میل کا فاصلہ طے کر کے ہر روز صبح آٹھ بجے کالج پہنچتا رہا۔ اُس کی باقی زندگی اُنہی دیرینہ خصوصیات کی حامل تھی۔ جدّت کا وہ اب بھی متلاشی تھا اور شاید لا کالج میں داخل ہونا بھی حصولِ جدّت کی ایک سعی

تھی۔ مگر اُس کی ذہانت قانون کی حریف نہ ہو سکی۔ یہاں تو وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو دُنیا کو صرف دو اور دو چار سے تعبیر کریں۔ امتحان میں ناکامی کی خبر اس کو ایک انگریزی روزنامہ کے ذریعہ سے ملتان میں ملی۔ اُس کے والد جو پہلے ہی سے اُسے ایک ناگوار فرض اور غیر ضروری بار سمجھے بیٹھے تھے۔ یہ خبر سنتے ہی برس پڑے اور لگی لپٹی رکھے بغیر صاف صاف اُنہوں نے کہدیا کہ "میرے مکان سے نکل جاؤ۔ مَیں عمر بھر کا اندوختہ تمہاری فضول خرچیوں اور تماش بینیوں پر لٹانا نہیں چاہتا۔"

یہ حالت تھی جب اصغر صاحب نیمے دروں و نیمے بروں کی صورت بنائے افسردہ و مضمحل میرے پاس آئے۔ جب ہم کھانا کھا چکے تو مَیں نے پوچھا۔ "اب کہاں کا ارادہ ہے؟"

"مَیں بمبئی جا رہا ہوں۔"

"بمبئی؟ وہاں کیا کرو گے؟"

وہ کہنے لگا۔ "تم حیران کس بات پر ہوتے ہو؟ مَیں تمہاری طرح آئی سی ایس کے خواب تو دیکھ ہی نہیں رہا کہ اس سے کم کسی چیز پر میری تسلّی نہ ہو گی۔ تمہیں معلوم ہے کہ ذاتی وجاہت و حشمت کے قائم کردہ معیار میں مَیں تمہارا ہم خیال نہیں ہوں۔ مَیں تو صرف جان و جسم کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے روٹی اور تن ڈھانکنے کو کپڑا ایک انسان کے لئے ضروری سمجھتا

ہوں اور یہ چیزیں میں ہر حال اور ہر جگہ اپنے لئے بآسانی پیدا کر سکتا ہوں اس لئے میرے لئے لاہور، کراچی، لکھنؤ، بمبئی یا لندن سب برابر ہیں"

چند روپے اُس کے پاس تھے کچھ اُس نے مجھ سے لئے اور حضرت دوسرے روز بمبئی روانہ ہو گئے۔ اس واقعہ کو اڑھائی سال گزر گئے۔ ہم بظاہر ایک دوسرے کے لئے مر چکے تھے کیونکہ نہ اُس نے مجھے کبھی خط لکھا اور نہ مجھے اس کا پتہ معلوم تھا۔ اس دوران میں میرے پرانے ہم مکتب دوست، آدم اسمٰعیل کی شادی کی تقریب آئی۔ آدم اسمٰعیل بمبئی کے رہنے والے تھے۔ اور وہیں اُن کا کاروبار تھا۔ ان کے سخت اصرار پر مجھے بھی اس تقریبِ سعید میں شریک ہونے کے لئے بمبئی جانا پڑا۔ جب شادی کی گھماگھمی سے فراغت ہو چکی تو آدم صاحب نے اپنے خاص دوستوں کو ایک شام تاج محل ہوٹل میں دعوت دینے کا اہتمام کیا۔ تاج محل کی وسیع اور شاندار عمارت کے ایک پُر تکلّف کمرے میں بیٹھے ہم سامانِ اکل و شرب کا انتظار کر رہے تھے کہ ہوٹل کا ملازم رکابیاں اُٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔ اُس نے دہلیز کے اس طرف قدم رکھا ہی تھا کہ میری اُس کی نظریں چار ہوئیں۔ مجھے اپنی آنکھوں پر شک ہونے لگا۔ میں سمجھا کہ عالمِ خواب ہے اور جو کچھ دیکھ رہا ہوں اُس کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ آنے والے شخص نے بھی میری طرف دیکھا اور سوائے ایک خفیف تبسم کے اُس کے

چہرے پر حیرت و استعجاب کی کوئی علامت نہ تھی۔ یہ اصغر تھا جو ہوٹل کے ملازم کی مخصوص وردی پہنے ہمارے لئے میز پر کھانا چن رہا تھا۔ جب وہ دوسری مرتبہ کمرے میں داخل ہوا تو میں نے بے اختیار اُس کا بازو پکڑ لیا اور چلّایا "اصغر تم کہاں؟"

اُس نے تحمّل سے جواب دیا۔ "یہ مصروفیت کا وقت ہے۔ پہلے کھانے سے فارغ ہو لیجئے۔ پھر باتیں کرینگے۔"

میرے ساتھی حیران تھے کہ کیا معاملہ ہے۔ مَیں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ کھانے کے بعد مفصل گفتگو ہوگی۔ جب ہم ہوٹل سے رخصت ہونے لگے تو اصغر چند منٹ کے لئے میرے پاس آیا اور کہنے لگا "ابھی کام ختم نہیں ہوا ورنہ میں آپ کے ہمراہ چلتا۔ یہ بتاؤ ٹھہرے کہاں ہو؟ مَیں کل صبح آؤنگا۔" مَیں نے اپنی قیامگاہ کا پتہ دیا اور بمنت درخواست کی کہ خدا کے لئے اپنی اوّلیں فرصت میں ضرور پہنچنا۔

دوسرے روز مَیں ابھی ناشتے سے فارغ نہ ہوا تھا کہ اصغر کے آنے کی اطلاع ہوئی۔ ہلکے فاختئی رنگ کا سوٹ، بیش قیمت انگریزی ٹوپی اور نہایت اعلےٰ بوٹ پہنے اصغر صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ میرے میزبان جو اب تک اصغر کے حالات و اطوار سے بے خبر تھے۔ اُس قلب ماہیت کو دیکھ کر حیران ہو گئے۔ اصغر نے اندر قدم رکھتے

ہی ایک بلند بانگ قہقہہ لگایا اور آداب مجلس کو بالائے طاق رکھ کر وحشیوں کی طرح مجھ سے لپٹ گیا۔ میں بار بار اُس کے کپڑوں کی طرف دیکھ رہا تھا اور سخت متعجب تھا کہ اس طرفہ معجون شخص کا خمیر کس مٹی سے بنا ہے۔ رات ایک ہوٹل کا خدمتگار تھا اور اب ہائیکورٹ کے وکیل سے کم شان کا مالک نہیں۔ میں نے پوچھا "تم نے بہروپ بھرنے کا پیشہ کب سے اختیار کیا ہے۔ کیا بمبئی میں شروع سے یہی کام کر رہے ہو؟ کیسی شرمناک بات ہے کہ یونیورسٹی کا فارغ التحصیل اور تم سا زیرک و خوش فہم شخص یوں ذلیل و خوار ہو۔"

اُس نے کہا "اگر تم نے زجر و توبیخ کی پرانی عادت ترک نہیں کی تو الحمدللہ میں بھی اپنی دیرینہ خصوصیات پر بدستور کاربند ہوں۔ میں تم سے ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ دُنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم سب ایکٹر۔ تم میرے قول کو متانت کے خلاف سمجھ کر ناقابلِ عمل خیال کرتے تھے۔ اب تو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو کہ میں کس انداز سے اس اصول کو اپنی عملی زندگی میں جاری و ساری کر چکا ہوں۔ بھائی سچ جانو میں تم سے زیادہ مسرور و مطمئن ہوں۔ غم دُنیا و فکرِ عاقبت سے آزاد ہوں۔ اچھا کھانا، اچھا پہننا، بمبئی ایسے شہر میں فطرتِ انسانی کا مطالعہ، اور مجھے کیا چاہیے؟ آزادی کا یہ عالم ہے کہ ڈھائی سال کی مدّت میں بیسیوں پاپڑ بیل چکا ہوں۔ مدرّسی اور

اخبار نویسی میں سنے کی۔ سنگر مشین کا ایجنٹ میں رہا۔ سینما اور تھیٹر کی ملازمت کا مزا میں نے چکھا۔ ٹرام میں نوکری میں نے کی۔ غرض کہ جہاں طبیعت ذرا اکتائی اور حواس پر بڑھاپے کے آثار نمودار ہوتے ہیں فوراً اپنی مصروفیت کی نوعیت میں تبدیلی پیدا کر لیتا ہوں اور زندگی پھر تر و تازہ ہو جاتی ہے۔ میری صحت دیکھو، قابلِ رشک ہے یا نہیں۔"

اصغر کی صحت واقعی بے نظیر تھی۔ گوشت اور خون کی کثرت، اس پر اُس کا ورزشی جسم، پہلوان معلوم ہو رہا تھا۔

آج کل یہ کام ہے کہ دن کو یہاں کے ایک رئیس کے خورد سال بچے کو پڑھاتا ہوں۔ معقول مشاہرہ لینے کے علاوہ رہتا بھی اُنہی کے مکان پر ہوں۔ اور شام کو تاج محل ہوٹل۔ پچھلے دنوں جرمنی کی ایک مشہور تجارتی کمپنی کے گماشتے سے میری ملاقات ہو گئی تھی وہ اپنے کاروبار کے سلسلہ میں مجھے جرمنی لے جانے پر رضامند ہے۔ شرائط ابھی طے نہیں ہوئیں۔ ممکن ہے چند ماہ تک جرمنی چلا جاؤں اور یوں یورپ جانے کی پُرانی آرزو بر آئے۔"

مجھے بمبئی سے واپس آئے سال بھر سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے۔ آدم اسمٰعیل اور اصغر کی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ چنانچہ آدم کے خط سے معلوم ہوا کہ اصغر جرمنی روانہ ہو گیا ہے۔

میں ہوں اپنی شکست کی آواز!

وہ آج بھی حسبِ معمول بہت دیر سے اُٹھی۔ سورج کبھی کا طلوع ہو چکا تھا۔ اُس کی نرم اور روپہلی کرنیں مسہری کے پردوں پر رقص کر رہی تھیں۔ نسیم سحری کے سرد و معطّر جھونکے، جو تھکے ہوئے اعصاب کے لئے پیامِ راحت لاتے تھے، دم بدم بڑھنے والی حرارت کے سامنے اپنی لطافت زائل کر چکے تھے۔ اُس نے بائیں طرف کروٹ لیتے ہوئے، نیم وا آنکھوں کے اندر سے، لانبی گھنی پلکوں کو چیرتی ہوئی، ایک بے پروا نگاہ جانبِ مشرق ڈالی جہاں سے دُھوپ کی سُنہری شعاعیں آ آ کر اور مسہری کی جالیوں میں سے چھن چھن کر اُس کے یاسمینی بدن پر پڑنے لگی تھیں۔ روزمرّہ کی طرح آج بھی اُس کی نیند پوری نہ ہوئی تھی کہ شہسوارِ مشرق کے تیروں کی بارش شروع ہو گئی۔ اُس کا جسم دُکھ رہا تھا اور وہ تمام اعضا میں ایک ناقابلِ بیان شکستگی، ایک بعید از فہم اضمحلال محسوس کر رہی تھی۔ موتیا کے باسی ہاروں کو گردن سے اُتار کر اُس نے پرے

پھینک دیا۔ اس کے لئے اپنا وجود بارِ گراں بن رہا تھا۔ روغن اور عطریات میں بسے ہوئے بالوں کی ترتیب جو گذشتہ شام کی ایک پُر از احتیاط مصروفیت کا نتیجہ تھی، اب برہم ہو گئی تھی اور جوڑا کھل جانے سے سیاہ کاکلیں بے ترتیبی سے کندنی پیشانی اور گلگوں رخساروں پر بکھر گئی تھیں۔ اُس کے شکن آلود ریشمیں لباس سے ہلکی ہلکی خوشبو، جو طبقۂ اناث سے خاص ہے، نکل نکل کر فضا کے محدود حلقے میں تعطر کی ایک لہر دوڑا رہی تھی۔ وہ بالوں کی برہمی سے بے خبر، لباسِ حریر کی پریشانی سے بے نیاز، نرم و گداز بستر کی بغاوت سے غافل، آنکھیں کھولے لیٹی ہوئی تھی۔ تمازتِ آفتاب کی تیزی اب اُسے اُٹھنے پر مجبور کر رہی تھی۔ لیکن وہ حرکت کرنا نہ چاہتی تھی، حرکت کرنے سے ڈرتی تھی کہ مبادا اُس کا بند بند ٹوٹ جائے۔ ضعف و انحطاط کسی پُراسرار نافت کی طرح اُس کی رُوح پر حاوی ہو رہا تھا۔

وہ سوچ رہی تھی۔ شب گذشتہ کے واقعات ایک ایک کر کے اُسکے دماغ میں آ رہے تھے۔ تسلسل! تنوّع اور جدّت سے محروم، شگفتگی و ندرت سے مبرّا تسلسل! یہ تھی اُس کی زندگی۔ دُنیا کی نگاہ میں اس کے ایامِ حیات رنگینیوں سے بھرپور اور ارمانوں سے معمور تھے۔ اس کی راتیں افسانہ ہائے عشق سے منوّر اور دن نغمہ ہائے عشرت سے لبریز تھے۔ وہ خود بھی شروع شروع میں ایسا ہی محسوس کرتی تھی۔ نوجوان، انجان، ناتجربہ کار لڑکی زندگی

کے وسیع و بے پایاں سمندر میں غوطہ لگا کر انمول موتی ڈھونڈ نکالنا چاہتی تھی۔ اُس کی سیماب آسا بے قرار طبیعت، اُس کے عنفوانِ شباب کا بے تاب خون، اُسے محض ساکن سطحِ آب کے نظارے پر قانع نہ رکھ سکتے تھے۔ بچپن کا اختتام تھا اور جوانی کے آغاز نے اُس کے کان میں افسوں پھونک دیا تھا۔ کہ اُس کی خواہشات کی تکمیل کے لئے ارض و سما کے خزانے اُس پر نچھاور ہونے کو تیار ہیں۔ وہ محض آرزو کرے گی اور حصولِ آرزو کے لئے بیسیوں جانیں آمادۂ کار ہو جائیں گی۔ اُس کی نظریں مقناطیسی قوت کی حامل نظریں، ہر جاندار و بے جان چیز کو اپنی جانب کھینچ لائیں گی۔ اُس نے قصرِ حیات کی چار دیواری میں اس طرح قدم رکھا گویا وہ نشاط باغ و شالامار کے روح افزا مرغزاروں میں گلگشت کے لئے داخل ہو رہی ہے۔ وہ ہر ہر قدم پر پھولوں کی بارش اور عطر بیز ہواؤں کے سرور کی متوقع تھی۔ متحرک تصاویر کے مضطرب تماشائی کی طرح وہ مستقبل کے واقعات کو ایک ہی نظر میں دیکھ لینا چاہتی تھی۔ جواہرات سے بھری ہوئی تھیلی اُس کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن اُس کی بےچینی اس طولِ عمل کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔ کہ اُس میں سے ایک ایک ہیرا نکال کر اپنے لئے سامانِ انبساط مہیا کرے۔ وہ فوراً سب کو اُلٹ کر اپنے ذوقِ تماشا کو مطمئن کر لینا چاہتی تھی۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ اس عالمِ رنگ و بو میں بہت کم اشیاء سونگھنے چکھنے اور مس کئے جانے کے بعد اپنی دلکشی برقرار رکھ سکتی

ہیں۔ جب کوئی بدبخت انسان دیوتاؤں کو ناراض کر کے غیر معمولی عجلت کے ساتھ زندگی کے بھیدوں کو پا لینے کی کوشش کرتا ہے تو سامعہ و باصرہ نواز لذّات کا ذخیرہ بہت جلد ختم ہو جاتا ہے اور اس کے بقیہ ایّام سرد آہوں اور گرم آنسوؤں کے لئے وقف ہو جاتے ہیں۔ چند سال کے اندر ہی اندر اُس نے سب کچھ دیکھ لیا۔ جسے دیکھنے کے محبوب خواب عرصے سے اُس کے دماغ میں جاگزیں ہو چکے تھے۔ اُس نے وہ تمام ذائقے چکھ لئے جن کے خیال ہی سے اُس کے کام و دہن میں پانی بھر آتا تھا۔ دُنیا وہی تھی، اُس کے ہنگامے وہی تھے، گردشِ لیل و نہار بھی وہی تھی، لیکن اُس کی زندگی بے آب و رنگ ہو چکی تھی۔ اُس کی ہر جدّت فرسودگی اور ہر شیرینی تلخی میں تبدیل ہوتی گئی۔ اُسے آج معلوم ہوا کہ جس محور کے گرد وہ حرکت کر رہی تھی وہ ایک نقطہ سے بھی زیادہ مختصر تھا۔ اس کے حسّیات و جذبات پر قبل از وقت بڑھاپا چھا رہا تھا۔ عشرت کا سمندر جسے اُس نے بحرِ ناپیدا کنار تصوّر کر لیا تھا ایک جلوہ سراب سے زیادہ نہ نکلا۔ اُس کا سفینۂ حیات یاس و الم کی آندھیوں سے گھبرا کر کسی نئے مستقر کی تلاش میں آوارہ و سرگرداں تھا۔ لیکن گھٹا ٹوپ اندھیرے میں امن کی کوئی جگہ نظر نہ آتی تھی جس طرح روشنی کی شدّت آنکھوں کو چندھیا کر ادراکِ نور کو ضائع کر دیتی ہے اسی طرح عشرت کی فراوانی اُس حسِ لطیف کو فنا کر دیتی ہے جس سے

لوگ غم و شادی میں امتیاز کر سکتے ہیں۔ وہ تنگ آ گئی تھی، اُس طرزِ زندگی سے تنگ آ گئی تھی جس میں اُس کے ایّام و لیالی گذر رہے تھے۔ رات کو دیر تک جاگتے اور دن کو دیر تک سوتے رہنے سے اُس کی صحتِ جسمانی کی بنیادیں متزلزل ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ اُس کا دل خون ہو رہا ہو لیکن وہ ہر تماش بین کا متبسم چہرے کے ساتھ خیر مقدم کرنے پر مجبور تھی۔ ہر آنے والے کو اُس کے وقت پر، اُس کی مسرت پر، اُس کی صحت پر مقدم حق حاصل تھا۔ وہ خود نہیں بلکہ دُنیا اس کی مالک تھی۔ ایامِ حیات کے ستائے ہوئے لوگ زندگی کے بکھیڑوں کو موسیقی کے دل نواز سُروں میں کھو دینے اور اپنے ٹھٹھرے ہوئے قلوب کو آتشِ سیّال کے ایک گھونٹ سے گرما دینے کے لئے ہر شام اُس کے ہاں جمع ہوتے تھے۔ لیکن خود اُس کی رُوح برف سے زیادہ سرد اور پتھر سے زیادہ سخت ہوتی جا رہی تھی۔ جس پر نہ آتشِ سیّال کا اثر ممکن تھا اور نہ نغمہ ساز کا۔ وہ چشمہ نشاط جس کے گرد پیاسوں کا ہجوم رہتا تھا اپنے لئے خشک ہو چکا تھا۔ وہ کوہِ نور جس کی شعاعوں سے تاریک سے تاریک دل جگ مگ جگمگ کرنے لگ جاتے تھے۔ اپنے کنجِ سیاہ کو منوّر کرنے سے عاجز تھا۔ لوگ اُس کے رقص و سرود کی تعریف میں لغت کے تمام حسین الفاظ ختم کئے دیتے تھے۔ لیکن وہ ان کلماتِ تحسین کے پردے میں خلوص و صداقت کی بجائے حرص و ہوا اور ہوس و گناہ

کے خوفناک نقوش دیکھتی تھی۔ ہر چیز اپنا مصنوعی لبادہ اُتار کر اصلی صورت میں نمودار ہو رہی تھی۔ اور اُس کی فریب خوردہ توقعات مجروح ہو ہو کر اُس کے قلب و جگر پر نمک پاشی کر رہی تھیں۔

بس یہی تھی عشرت کی زندگی! چشمکِ برق سے زیادہ بے حقیقت اور تبسمِ شرار سے زیادہ ناپائدار۔ وہ اِس معصومیت کا گلا گھونٹنے والی فضا سے نکل کر بھاگنا چاہتی تھی لیکن منشیات کے استعمال کی طرح کثرتِ عشرت نے اُس کے اعصاب میں بے حسی پیدا کر کے اُسے مردہ و نیم جاں بنا رکھا تھا۔ سورج آہستہ آہستہ بلند ہوتا گیا اور وہ خیالات کی بھول بھلیاں میں گرفتار، یوں ہی بے حس و حرکت، پڑی رہی۔ چند لمحوں کی ریاضتِ ذہنی اور کشمکشِ دماغی سے وہ تزکیۂ نفس کے کئی مراحل طے کر گئی تھی۔ ایک اضطراری جنبش کے ساتھ وہ پلنگ سے علیحدہ ہو گئی۔ اِس عزمِ صمیم کے ساتھ علیحدہ ہو گئی کہ اب کبھی اپنے جسم کو اِس داغ ہائے عصیاں سے ملوّث بستر کی آغوش میں نہ دیگی۔ زینے پر سے اُترتی ہوئی وہ سیدھی گول کمرے میں آئی اور بے اختیار ہو کر اُس نے اپنے آپ کو ایک آرام کرسی پر گرا دیا۔ کمرہ بہترین سامانِ آرائش سے مزیّن تھا۔ ریشمیں و زرنگار پردے مخملیں صوفے جن کا نظارہ ہی ہارے تھکے مزدور کے لئے خواب آفریں ثابت ہو سکتا تھا، ایرانی قالین جن کے اندر پاؤں دھنسے جاتے تھے، کشمیر کی منقش چادریں

جنہوں نے جا بجا دیواروں کو ڈھانک کر کمرے کو تصویر خانہ بنا رکھا تھا، تازہ پھولوں کی آوارہ خوشبو! لیکن یہ تمام چیزیں اُس کے دماغ میں کوئی خوشگوار اثر پیدا نہ کر سکیں عیش و تنعم اپنی جاذبیت کھو چکے تھے اظہارِ تموّل میں اب اس کے لئے قطعاً کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ امارت، دولت، شان شوکت، سب کچھ اُس کے لئے مردہ ہو چکا تھا۔ اُس نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ اس پُر تکلف سازوسامان پر ڈالی اور دل ہی دل میں کہا۔

"چھوڑ دوں گی، مَیں تمام لوازمِ عشرت کو چھوڑ دوں گی، ہمیشہ کے لئے چھوڑ دونگی۔ کسی نامعلوم سرزمین کو چلی جاؤنگی جہاں نہ سازندوں کی آوازیں پہنچ سکیں اور نہ ہوسناک مدّاحوں کی تعریفیں رسائی پا سکیں"

خادمہ اپنی مالکہ کی آمد کی اطلاع پا کر دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ ناشتہ تیار ہو چکا ہے لیکن اُس نے ہاتھ کے زوردار اشارے سے اُسے واپس بھیج دیا۔ اُس کی حسّیاتِ نازک پیہم غور و فکر سے اُس انتہائی نقطے پر پہنچ گئی تھیں جہاں ذرا سی ٹھیس سے کانچ کے پیالے کی طرح اُن کے پاش پاش ہو جانے کا خطرہ تھا۔ وہ اس خطرناک لیکن محبوب تخلیہ میں خفیف سے خفیف مداخلت کو برداشت نہ کر سکتی تھی۔ وہ کرسی پر لیٹی تھی لیکن دماغ خیالات کے اُسی تانے بانے میں مصروف تھا۔ دیواروں پر مختلف عکسی تصاویر آویزاں تھیں جن پر دفع الوقتی کے لئے

اُس کی پژمردہ نگاہیں آہستہ آہستہ دوڑ رہی تھیں۔ ایک تصویر پر پہنچ کر اُس کی نظریں رُک گئیں۔ اُس کی آنکھوں میں رونق سی آ گئی۔ منتشر خیالات کا شیرازہ بندھنے لگا۔ وہ سنبھل کر اُٹھ بیٹھی۔ اُس کی تبدیل شدہ رنگت سے معلوم ہوتا تھا کہ حسیاتِ خفتہ میں ہلچل مچ گئی ہے۔ وہ پانچ منٹ تک بغور اس تصویر کو دیکھتی رہی۔ پھر دفعتہً ایک سرد آہ کے ساتھ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ عہدِ ماضی کے بھولے بسرے خواب مجسّم صورت اختیار کر کے اُس کے حافظے میں آموجود ہوئے تھے۔ اُن کی بے پناہ یورش سے اُس کے دل کے تار تھرتھرانے لگے! افعی کے سحر کے مسحور کی طرح وہ اس تصویر کے ساتھ آنکھیں ملانے پر مجبور تھی۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے چہرے سے ہاتھ اُٹھائے۔ تصویر حد درجہ تلطف آمیز و ترحم انگیز نظروں سے اُسے گھور رہی تھی۔ لیکن بدقسمت عورت گناہ کے دُھندلے شیشے میں سے اُسے دیکھ دیکھ کر خود بخود کانپ رہی تھی۔ اُسے ایسا معلوم ہوا گویا اُس کی معصیت آلود ہستی اس تصویر کی نفاست پاکیزگی اور دلربائی کے سامنے قطرۂ شبنم کی طرح پگھلتی جا رہی ہے وہ یکایک کھڑی ہو گئی، لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ آگے بڑھی اور اس تصویر کو چوم لیا۔ وفورِ محبت سے اُس نے کئی بار چوما اور نڈھال ہو کر فرش پر گر گئی۔ ان بوسوں سے اُس کے تلاطمِ جذبات میں طغیانی کی نئی لہر

پیدا کردی اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ غم کے جس طوفان کو وہ اب تک روکے ہوئے تھی۔ آخر اُس نے آنکھوں کی راہ بہنا شروع کیا جوشِ گریہ سے متاثر ہو کر، مُنہ اونچا کرکے، دونوں ہاتھ تصویر کی جانب پھیلا کر، وہ کہنے لگی۔ "للہ مجھے معاف کردو، میری خطاؤں پر خطِ عفو کھینچ دو۔ اے مجھ سے خفا ہو کر جانے والے آ دیکھ کہ میرا دل تیری یاد میں کتنا بے قرار ہے، میرا جگر تیری محبت میں کیونکر خون ہوا جا رہا ہے میری راتیں سوگوار ہیں، میرے دن بیزار ہیں، تُو نے ایک دفعہ جا کر پھر میری خبر نہ لی، سچ ہے مَیں نادان تھی، تیری محبّت کی قدر نہ پہچان سکی۔ لیکن تُو تو سچّے دل سے مجھے چاہتا تھا۔ تیری اُلفت کیوں نفرت میں تبدیل ہو گئی؟"

فراموش شدہ ماضی کے دھندلکے میں سے پُرانی صورتیں نئے نئے لباسوں میں نمودار ہونے لگیں۔ اُسے یاد آگیا کہ ابھی وہ بچّی ہی تھی کہ اس گھر کے ہنگاموں، یہاں کی رونقوں اور دلآویزیوں کو کس قدر للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھا کرتی تھی۔ مجالسِ رقص میں جب اُس کی ماں زربفت کی پشواز پہن کر تماشائیوں کی آنکھوں کو خیرہ کرکے اپنے مدہوش کُن گانے سے اُن کے دماغوں پر جادو سا کر دیتی تھی تو وہ دل ہی دل میں آرزو کیا کرتی کہ خدایا مجھے ایک رات ہی میں میری اماں کے برابر کر دے تاکہ میں بھی اچھے اچھے کپڑے پہن کر ان لوگوں کے درمیان بیٹھ سکوں۔ پھر وہ آہستہ

آہستہ آہستہ جوان ہوتی گئی۔ اُس گھر میں آنے والوں کی نظریں اس پر پڑنے لگیں۔ اب اُسے تعلیم کے لئے اُستادوں کے سپرد کر دیا گیا۔ اس پر پابندیاں عائد ہونے لگیں۔ اُسے آزادانہ ہر شخص کے ساتھ ملنے سے منع کیا گیا۔ اُس کی نشست و برخاست میں سلیقہ پیدا کرنے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔ وہ قد و قامت میں، ڈیل ڈول میں بڑھتی چلی گئی۔ اس کی آواز میں لوچ، آنکھ میں جادو اور لب پر مسیحائی کے آثار نمودار ہونا شروع ہو گئے۔ اسرارِ شباب ایک ایک کر کے منکشف ہونے لگے۔ اُس کی رگوں میں گرم گرم خون تیزی کے ساتھ حرکت کرنے لگا۔ بعض دفعہ گاتے گاتے اس پر بیہوشی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ وہ جوان تھی اور جوانی کی بے پناہ حدت کے باوجود کبھی کبھی اپنے آپ میں سخت کسل مندی محسوس کرتی تھی وہ ان عجیب و غریب جذبات کا تجزیہ کرنے سے قاصر تھی۔ وہ سر بفلک، شاندار، طلسمی محل کی دہلیز پر کھڑی تھی جہاں صرف ایک قدم اُٹھانے کی دیر تھی کہ زندگی کے سربستہ رموز خود بخود بے نقاب ہو سکتے تھے۔

اب وہ اپنے عروج پر تھی۔ حسن و شباب کی ملکہ، رعنائی و جمال کی مجسمہ، موسیقی کی دیوی، وہ سبھی کچھ تھی۔ دُنیا اُس کی پرستار تھی۔ لوگ دُور دُور سے آ کر اُس کے حضور ہدایائے نیاز پیش کرتے تھے۔ اُسے سب چاہتے تھے لیکن وہ سنگ دل حسینہ کسی کی نہ تھی۔ سیم و زر کی طلائی دیواروں کے اندر

محصور، وہ کیوپڈ کے تیروں کی زد سے بالکل مامون و محفوظ تھی۔ مالِ دولت کی فراوانی نے اُس کے دل کو محبت کی حسِ لطیف سے معرّا کر دیا تھا۔ شوقِ خود نمائی و جذبۂ خود پسندی کی شدّت اُسے دوسروں کے احساسات سمجھنے سے مانع آتی تھی۔ اظہارِ جمال و اظہارِ کمال کی خواہش میں سرشار وہ خود بینی و خود فراموشی کے مخلوط جو تباروں میں بہتی چلی جا رہی تھی۔ اُسے شب و روز لوگوں کے جذبات سے کھیلنے کے سوا کوئی کام ہی نہ تھا۔ کبھی اُن کے ارمان بھرے دلوں کو ایک نگاہِ التفات سے فریبِ اُلفت میں گرفتار کر دیتی کبھی انہیں شوقِ وصال و کاہشِ فراق کی اُلجھنوں میں مبتلا کر کے اُن کی بڑھتی ہوئی آرزوؤں کا جائزہ لیتی رہتی اور پھر یکا یک چشمِ سحر کار کی ایک جنبشِ احتراز سے تمام حسین و جمیل امیدوں کو ملیا میٹ کر ڈالتی تھی چاہنے والوں کی ہجومِ شوق سے لبریز اور شعلۂ عشق سے فروزاں نگاہیں کمزور تیروں کی طرح جو قلعہ کی سنگین دیوار سے ٹکرا کر واپس آ جائیں اُس کے جسم مرمریں کو چھو چھو کر لوٹ آتی تھیں۔ اُس کے تہ در تہ لپٹے ہوئے پُراسرار دل تک رسائی ناممکن تھی۔

ایک شام جب حسبِ معمول محفلِ غنا منعقد تھی۔ اور وہ تماشائیوں کی حریص نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی بیک وقت جنّتِ نگاہ و فردوسِ گوش کا سامان مہیّا کر رہی تھی دو شخص اُس کے ہاں وارد ہوئے۔ ایک ذرا پختہ عمر اور گندمی رنگ کا دوسرا بالکل نوجوان، باغِ حیات کا نو شگفتہ پھول اور حد درجہ حسین و رعنا۔

اُس قتالہ کی مردم شناس آنکھوں نے ایک ہی نظر میں بھانپ لیا کہ دوسرا نوجوان جو شرماتی ہوئی نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھ دیکھ کے، گھبرا گھبرا کے قدم اُٹھا رہا تھا۔ جو مجمع کو کنکھیوں سے دیکھ دیکھ کر سہما جاتا تھا۔ اپنی زندگی میں شاید پہلی مرتبہ ایسی جگہ داخل ہو رہا ہے۔ اُس نے سرو قد کھڑے ہو کر تعظیم دی اور رسمی مزاج پرسی کے بعد پان الائچی سے تواضع کی پھر سنبھل کر، کاندھے سے سرک جانے والے دوپٹے کو بائیں ہاتھ سے سمیٹ کر، اپنی ترنم آگیں آواز کو دل ہی دل میں تول کر اور غزالیں آنکھوں کو پھرا پھرا کر اُس نے غالب کی مرصع غزل شروع کی۔

"یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا"

خوبصورت نوجوان چند لمحے مبہوت و خاموش بیٹھا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا ایک انسان کو اپنے گلے پر اس قدر اختیار ہو سکتا ہے۔ انسانی آواز اس درجہ ہوش ربا اور فرحت افزا ہو سکتی ہے۔ وہ حیران تھا کہ جس ہستی کے کمالِ فن کا وہ مشاہدہ کر رہا ہے وہ عالمِ غیر مرئی سے تعلق رکھتی ہے یا خود اُس کی مانند گوشت پوست سے مرکب ایک فانی پیکر ہے۔ وہ دیکھ دیکھ کر حیران ہوا جاتا تھا اور اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جو پیکرِ صد بہار بہ ہزار ناز و رعنائی اس کے روبرو جلوہ ریز تھا۔ نغمہ پراں میں تحلیل ہوا جاتا ہے یا نوائے ازل نے متشکل ہو کر اس رشکِ آفتاب کی صورت اختیار کر لی

ہے۔ موسیقی کے زیر و بم کے ساتھ ساتھ اُس کی رُوح وجد میں آ رہی تھی۔ وہ گانے والی ساحرہ کے انتہائے کمال کی جی کھول کر داد دینا چاہتا تھا۔ لیکن ماحول کی اجنبیت، حاضرین کی عقابی نگاہیں اور بڑی عمر والے ہمراہی کی موجودگی اس کی زبان کو حرکت کرنے سے روکتی تھیں۔ جب وہ اس شعر پر پہنچی ؎

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

تو وہ بیتاب ہو گیا۔ سب شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر، اور مجسم عجز و فتادگی بن کر، اُس نے دوبارہ "سبحان اللہ، سبحان اللہ" کہا۔ حسین مغنیّہ نے نشۂ کامیابی سے مخمور نگاہیں اوپر اُٹھائیں اور سر کو خفیف سا خم دے کر گویا زبانِ حال سے اس قدر دانی کا شکریہ ادا کیا اور ایک دلپذیر تبسّم کے ساتھ وہ شعر دوبارہ گا دیا۔

ایک ہفتے کے بعد وہ نوجوان پھر اُس کے مکان پر آیا۔ لیکن تنہا، شام کو نہیں بلکہ سہ پہر کے وقت۔ وہ تخلیہ میں اس سے باتیں کرنے کا خواہاں تھا۔ اُس نے نہایت ادب و تکریم کے ساتھ اُسے لے جا کر مسند پر بٹھا دیا۔ جذباتِ گوناگوں کی آمیزش نے دونوں کے ہونٹوں پر مہرِ خاموشی لگا دی۔ بہرحال وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی کہ اُس کا تیر خالی نہیں گیا۔ نوجوان

کے دل میں دفتر کے دفتر بھرے ہوئے تھے لیکن اُس کی قوتِ گویائی جواب دے بیٹھی تھی۔ وہ بات کرنا چاہتا تھا لیکن الفاظ زبان تک پہنچنے سے قبل ہی موت کے سے سکوت میں تبدیل ہو جاتے تھے۔ آخر اُس نے دل کڑا کر کے کہا۔

"آپ نے مجھے پہچان لیا؟"

"آپ کو ایک مرتبہ دیکھ کر بھول جانا ممکن نہیں۔"

وہ جھینپ سا گیا۔ "لیکن آپ کے یہاں تو بہت بڑے بڑے آدمی آتے ہیں ہم کس قطار و شمار میں ہیں۔"

اُس نے جواب دیا۔ "عجز و انکسار اُسی کو زیبا ہے جو اس کا اہل ہو۔ آپ تو ہر تعریف سے مستغنی اور ہر ستائش سے بے نیاز ہیں۔ شمع رات بھر جلتی ہے لیکن صرف چند گز زمین کو روشن کر سکتی ہے اور بجلی ایک لمحے کے لئے چمکتی ہے تو زمان و مکان کو پُر نور کر جاتی ہے۔"

وہ حیران تھا کہ کتنی حاضر جواب اور کیسے ذوقِ سلیم کی مالکہ سے واسطہ پڑا ہے۔ اُس کا اب تک یہی خیال تھا کہ اس طبقے کی عورتیں نفسانیت سے لبریز اور مذاقِ صحیح سے کلیتہً عاری ہوتی ہیں۔ لیکن اب اس کا نظریہ بُری طرح باطل ہو رہا تھا۔ اتنی دیر میں ملازم برف میں لگا ہوا لیمونیڈ لے آیا۔ اُس نے اس تکلّف، بے جا پر چند رسمی جملے کہہ کر گلاس تھام لیا۔ آپ تو نے

اس کے نظامِ عصبی میں سکون و سرور کی ایک لہر دوڑا دی۔ اب اس کی زبان رواں تھی۔ اور خیالات اُبلتے ہوئے چشمے کی طرح جاری۔ غرض ایک گھنٹہ بہت لطف کی صحبت رہی اور آئندہ ملاقات کے وعدے وعید کر کے وہ بادلِ ناخواستہ وہاں سے رخصت ہوا۔

نوجوان چلا گیا تو وہ سر بگریباں ہو کر بیٹھ گئی۔ آج اُس کے مکان کی زمین ایک ایسے شخص کے قدموں سے مس ہوئی تھی جو ان تمام لوگوں سے مختلف تھا جو اُس کے ہاں آنے کے عادی تھے۔ اُس کے چہرے کی شگفتگی و تازگی شبنم سے دُھلے ہوئے گلاب کی مانند نظر افروز تھی۔ اُس کا بھولپن اور سیدھا سادا طرزِ کلام ظاہر کرتے تھے کہ ابھی اسے ناجائز اور پُر تصنّع محبت کے کوچے کی ہوا نہیں لگی۔ آہ وہ اس کے روبرو بیٹھی کتنی حقیر، کتنی بے بضاعت اور کیسی بے حقیقت معلوم ہو رہی تھی۔ اُس کے غازے سے اٹا ہوا چہرہ اس کی سرمے سے تیز کی ہوئی چشم ہائے فسوں ساز، اُس کی مصنوعی سُرخی سے جلا پاتے ہوئے رخسار اُس نوجوان کے رُخِ روشن کے سامنے ماند ہوئے جارہے تھے۔ آج اُسے محسوس ہوا کہ اُس کی ملاوٹ اور بناوٹ کی باتیں اُس کی دل لبھانے کی گھاتیں جن کی مدد سے وہ ایک جہان کو تہ و بالا کر چکی تھی اس نووارد کی ایک بے پروا نگاہ کے سامنے بے کار تھیں۔ وہ اب تک اپنے تئیں آفتاب سمجھے ہوئے تھی۔ لیکن جب آفتاب طلوع ہوا تو ذرہ بھی نہ رہ سکی کیونکہ پڑا

جس کے بے پناہ تیروں کی زد سے کوئی ذی روح محفوظ نہ تھا، اب اس کا ترکش خالی تھا اور وہ خود نوعمر صیاد کے تیر کا گھائل ہے ـــــ لیکن وہ اس کے مکان پر کیوں آیا تھا؟ شروع شروع میں اُس نے سے آنکھ نہ ملاتا تھا۔ فرش پر نظریں جمائے، پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے، وہ بار بار اُس کے گانے کی تعریف کرتا تھا۔ بات ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اُس کے مُنہ سے نکلتی تھی کوئی عامیانہ فقرہ، کوئی سوقیانہ اصطلاح، کوئی نازیبا لفظ اُس کی زبان پر نہ آتا تھا۔ یہ اجنبیت زیادہ دیر طاری نہ رہ سکی، پھر وہ قدرے بے تکلف ہو گیا۔ لیکن اُس کی تہذیب و متانت اب پہلے سے بڑھ گئی۔ کیا وہ اس سے محبّت کرتا تھا؟ آہ کتنا لطیف خیال اُس کے دماغ میں آیا۔ کاش وہ اُس کے قابل ہوتی۔ وہ اس سرور انگیز تصوّر سے تھوڑی دیر کے لئے مدہوش سی ہو گئی۔ لیکن نہیں نہیں، وہ اُسے اپنے ساتھ محبّت نہ کرنے دیگی۔ وہ گلشن حیات کی اس نو دمیدہ کلی کو نذر صرصر ہونے سے بچا لے گی۔ وہ جو کسی عصمت شعار نازنین کا سرتاج بننے کے لئے پیدا ہوا تھا۔ ہرگز بازاری محبّت کے چنگل میں نہ پھنسنے پائیگا۔ وہ اپنے جذبات پرستش کو، جو اُس کے سینے میں مچل رہے تھے چھپا لے گی۔ اپنی حسیّات نازک کو جو اُس کی ذات سے وابستہ تھیں ہرگز ظاہر نہ ہونے دیگی۔ وہ اپنے شباب کی مرغوب آرزوؤں کو جو ہر عورت کے ساتھ خواہ وہ گناہ کی عمیق ترین گہرائیوں

میں غرق ہو جائے متعلق رہتی ہیں اور جن میں وہ ایک خیالی محبوب کی پذیرائی کے خواب دیکھا کرتی ہے، اُس سے پوشیدہ رکھے گی۔ آہ وہ اپنے دل کا خون کریگی، اپنی زندگی کو مسل ڈالے گی، اپنی نسوانی امیدوں کو جن میں وہ کبھی اپنے افقِ حیات پر ایک نادیدہ لیکن پُر خلوص محبوب کو طلوع ہوتے دیکھا کرتی تھی فنا کر ڈالے گی۔ یہی نہیں، بلکہ وہ اُس کی محبت کو، اگر اُس نے پیش کرنے کی جُرأت بھی کی، تو ٹھکرا دے گی، اُس کی طرف سے منہ موڑ لے گی۔ وہ اپنی جان پر کھیل جائیگی مگر اُسے اپنے قریب نہ آنے دیگی۔ اُس کو محبّت کی ناپاک راہوں سے آشنا نہ ہونے دیگی۔ اس کی شفّاف و بے داغ جوانی کو ہوس کی شعلہ آشامیوں سے پرے ہی پرے رکھے گی۔

یہ خیال کرتے کرتے مایوسی و نامرادی کہر کی طرح اس کی رُوح پر چھانے لگی اور اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلک پیدا ہو گئی۔

"آہ زینت! تم مجسّم زینت ہو، زینتِ محفل ہی نہیں زینتِ گیتی ہو۔ تم جو ایک شریف گھرانے کی ملکہ اور ایک چاہنے والے شوہر کی آنکھ کا نُور بننے کے لئے پیدا ہوئی تھیں آج کیسی زندگی بسر کر رہی ہو؟"

وہ نوجوان ایک ماہ بعد اُس کے مکان پر خلوت میں بیٹھا نہایت جوش سے گفتگو کر رہا تھا۔

ذرا اپنی شکل کی طرف دیکھو۔ اپنے نام اور پھر اپنے کام کو دیکھو۔ میں

حیران ہوں کہ تمہارا مذاقِ سلیم کیوں اس طرزِ زندگی کے خلاف بغاوت نہیں کرتا۔ تمہاری حسِ لطیف، کیوں اس کثیف و متعفن ماحول کی سلاسل کو توڑ پھوڑ کر نہیں رکھ دیتی۔ تم حسین ہو، لاریب ایک بے بہا عطیۂ ایزدی کی مالک ہو۔ تم خوش گلو ہو، بلاشبہ قدرت کی ایک بیش قیمت نعمت سے مالامال ہو لیکن فطرت کی اس فیاضی سے جو اُس نے تمہارے ساتھ روا رکھی ہے۔ یہ لازم تو نہیں آتا کہ ان انمول موتیوں کو نااہلوں کے سامنے مٹی میں رول ڈالو۔ یاد رکھو ہر چیز اسی وقت تک قیمتی ہے جب تک عسیر الحصول ہے۔ جوں ہی کسی شے کی بازار میں قیمت پڑی اُس کا کمال فنا ہو جائیگا اور اُس کی دلفریبی خاک میں مل جائیگی۔ جتنی عام ہوتی جاؤ گی اتنی ہی اپنی قدر و وقعت کو زائل کرتی جاؤ گی۔ میں تو اس تصوّر ہی سے کانپ اُٹھتا ہوں کہ ہر بازاری آدمی، ہر آوارہ منش نوجوان، اور ہر اوباش مزاج شہدا چاندی کی چند ٹکلیاں جیب میں ڈال کر تمہارے کوٹھے پر بےباکی سے چڑھ سکتا ہے۔ کیا تم نے کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی سوچا کہ یہ راہ جس پر تم بےتکلفی سے گامزن ہو، کہاں جا کر ختم ہوتی ہے؟ صحیح ہے کہ جوانی ایک ہی مرتبہ آتی ہے لیکن اس کا تقاضا تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ اس نایاب جوہر کو بےحد حزم و احتیاط سے سنبھال کر رکھا جاتا۔ مگر حیرت ہے کہ تم اس محدود خزانے کو کس بےدردی سے لٹا رہی ہو۔ اپنے گرد و پیش ایک نگاہ ڈالو اور دیکھو کہ کیا نظر آتا ہے۔

ہوس کا انجام بڑا دردناک، گناہ کا ردِّ عمل بے حد عبرتناک اور قانونِ فطرت کی خلاف ورزی کا نتیجہ سخت خطرناک ہوتا ہے۔ موسمِ گل بہت مختصر اور عہدِ شباب چشم زدن میں ختم ہو جانے والی چیز ہے۔ خزاں کی پائمالی اور بڑھاپے کی بیدردی کا کوئی مداوا نہیں۔ دانا وہی ہے جو بہار میں خزاں اور جوانی میں پیری کا سامان مہیّا کرے۔ سنتی ہو میں کیا کہہ رہا ہوں؟ میں اپنی محبّت پیش کرتا ہوں۔ جان و دل تم پر نثار کرتا ہوں، اپنی عزّت و آبرو تمہارے حوالے کرتا ہوں، اپنا سرمایۂ حیات تم پر قربان کرتا ہوں، للّٰہ ان کو قبول کرو اور میری بن جاؤ۔

"بولو! خدا کے لئے بولو! میری عزیز ترین خواہش کا جواب دو۔ میں پھر کہتا ہوں کہ اس طرزِ زندگی سے کنارہ کر لو۔ اس معصیت آلود روش کو چھوڑ دو اور میری محبّت و خلوص سے لبریز آغوش میں آ جاؤ۔"

وہ سُن رہی تھی۔ الفاظ کانوں کی راہ سے دل میں اُترے جا رہے تھے۔ الفاظ نہیں بجلی کے تار تھے جنہوں نے اس کی رگوں میں قیامت کا ارتعاش اور روح میں بے پناہ آگ لگا دی تھی۔ وہ اس نوجوان سے آنکھیں نہیں ملا سکتی تھی کسی نامعلوم طاقت نے اُس کا حوصلہ سلب اور اُس کی ہمّت ضبط کر لی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ کیا کرے۔ اُس کے مقدس ارادے اور قابلِ تحسین عزائم جو اُس نے نوجوان کی آمد سے قبل باندھ رکھے تھے اب سیلاب خوردہ دیوار کی طرح آہستہ آہستہ بیٹھ رہے تھے۔ وہ منجدھار میں کھڑی ہوئی اپنے

ہلکے پھلکے لباس کو آگ کی لپیٹ سے محفوظ رکھنے کی بے سود کوشش کر رہی تھی ۔ اُس کا محبوب جس کی ایک نگاہ اُسے عشق کی حقیقی چاشنی سے آشنا کر گئی تھی۔ اب اُس کے روبرو بیٹھا بہ صد عجز و انکسار اپنی محبت پیش کر رہا تھا۔ آہ حُسن خود عشق کے قدموں پر سر رکھ کر التجائے التفات میں مصروف تھا۔ وہ چُپ سادھے رہی۔ وہ اس درد و محبّت میں ڈُوبی ہوئی تقریر کا جواب دینے سے عاجز تھی۔ وُہ مرصّع الفاظ، پُر جوش اندازِ بیان اور بلا کی فصاحتِ کلام کہاں سے لاتی۔ نوجوان نے اس سکوت سے گھبرا کر پھر کہا۔ "مَیں تمہارے جواب کا منتظر ہوں" مَیں آپ کو کیا جواب دُوں؟ مجھے یقین نہیں آتا کہ آپ مجھ سے ہمکلام ہو رہے ہیں۔ معاف فرمائیے، ایسے پاکیزہ خیالات کی مخاطب مجھے قرار دینے میں آپ نے دور اندیشی سے کام نہیں لیا۔ آپ ایک ذی عزّت خاندان کے چشم و چراغ ہیں آپ کی تعلیم و تربیت اور دُنیاوی وجاہت اس بات کی متقاضی ہے کہ آپ اپنے پائے کی لڑکی تلاش کریں۔ ہم لوگ آبرو باختہ ہیں، عصمت فروش ہیں، ننگِ انسانیت ہیں۔ ہمارا آپ کا جوڑ ناممکن ہے۔ دُنیا ہمیں جس نگاہ سے دیکھتی ہے آپ اُس سے واقف ہیں یقیناً مخمل میں ٹاٹ کا پیوند نہیں لگ سکتا۔ اس وقت ایک خاص جذبہ طاری ہے جس کے ماتحت آپ بے تکلفی سے سب کچھ کہہ گئے ہیں، لیکن جوں ہی آپ اس چار دیواری سے نکل کر اپنے گھر کی مصفّا فضا میں پہنچے آپ اپنے طرزِ عمل پر

افسوس کریں گے کہ کیوں ایسے گراں قدر خیالات ایک ادنےٰ درجے کی عورت پر ضائع گئے جو کسی لحاظ سے بھی آپ کے لائق نہ تھی۔ میری التجا ہے کہ آپ اپنے معزز والدین کی شاندار امیدوں کو جو وہ آپ سے لگائے بیٹھے ہیں۔ پورا کرنے کا سامان پیدا کیجئے۔ آپ ابھی نوعمر ہیں۔ آپ نے زندگی کا دیکھا ہی کیا ہے۔ چند روز میں جب آپ کو دُنیا کے نشیب و فراز کا کچھ تجربہ ہو گیا تو آپ آج کی گفتگو کو یاد کر کے اپنی سادہ لوحی پر ہنسا کریں گے۔ مجھے آپ سے شرفِ نیاز حاصل ہے اور میرے فخر کرنے کو اِک یہی بات کافی ہے کہ میرا غریب خانہ آپ ایسے یکتائے روزگار سے کسبِ انوار کر چکا ہے۔"

نوجوان کی امیدوں پر اوس سی پڑ گئی۔ جواب بالکل خلافِ توقع تھا اس کی خوبصورت پیشانی شکن آلود ہو گئی اور سرخ و صبیح رخساروں پر زردی سی چھانے لگی۔ وہ جو اس وقت تک عیش و تنعم میں پل کر جوان ہوا تھا، جس نے آج تک نہ کبھی دستِ سوال دراز کیا اور نہ کبھی حرفِ انکار سے اپنی خودداری کو پامال دیکھا تھا۔ اب طوائف کے ہاتھوں متاعِ صبر و قرار کو لٹا کر اپنی غیرت و عزتِ نفس کا مضحکہ اُڑا رہا تھا۔ اس بھولے شہزادے کو کیا معلوم تھا۔ "کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا۔" اُس کے شاعرانہ دل و دماغ سے رنگین شعاعیں نکل نکل کر اُس کی محبوبہ پر پڑ رہی تھیں اور وہ اپنی شعریت سے لبریز فطرت کے اس انعکاس کو اس عورت کا طبعی حسنِ مذاق

تصوّر کرتا تھا۔ اب کہ مایوس کن جواب نے اُس کی آرزوؤں کے قصرِ رفیع کو پاش پاش کر دیا تو وہ سمجھا کہ اس کی مخاطب عمداً ان آلائشوں سے نکلنا نہیں چاہتی اور بظاہر مخمل میں ٹاٹ کے پیوند کا بہانہ بنا کر اُسے ٹال دینا چاہتی ہے۔ وہ خیالات کے کوہِ آتش فشاں کو جو اُس کے دماغ میں پھٹ پڑا تھا، دبا کر بھاگ جانا چاہتا تھا۔ مگر عشق کی بے کسی نے اُسے مجبور کیا کہ رخصت ہونے سے قبل آخری دو باتیں تو کرتا جائے۔ اُس نے کہا۔ "میں سمجھتا تھا کہ تم اپنے پہلو میں ایک دردمند دل رکھتی ہو لیکن آج مجھے اپنے خیالِ خام کی حقیقت معلوم ہو گئی۔ تم ابھی جوان ہو اور حسن و شباب کے نشے میں مآلِ زندگی سے بے خبر۔ شہرت نے تمہاری آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے اور تم کھوٹے کھرے کی پہچان سے محروم ہو۔ لیکن یاد رکھو وہ دن دُور نہیں جب شمع گل ہو جائے گی اور پروانے ایک ایک کر کے کنارہ کش ہو جائیں گے۔ جب پھول مرجھا جائے گا اور بھونرے خشک پتیوں کو چھوڑ کر اُڑ جائیں گے۔ اُس وقت تمہیں میرے الفاظ کی صداقت اور میری محبت کی قدر کا احساس ہو گا۔ تم اس بالاخانے میں بیٹھ کر ایک ایک حرف سے جو تمہاری زبان سے نکلتا ہے، ایک ایک حرکت سے جو تمہارے جسم سے ظاہر ہوتی ہے محبت کے جذبۂ پاک کی توہین کرتی ہو۔ لیکن سمجھ رکھو کہ اس محبت کا جو چوبیس گھنٹے تمہارے ہاں اپنی ذلّت و رسوائی کا دلخراش

منظر دیکھتی ہے انتقام بڑا خطرناک ہوگا۔ تمہیں وہ شام یاد ہے جب تم یہ غزل گا رہی تھیں؟

ہم کو اُن سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے؟

مَیں نے تو اسی وقت کہا تھا کہ اگر وفا و مودّت کی پرکھ رکھتی ہو تو اُس دل کو دیکھو جو روزِ ازل سے جذبۂ وفا سے سرشار ہو چکا ہے لیکن آہ نہ تمہیں وفا سے غرض ہے اور نہ خلوص و محبت سے سروکار۔

زینت، سنتی ہو مَیں کیا کہتا ہوں؟ مَیں کل شام دہلی چلا جاؤں گا۔ میرا پتہ تو تمہیں معلوم ہی ہے، اگر جی چاہے تو کبھی کبھی یاد کر لیا کرنا۔"

فرش پر لیٹے لیٹے، ایک ایک کرکے، یہ سب باتیں حیرت ناک ترتیب کے ساتھ اُس کے دماغ میں نمودار ہوتی رہیں۔ اُس نے اپنے قلبِ مجروح کے زخموں کو اس نوجوان سے اوجھل رکھ کر اپنے اُوپر کذب و افترا کا الزام لینا منظور کر لیا۔ اُس نے اپنے اظہارِ شوق کو تصنع اور اپنی الفت کو منافقت سے تعبیر کرنا پسند کر لیا، لیکن یہ گوارا نہ کیا کہ وہ حسین و بے عیب شہزادہ اُسے چھُو کر اپنی پاکیزہ جوانی کو داغدار کر جائے۔ لیکن اب کہ ——— اب کہ وہ زندگی کے ہاؤ ہُو سے بیزار ہو کر گوشۂ عافیت

کی متلاشی تھی، اب کہ وہ محبت کی گرم جوشی کے نیچے چھپی ہوئی طمع و خود غرضی کی سرد مہری دیکھ چکی تھی، اب کہ وہ اپنی خلوت و جلوت کے رنگین مشاغل کی بے ثباتی و ناپائداری کو چشم دُور بیں سے بھانپ چکی تھی کہ اُس کے پر لگ جائیں اور وہ اڑ کر اپنے محبوب کے پاس پہنچ جائے۔ کیا وہ اس طرح اپنی ناقدری تو نہ کرائے گی؟ بن بلائے اُس کے ہاں چلے جانے میں اس کی سُبکی تو نہ ہوگی؟ کیا وہ یہ نہ کہے گا کہ جب دُنیا کی نظروں سے گر گئی، جب بوالہوسوں کی ہوس سیراب ہوگئی تو رسوائی کو ٹھکانے لگانے کے لئے اُس کے ہاں آگئی؟

وہ سب طعنے سُن لے گی، سب طنزیہ باتیں برداشت کر لے گی۔ مگر موجودہ طرزِ زندگی کو ہرگز طول نہ دے گی، محبت کا رستہ خاردار ہے تو ہو اُس کے پاؤں بھی کانٹوں سے چھلنی ہونے کو تیار تھے۔ اُس نے ہاتھ کے پُرزور جھٹکے سے قریب پڑی ہوئی تپائی کو پرے ہٹادیا اور کھڑی ہوگئی، اُسی ایک جھٹکے سے گویا معصیت آلود عشرت کی نازک زنجیروں کو طرفۃ العین میں ریزہ ریزہ کر دیا، اور ——— دل میں شوق و اضطراب کا ایک طوفان چھپائے، جس سے اس کے جسم کی رگ رگ کانپ رہی تھی، وہ شام کی گاڑی میں سوار دہلی جارہی تھی۔

یاد

مَیں نے جب پہلے پہل تجھے دیکھا تو تُو اِک کلی تھی ناشگفتہ، اِک نغمہ تھی زیرِ لب، اِک خواب تھی حسین د رُوح پرور معصومیت کی الوہیتیں چہرے پر بکھیرے، آنکھوں میں ضیلے تے مسرت کی کرنیں سمیٹے، گویا ابھی ابھی آفتاب طلوع ہوا ہے، اور رُخ روشن پر سماوی تجلّیاں نمایاں کئے تُو صحنِ چمن میں یوں پھر رہی تھی گویا ایک نازک و رنگین تیتری ہے جو قوس قزح کے نظر فریب الوان سے مزیّن، باغ کی معطر فضا میں، رنگ و بو کا روح افزا ارتعاش پیدا کرنے آئی ہے۔ تیرے نازک نازک پاؤں جو سلیپروں کے اندر سے یوں جھانک رہے تھے جیسے سبز پتوں میں چھپے ہوئے موتیا کے پھول اس سرعت و بے تکلفی سے باغ کی روشوں پر پڑ رہے تھے کہ ہر ہر قدم پر تیرا نور و لطافت کے خمیر سے گندھا ہوا بدن دوہرا ہو ہو جاتا تھا۔ مجھے شک ہوا کہ تُو بھی پھولوں کی ایک ڈالی ہے جو ہوا کے ہر جھونکے سے لچک لچک کر رہ جاتی ہے۔

پھر ہم میں جُدائی پڑگئی مجھے افکارِ حیات کھینچ کر لے گئے اور تیری یاد میرے نہاں خانۂ دماغ میں آبدار موتی کی طرح چھپی رہی۔ کتنے سال گزر گئے اور میں تیرے تصوّر کی پرستش کرتا رہا۔ تُو اس روشنی کی طرح جو اُفق کے بعید ترین گوشوں سے پھوٹ کر عالم کو منوّر کرتی ہے میری آنکھوں سے اوجھل رہ کر میرے خیالات پر انوار و تجلیات کی بارش کرتی رہی۔ میری راتیں تیری یاد سے رنگین اور میرے دن تیرے خیال سے روشن رہنے لگے۔ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ محبت کی اور جس جذبۂ بے پناہ کے ساتھ محبت کی اُس نے میرے دل و دماغ کو ملتہب میری راتوں کو بے خواب اور دنوں کو وقفِ اضطراب کر دیا۔ میرے دل کی سوزشیں، میری روح کی آہیں، میرے دماغ کی کاوشیں سب تجھ سے پوشیدہ رہیں۔ تجھے میرے قلب کی جراحتوں اور میری آنکھوں کی خوں فشانیوں کا بھی علم نہ ہوا۔ تُو نے الھڑپنے سے، بے خبری سے، لاعلمی سے مجھے ایک ایسے جذبے سے سرشار کر دیا کہ میرے لئے کوئی رنج رنج، کوئی غم غم اور کوئی دُکھ دُکھ نہ رہا۔ آہ ؎

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

کتنے برس گزر گئے اور میں نے دوبارہ، لیکن آخری مرتبہ، تیری دید

سے آنکھوں کو منوّر و شاداب کیا۔ ریل کے جنکشن پر رواداری کی ملاقات تھی۔ مگر وہ چند لمحے اب تک میری زندگی کا سرمایہ، میری تسکین و راحت کا گنجینہ اور بہجت و شادمانی کا خزینہ ہیں۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، جسم کی ساری قوّت کھنچ کر آنکھوں میں آگئی تھی۔ مَیں متامل لیکن پُر شوق قدموں سے آگے بڑھا۔ مَیں نے تجھے دیکھا۔ آہ کلی کھل کر پھول بن چکی تھی۔ اِک بدیعۂ جمال؛ اِک حدیقۂ حسن و شباب میری آنکھوں کے سامنے موجود تھا۔ خواب کی تعبیر خواب سے زیادہ حسین و رُوح پرور نکلی۔ ہوائے تاہل نے تیرے رخساروں کو آگ لگا رکھی تھی۔ تیری سیاہ گھنی پلکوں کے اندر سے شراب عشق چھلکی پڑتی تھی۔ تیری خمار آگیں آنکھوں میں اُس خوش نصیب شخص کی محبت چمک رہی تھی جو اب بھی تیرا ہم سفر تھا۔ وہ دن اور آج کا دن، مَیں اس امید پر زندہ ہوں کہ شاید لیل و نہار کی کوئی خجستہ گردش پھر اُن عنبریں بالوں، اُن گلگوں رخساروں، اُن دلفریب و ہوشربا آنکھوں اور آہ اُن سیاہ لانبی گھنی پلکوں کے جلوے سے مجھے بے خود و سرشار کر دے۔

میرے خیالوں پر حکمرانی کرنے والی ملکہ! تجھے سندھ کی حسن پرور و ناز آفریں سرزمین مبارک ہو۔ لیکن جب تُو غروب آفتاب

سے کچھ قبل اپنی گاڑی کی چلمنیں چھوڑ کر سیر کو نکلے تو سمجھ لیجو کہ میری مضطرب و پریشان رُوح، قیس کی طرح، جو صحرائے نجد میں ناقۂ لیلےٰ کے پیچھے خاک چھانتا بھاگا کرتا تھا، سندھ کے تپتے ہوئے ریگستانوں میں دیوانہ وار تیرا تعاقب کر رہی ہے

جوانی کی لغزش

چاندنی رات تھی۔ ہلکی ملگجی روشنی شش جہت میں پھیل کر کائنات کو بقعۂ نور بنا رہی تھی۔ سطح آسمان پر ستارے جگنوؤں کی طرح چمک چمک کر منظر کی دلفریبی میں اضافہ کر رہے تھے۔ خنک ہوا کے جھونکے میدان میں بہنے والی نرم رو آبجو کی طرح ایک شیریں ترنّم پیدا کر کے تھکے ہوئے دماغوں کو آسودگی بخش رہے تھے۔ حیوان و انسان دُنیا کے ہنگاموں اور زندگی کے جھگڑوں جھمیلوں سے آزاد ہو کر نیند کی آغوش میں پہنچ چکے تھے۔ اس نشہ آور ماحول اور ان خمار آفریں اثرات کے اندر صرف وہ خاموش و مضمحل، بستر پہ پڑا جاگ رہا تھا۔ اُس کا دماغ پریشان خیالات کی حدت سے کھولتے ہوئے پانی کی طرح اُبل رہا تھا۔ جذبات کی تُندی بعض اوقات اُس کی حرکتِ قلب کو اس قدر تیز کر دیتی تھی کہ خون ہیبتناک سُرعت کے ساتھ اُس کی رگوں میں دوڑنے لگتا اور اُس کا جسم ایک خوفناک

تھرتھری سے کپکپا اُٹھتا تھا پھر دوسرے لمحہ میں رُوح کو منجمد کر دینے والا، مبہم و بے معنی خوف، بارِ گراں کی طرح اُس کے رگ و ریشہ پر مسلّط ہو کر اُسے اس قدر ناتواں بنا دیتا تھا کہ وہ گھبرا جاتا کہ کہیں اس کے جسم و جاں کا رشتہ منقطع ہونے کا وقت تو نہیں آپہنچا۔ ماہِ تاباں کی ضیا پاشی، رات کا سحر کار حُسن، فضا کا سکوت، کوئی چیز بھی اُس کے پھڑکتے ہوئے اعصاب میں سکون پیدا کرنے کے قابل نہ تھی۔ ایک ہفتہ سے وہ اس جاں گسل کشمکش کا شکار ہو رہا تھا۔ اُس کا معصوم و سریع الاحساس دل تفکّراتِ شدید کا مرکز اور اس کا الم ناآشنا دماغ تردّداتِ بے پایاں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ دن کا آرام اور رات کی نیند اُس کے لئے حرام ہو چکی تھی۔ وہ ٹکٹکی باندھے آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کا چہرہ مرے ہوئے انسان کی طرح ساکن و بے نور تھا۔ لیکن دل ناقابلِ توضیح اضطراب میں مبتلا جسم کی ایک ایک رگ کو شعلہ زار بنا رہا تھا۔ وہ نصف گھنٹہ یوں ہی، بے حس و حرکت، لیٹا رہا اور آخر ایک اضطراری جنبش کے ساتھ یک لخت بستر سے اُٹھا لیکن فوراً ہی نیم مردہ انسان کی طرح چارپائی پر گر پڑا۔ اُسے یوں محسوس ہوا کہ کوئی دندانہ دار آری آہستہ آہستہ اُس کے اعضا۔ کو کاٹ رہی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اگر یہ ہولناک ذہنی اذیت اُس کے خیالات پر کچھ عرصہ یوں ہی مستولی رہی تو وہ یقیناً دیوانہ وار دیوار سے سر ٹکرا کر اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالے گا۔ رنج و غم کی تباہ کن افسردگی اور جوش و

التہاب کے طوفان کو جس سے اُس کا دورانِ خون مسموم ہو رہا تھا وہ اُگل ڈالنا چاہتا تھا لیکن اس پر قادر نہ تھا۔

یکایک اُس کا سینہ پھیلا اور جذبات پنہاں کی خاموش و طویل جنگ نے ایک دردناک آہ کی صورت اختیار کی۔ اُس کے ہونٹوں سے ایک دھیمی چیخ نکلی اور عالمِ انتشار میں اپنے ہاتھوں کو بیتابی سے ملتے ہوئے اس نے کہا۔ "میرے اللہ مجھے اس قیامت سے نجات دے۔ اگر اس خبر میں صداقت ہے تو اور اگر یہ افترا ہے تو بھی مجھے حقیقت سے آگاہ کر دے کہ میں یہ جانکنی کا عذاب برداشت کرنے سے عاجز ہوں۔"

اُس نے بے اختیار ہو کر تکیہ کے نیچے سے ایک شکن آلود کاغذ نکالا۔ جس پر روشنائی سے بہت مختصر تحریر مرقوم تھی۔ آہ یہ نوشتہ خونیں کاش اُسے کبھی نہ ملتا۔ یہ سیاہ داغ جس نے دفعتہً اُبھر کر اُس کی جمعیتِ قلب کو تہس نہس کر ڈالا تھا، ہمیشہ اُس کی نظروں سے اوجھل ہی رہتا۔ وہ زندگی کے بقیہ ایّام اسی عشرتِ جہالت میں بسر کر دیتا۔ جس کا وہ ہمیشہ سے عادی چلا آ رہا تھا۔ اکرام نے یہ خط بھیج کر یقیناً اس پر بے انتہا ظلم کیا تھا۔ اگر عفت و عصمت کے دامن بے لوث پر ایسا مکروہ اور خوفناک دھبہ لگ چکا تھا تو اُسے کیوں اس کی اطلاع دی گئی۔ کیا لکھنے والے کا مقصد محض یہ تھا کہ وہ اس حادثہ فاجعہ سے واقف ہو کر آئندہ محتاط زندگی اختیار کر لے

یا یہ کہ اس واقعۂ جانگداز کی یاد ہر لمحہ اُس کے قلب و جگر پر نشتر چبھو چبھو کر اُسے عقوبتِ جہنم کی اذیّتِ مستمرّہ کا شکار بنائے رکھے۔ اگر وہ اُس کی حسّاس طبیعت، اُس کی معصوم مسرتوں اور بلند توقعات سے، جو اس نے اپنی رفیقِ زندگی سے لگا رکھی تھیں، آگاہ ہوتا تو شاید اس قسم کے طرزِ عمل سے ہمیشہ گریز کرتا۔ کیسا غضب ہے کہ ایک شخص عمداً اپنے آپ کو آلائشِ گناہ سے ملوّث کرتا ہے اور پھر خود ہی داغِ عصیاں کی تشہیر بھی کرتا ہے۔

اُس نے کاغذ کے پُرزے کو چاند کی ناکافی روشنی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا چند سطریں تھیں جن کے الفاظ جلّاد کی خونخوار آنکھوں کی طرح گھُور گھُور کر اُسے لرزہ براندام کر رہے تھے۔ اُس کے ہاتھوں میں سوئیاں سی چُبھنے لگیں اور کاغذ سرک کر بستر پر گر پڑا۔ "کاش یہ خبر غلط ہو، یہ اتہام بے بنیاد ہو، یہ بہتان جھوٹ ہو۔ وہ بدگمانی کی کالک کو ندامت کے آنسوؤں سے دھو کر پھر ایک بار اپنی پیاری کو سینے سے چمٹا لے اور اپنے حیلہ جُو دل کو اُس کی جلدبازی پر سرزنش کر کے تسلّی دے کہ یہ سب مذموم کارروائی ایک ناکام رقیب، ایک بدطینت دشمن کی عداوت کا نتیجہ تھی۔"

لیکن اُس کا دماغ ان تاویلات سے مطمئن نہ ہوتا تھا۔ اُسے اِس

تحریر سے بوئے صداقت آتی تھی۔ اُس نے ابھی چند ماہ ہوئے ایک مغربی حکیم کی معرکہ آرا کتاب "نفسیاتِ شباب" کا مطالعہ کیا تھا جس کے پُرزور لب و لہجہ، شاندار اندازِ بیان اور ناقابلِ تردید دلائل نے اُسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ اِس صحیفہ کے ایک ایک حرف پر ایمان لے آئے۔ کیا فاضل مصنّف نے اپنے خانہ بر انداز نظریّے کی تائید میں صنفِ لطیف کے بے شمار افراد کی مثالیں پیش نہیں کی تھیں؟ کیا اس نے مشرّح و واضح الفاظ میں عورت کی زندگی کے اُن جبر تناک لمحات کا ذکر نہیں کیا تھا جہاں ایک عورت، بلا تمیز و تخصیص، محض گوشت، خون اور اعصاب کا مجموعہ رہ جاتی ہے۔ جہاں ہوا و ہوس کا خفیف سا جھونکا اُسے 'بید مجنوں کی طرح' جس طرف چاہے جھکا سکتا ہے۔ اور جہاں آزمائش کے مقابلے میں مغلوب ہونا اور ابتلا کے سامنے ہتھیار ڈال دینا ہی عورت فقمندی سمجھتی ہے؟ شعاعِ حقیقت زہر میں بجھے ہوئے تیر کی طرح اس کے دماغ کو چھلنی کر گئی۔ اس خوفناک کتاب کی زندہ جاوید مثالیں اُس کے دماغی پردوں پر متحرک تصاویر کی طرح ناچنے لگیں۔ آہ یہ سب ممکن تھا۔ کوئی بات بھی بعید از قیاس نہ تھی۔ اب وہ کاغذ کا پرزہ زیادہ معنی خیز ہو گیا تھا۔ کرب و اندوہ کی ناقابلِ برداشت تلخی نے اس کی آنکھوں کو غمناک کر دیا۔

بدنصیب انسان! آج اُسے معلوم ہوا تھا کہ قلبِ انسانی میں مختلف و متباین تار ہیں جن کا ہمیں عمر بھر احساس نہیں ہوتا۔ اِن تاروں کو صرف

حادثات ہی چھو سکتے ہیں۔ آج اُسے پہلی مرتبہ محسوس ہوا کہ وہ اپنی بیوی کو والہانہ محبّت کے ساتھ چاہتا ہے۔ اپنی خاموش، علمی زندگی میں اُس کی کتابیں ہی اُس کی محبوبہ رہی تھیں۔ اُس نے اشتیاقِ بے نہایت کے ساتھ شادی کی۔ اپنی حسین بیوی کی کشادہ و تابناک آنکھوں میں صحیفۂ عشق کے کئی باب مطالعہ کئے۔ لیکن پھر عالمِ خود فراموشی میں اپنے درسی مشاغل میں غرق ہو گیا۔ اُس کا تخیّل بیوی کے متعلق ہمیشہ یہی رہا تھا کہ وہ اُسکی سیاحتِ علمی میں اگر رہبر نہیں تو ہم سفر ضرور ہو گی۔ وہ بیوی کو ایک ذی روح علمی کتاب سے زیادہ نہ سمجھنا چاہتا تھا لیکن اب کہ اُس کی ازدواجی مسرت تباہی کے غارِ عمیق کے کنارے کھڑی تھی وہ اُس کو پھر ایک بار شوخ اور چنچل لڑکی دیکھنے کا آرزومند تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ علمی بار کو دریا بُرد کر کے، ذخیرۂ کتب کو دیا سلائی دکھا کر اپنی بیوی کو پھر عروسِ نو بنا ہوا دیکھے۔ اُسے اپنا پرستیدۂ خیال، اپنا قبلۂ جذبات بنائے۔ اُس کے حنا آلود ہاتھوں کی سُرخی کو بوسوں کی کثرت سے دھو ڈالے اور اُس کے حضور اپنے بہترین ہدایائے عشق پیش کرے لیکن آہ اُس کی آنکھ بہت دیر میں کھلی تھی۔ وہ اپنی متاہل زندگی کے ابتدائی دور کی سیر کر رہا تھا۔ جب اُس نے نوخیز عاشق کی طرح اپنے عشقِ پُرجوش کی حدت سے نئی نویلی دُلہن کو پریشان کر دیا تھا۔ چوبیس گھنٹے ایک نرم و نازک چیز اُس کے پہلو میں موجود رہتی۔ کسی کے عطر میں بسے ہوئے لباسِ حریر کی خوشبو اُس

کے دماغ کو مدہوش کئے دیتی تھی، وہ اپنی مسرور و شاداں بیوی کو، جو دوشیزۂ بہار کی مانند، موسم کے بہترین الوان سے مزیّن" ایک رنگین تیتری کی طرح اُس کے کاشانۂ خیال میں رنگ و بو کا رُوح افزا ارتعاش پیدا کرتی رہتی تھی، وفورِ محبت سے "ممتازی ممتازی" کہہ کر پکارتا تھا۔ اُس کی بیوی نے کئی بار احتجاجِ محبت کے طور پر کہا کہ تم نے میرا نام بگاڑ دیا ہے۔ وہ ایک گرم و طویل بوسے سے اُس کے کھُلے ہوئے شیریں ہونٹوں کو بند کر دیتا اور کہتا۔ "آہ تم اتنی نازک، اتنی پیاری اور اتنی شوخ و شریر لاڈلی ہو کہ میں کبھی تمہیں ممتاز کے گرانبار لفظ سے نہ بلاؤں گا۔"

خیالات کی رو اُسے کہاں سے کہاں لے گئی۔ اُس کے مشتعل دماغ میں قدرے سکون پیدا ہوا۔ اُس نے سر اُٹھا کر اپنی بغل والی چارپائی کو دیکھا جہاں اُس کی پری وش نوجوان بیوی محوِ خواب تھی۔ اُس کا خوبصورت چہرہ چاند کے نور سے دُھل کر حد درجہ دلآویز ہو گیا تھا۔ اُس کے نمکین لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ سیاہ بال بے ترتیب ہو کر کندنی پیشانی پر بکھر گئے تھے۔ لانبی گھنی پلکوں نے باہم پیوست ہو کر آنکھوں کو چھپا رکھا تھا، وہ آنکھیں جو اُس کے جسمِ مرمریں کے تمام دلکش اعضاء سے زیادہ حسین تھیں۔ وہ اکثر اُس کی سپید و عریاں گردن میں باہیں حمائل کر کے اُس کی آنکھوں کو چوم چُوم کر، شاعرانہ مبالغہ سے کہا کرتا تھا۔ "ممتازی! تم آنکھیں بند کر لیتی ہو

تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ تمام کائنات سوگئی ہے۔ اُس کے کل ہنگامے خاموش ہوگئے ہیں۔ اور آہ جب تم آنکھیں کھول دیتی ہو تو خوابیدہ فتنے یکبارگی جاگ، اٹھتے ہیں۔ حجر و شجر، جن و انس، انگڑائیاں لیتے معلوم ہوتے ہیں اور فضا میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ پیاری، تمہاری آنکھوں میں کیا جادو ہے؟"

وہ ایک نغمہ پرداز قہقہے کے ساتھ، اُس کی خیال آرائیوں پر تالیاں بجاتی ہوئی، طائرِ نو اسیر کی طرح اُس کی گرفت سے نکل جاتی اور دُور جا کر اُس کی طرف دیکھ دیکھ کر بے اختیار ہنستی تھی۔

وہ اس زہد شکن نظارے سے بیتاب ہو کر چاہتا تھا کہ اُس کے سُرخ و صبیح رخساروں کو جہاں خونِ صحیح بادۂ ارغواں کی طرح جھلک رہا تھا چوم لے کہ وہ "خونیں تحریر" اپنے شعلہ فشاں نقوش کے ساتھ اُس کی چشمِ تصوّر کے سامنے آگئی۔ انتہائے یاس میں اُس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ پھر ایک چھچلتی ہوئی نگاہ اپنی بیوی پر ڈالی جو بدستور میٹھی نیند میں مست دایاں گال ریشمی تکیے پر رکھے اطمینان سے سو رہی تھی۔ اُس کے دل میں حیرت و استعجاب کا طوفان اُٹھا۔

"کیا ایک مجرم ضمیر، ایک گناہ گار انسان، مکافاتِ بد سے مامون یوں چین سے سو سکتا ہے؟ کیا گناہ کی یاد ارتکابِ گناہ سے زیادہ تکلیف دہ

نہیں ہوتی؟ کیا ایک عورت حقوقِ زوجیّت کو ہوس کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھا کر خاوند کے پہلو میں یوں بے غل و غش محوِ خواب ہو سکتی ہے؟"
جذباتِ گوناگوں کی آمیزش نے اُس کے حواس کو کُند کر دیا۔ اُس کے ذہن نے مزید فکر سے انکار کر دیا اور عالمِ بے بسی میں اُس کے مُنہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔ اُس کی بیوی گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔ آنکھیں ملتے ہوئے اُس نے اپنے شوہر کو دیکھا جو چارپائی پر بے ہوش پڑا تھا۔ وہ جلدی سے اُسکے قریب آئی۔ اپنا ہاتھ اُس کی پیشانی پر رکھ کر بولی۔

"پیارے، کیوں؟ خیر تو ہے؟"

"ممتازی، خواب، بہت ہی ڈراؤنا خواب، ——— میرا کلیجہ مُنہ کو آ رہا ہے۔"

اُس نے اُس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا اور نرمی سے بالوں کو سلجھانے لگی۔ "پیارے تم ایک ہفتے سے پریشان نظر آتے ہو۔ رات کو پوری نیند بھی نہیں سوتے، خدا جانے تمہیں کیا ہو گیا ہے۔"

آہ، وہ دل سے چاہتا تھا کہ یہ سب کچھ ایک خواب بن جائے۔ اُس کا رُوح فرسا غم ایک خوفناک خواب میں تبدیل ہو جائے جس کے اندوہگیں نقوش کو عالمِ بیداری کی مسرّت فوراً صاف کر ڈالے۔ صبح ہوئی تو شفیق و غمگسار ماں نے دیکھا کہ اُس کے لختِ جگر کی آنکھیں گدلی ہیں، چہرہ اداس

کے منہ پہ ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔ اس نے اُسے پاس بُلایا اور ہمدردانہ لہجہ میں کہا کہ "رات کو زیادہ جاگنا اچھا نہیں۔ تم دن کو بھی نہیں سوتے۔ رات کو نیند پوری نہ کروگے تو صحت بگڑ جانے کا ڈر ہے۔"

اُس نے تہیہ کر لیا تھا کہ آج وہ راز کھول دے گا۔ دوٹوک فیصلہ ہو جائے تو اچھا ہے۔ قوتِ برداشت اُسے جواب دے رہی تھی۔ اُس کا دل مزید بوجھ اُٹھانے سے عاجز تھا اور وہ جانتا تھا۔ کہ اگر یہ آگ یونہی اندر ہی اندر سلگتی رہی تو اُس کے اعصاب تباہ ہو جائیں گے۔ اُس نے اپنی بیوی سے کہا۔

"مَیں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں، کیا تم وعدہ کرتی ہو کہ میرے ساتھ جھوٹ نہ بولوگی؟"

اُس کی بیوی کا دل دھڑکنے لگا۔ اُس نے کہا۔ "مَیں جھوٹ بولنا گناہ جانتی ہوں بے شک مَیں وعدہ کرتی ہوں کہ تم سے کوئی بات نہ چھپاؤں گی۔"

اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے وہ کاغذ کا پُرزہ، وہ نامۂ اعمال، وہ ورقِ سیاہ اُس کے حوالے کر دیا۔ "بتاؤ اِس میں کتنی صداقت ہے؟"

چشمِ زدن میں اُس کی بیوی کا رنگ متغیّر ہو گیا۔ اُس کا سر چکرانے لگا۔

جسم شل ہوگیا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ کانوں میں شائیں شائیں کی آوازیں آنے لگیں۔ اُسے یوں معلوم ہوا کہ وہ زمین و آسمان کے درمیان معلّق ہے جہاں اُس کے حواس جواب دے بیٹھے ہیں۔ وہ بولنا چاہتی تھی لیکن اُس کے پاؤں جنبش نہ کر سکتے تھے۔ اُس کی نظریں کاغذ کے پُرزے پر جمی تھیں لیکن دکھائی کچھ نہ دیتا تھا۔ سیاہی کے چند نقوش میں وُہ خوف و ہراس، موت و ہلاکت، ذلّت و رسوائی کی بھیانک تصاویر ناچتی دیکھ رہی تھی۔ اُس کے خاوند نے کڑک کر کہا۔

"بتاؤ اس میں کتنی صداقت ہے؟"

"جو کچھ لکھا ہے صحیح ہے۔"

وہ مجروح سانپ کی سی تیزی کے ساتھ الٹے پاؤں پھرا اور اپنے کمرے میں آرام کرسی پر نیم جاں ہو کر گر پڑا۔ اُس کے جسم کے ایک ایک مسام سے پسینہ بہ رہا تھا۔ اس کی بیوی نے ساس سے پوچھے بغیر بُرقع اوڑھا اور کرائے کی گاڑی میں سوار ہو کر میکے چلی گئی۔ وہ اب اپنے خاوند کے مکان میں رہ کر اُس کی حرمت و تقدیس کو زیادہ داغدار نہ کرنا چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ کھیل ختم ہو چکا اور اب اُس چار دیواری میں رہنا اُس کے لئے مداخلتِ بے جا سے کم نہ تھا۔

جب مرگ آور یاس کی غنودگی اُس کے حواس سے اُتر گئی تو وہ اُٹھا

قلم اور کاغذ سنبھال کر اس نے خط لکھنا شروع کیا۔

"ممتازی! مَیں تم سے اب بھی محبت کرتا ہوں، ویسی ہی شدید و بے پایاں جیسی اُس وقت کرتا تھا جب تم دلہن بن کر نئی نئی اس مکان میں آئی تھیں، تمہاری الفت سے مَیں ہمیشہ سرشار رہا ہوں۔ درمیانی وقفہ میں بھی جسے شاید تم میری غفلت و بے اعتنائی پر محمول کرو گی تمہاری محبت بدستور میرے قلب کی گوشہ گیر رہی ہے۔ مَیں تم کو انسان سمجھتا ہوں ایسا ہی انسان جیسا کہ مَیں خود ہوں جس طرح کہ مَیں اپنے اندر فرشتہ بننے کی اہلیت نہیں پاتا اسی طرح تم سے بھی فوق البشر ہونے کی توقع نہیں رکھ سکتا۔ جو کچھ تم نے کیا وہ ہر انسان سے ممکن ہے۔ لیکن میں ڈرتا ہوں کہ اگر مَیں زندہ رہا تو میری محبت مر جائیگی۔ میرے سامنے ایک طرف نفرت و انتقام کی زندگی ہے اور دوسری طرف محبت سے مخمور موت۔ مجھے ان میں سے ایک چیز انتخاب کرنا ہے۔ یقیناً میرا ہاتھ موخر الذکر کی طرف بڑھے گا۔ گلِ نوشگفتہ کو اُس کی رعنائی و زیبائی کے عالمِ شباب میں ٹہنی سے توڑ لینا اچھا ہے بہ نسبت اس کے کہ اُس کی طبعی موت کا انتظار کیا جائے جب موسم کی تندی سے کملا کر، آفتاب کی حدّت سے سوکھ کر، اُس کی پتیاں ایک ایک کرکے باغ کی روش پر گر کر خاک میں مل جائیں۔ میرا چھ گولی کا پستول میرے سامنے رکھا ہے یہ

خط جو مَیں نہایت سرعت سے ختم کر رہا ہوں تمہیں اُس وقت پہنچے گا،
جب پستول کی گولی میری کنپٹی کے پار ہو چکی ہو گی۔"

اُس کی بیوی نے گھر پہنچنے سے پہلے پہلے مستقبل کا فیصلہ کر لیا تھا۔ گھر پہنچ کر اپنی غیر متوقع آمد کا کوئی قابلِ قبول عذر پیش کرنے کے بعد سب سے پہلے اُس نے ذیل کا خط خاوند کے نام سپردِ قلم کیا۔

"پیارے! گناہ ہر حال میں گناہ، جرم ہر حال میں جُرم اور عیب ہر حال میں عیب ہے۔ گناہ کی کوئی تاویل، جرم کی کوئی صفائی اور عیب کی کوئی وجہ جواز پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ مت سمجھو کہ مَیں اپنی برأت کے لئے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ گناہ کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔ اُس کے مسموم اثرات روح اور جسم پر ہمیشہ باقی رہتے ہیں۔ مَیں ایک عذر بھی پیش کر کے گناہ کی سفّاکی کو زیادہ گھناؤنا نہیں بنانا چاہتی۔ مَیں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم سا زیرک و خوش فہم شخص نفسِ انسانی کے ایک خاص پہلو سے آگاہ ہو جائے۔ آہ مَیں کس بےتکلّفی سے تم کو وہ باتیں لکھ رہی ہوں، جو ایک بدترین عورت بھی کسی مرد کے سامنے کہنا گوارا نہ کرے گی۔

میری ماں کا ابتدا سے یہی ارادہ تھا کہ وہ مجھے اپنے خاندان میں بیاہیں گی۔ اکرام اُن کے دُور کے قرابت داروں میں سے تھا اور ہمارے

یہاں اکثر آیا کرتا تھا۔ کھاتے پیتے والدین کا اکلوتا بیٹا۔ شکل و صورت کے لحاظ سے بہت اچھا، پھر پڑھا لکھا۔ گویا میری ماں کے معیار پر پُورا اترتا تھا۔ گھر کے اندر میرا اس کے ساتھ نام لیا جانے لگا۔ مجھے بھی اُس سے اُنس پیدا ہو چلا تھا۔ اور ایسا ہونا ہماری معاشرت میں چنداں تعجب انگیز نہیں ہے۔ ابھی باقاعدہ منگنی کی نوبت نہ آئی تھی کہ تم ایک ساحر، ایک جادو کی طرح، کیوپڈ کے بازوؤں پر سوار، میرے افقِ حیات پر نمودار ہوئے۔ اور مجھ سے صبر و شکیب، تاب و تواں سب کچھ چھین کر لے گئے۔ میری راتیں تمہاری یاد سے رنگین اور میرے دن تمہارے خیال سے روشن رہنے لگے۔ حتّٰی کہ میں تمہارے پاس آئی اور محبّت کے داروئے بے ہوشی نے کچھ عرصے کے لئے ہماری متحدہ زندگی کو ایک طویل غشی میں تبدیل کر دیا۔ پیارے! عورت کا خمیر ہی محبت سے بنا ہے۔ وہ صرف محبت کئے جانے کے لئے تخلیق کی گئی ہے۔ وہ عیش و مسرت کے انتہائی مقام پر اُس وقت پہنچتی ہے جب وہ سعیِ محبت میں کامیاب ہو۔ لاریب تم نے مجھ سے اتنی محبت کی کہ شاید ہی کوئی مرد کسی عورت کرے گا۔ لیکن وہ بھادوں کی بارش کی مانند تھی کہ ابھی مطلع صاف تھا اور ابھی بادل چھا گیا۔ اور پھر فوراً ہی برس کر کُھل گیا۔ تم اس

خوابِ شیریں سے جلد جاگ اُٹھے اور مَیں نادانی سے یہ سمجھتی رہی کہ ابھی صبحِ کاذب ہی ہے۔ تم کو تمہاری محبوب لائبریری اور "ریسرچ" زبردستی مجھ سے جدا کر کے لے گئے اور میں یادِ ایام کی حسرت کو دل کے ایک کونے میں چھپا کر بے صبری سے تمہارا انتظار کرنے لگی۔ گرمی گزر گئی لیکن تم نہ آئے۔ برسات ختم ہو گئی تم نہ آئے۔ جاڑا سارے کا سارا بیت گیا مگر میری آنکھیں تمہاری دید سے محروم رہیں۔ آہ، تم نے عواقب سے بے خوف ہو کر ایک کمزور عورت کو جذبات کی ہولناک آزمائش میں ڈال دیا اور پھر خبر نہ لی۔ تم نہیں جانتے عورت جامِ محبت سے ایک گھونٹ پی کر پیالے کو ہاتھ سے دینا نہیں چاہتی۔ تم یہ بھی نہیں جانتے کہ ناکامِ محبت عورت کی زندگی میں کیسے کیسے ابتلا انگیز اوقات آتے ہیں۔ اُس شخص کی طرف سے، جو کسی زمانے میں میرا خواستگار رہ چکا تھا۔ اور جس نے اپنی درخواست مسترد ہو جانے پر ہم دونوں سے انتقام لینے کی خاموش قسم کھا رکھی تھی، مجھے غیر محسوس طریقے سے یقین دلایا جانے لگا کہ تم مجھے فراموش کر چکے ہو۔ میں اعتراف کرتی ہوں کہ میرا دل کمزور تھا لیکن تم اُسے قوی بنا سکتے تھے۔ تمہاری بے رُخی نے تمہیں ایک خط تک لکھنے کی اجازت نہ دی۔ میں تمہاری تحریر دیکھنے کو بیتاب

تھی مجھے یقین تھا کہ تمہارے خط میں وہی جادو ہوگا۔ جو تمہاری آنکھوں میں جلوہ فگن ہے۔ تمہارے الفاظ میں وہی قیامت زا گرمی ہوگی جو تمہارے مضبوط بازوؤں میں ہے لیکن تم مابعد الطبیعیات اور علم النفس کے مسائل حل کرنے میں منہمک رہے آہ، تم نے جو نفسیات کے عالم ہو یہ نہ سوچا کہ جوان عورت داعیاتِ شباب کو کتنی جلدی لبیک کہتی ہے؟

بس پیارے! اب مجھے معاف کرو۔ مَیں ناگفتنی باتیں لکھتی چلی جا رہی ہوں۔

—— وہ شخص ہر لمحہ میرے قریب آتا گیا۔ مَیں نے ایسا محسوس کیا کہ تم اس کے اندر حلول کر گئے ہو۔ وہ ہر روز تمہارے متعلق جھوٹے قصے گھڑ گھڑ کر سناتا رہا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ تم کسی مغرب نژاد لڑکی کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہو چکے ہو۔ آخری خبر نے میرا کاسۂ صبر لبریز کر دیا اور آہ تم نہیں جانتے ہم عورتیں اس معاملہ میں کتنی ذکی الحس واقع ہوئی ہیں۔ اُس شخص کو ہم دونوں سے انتقام لینا تھا —— اور اب خود میری مجروح توقعات تم سے انتقام لینے پر مچل رہی تھیں۔ مَیں ایک مدت تک رضا و رغبت کے خلاف، تحریص و ترغیب کے خلاف، جذبات بشری و تقاضائے

جنسی کے خلاف شدّت سے جنگ کرتی رہی لیکن نفس کا سیلابِ عظیم اُٹھا اور میری بودی کوششیں خس و خاشاک کی طرح بہہ نکلیں۔

جس طرح تم پُرانا پھٹا ہوا جوتا بے پروائی سے اُتار کر پھینک دیتے ہو ——— للہ مجھے بھی ایک حقیر شے سمجھ کر پھینک دو اور بھول جاؤ۔ آہ میں تمہارے لائق نہ تھی۔ میری حدِ پرواز بہت ہی مختصر نکلی۔ میں زندہ رہ کر تمہاری وسیع و بسیط شہرت کے پاکیزہ دامن کو داغدار کرنا نہیں چاہتی ——— زہرِ ہلاہل کی شیشی جس کے چند قطرے میرا قصّہ پاک کر دیں گے بائیں ہاتھ سے اُٹھا چکی ہوں اور تم سے آخری التجا یہی ہے کہ مجھے ہمیشہ کے لئے بھول جاؤ۔"

عذرِ گناہ

احمد بائی کی سرائے کے ایک کمرے میں مَیں ساکت و صامت بیٹھا سوچ رہا تھا۔ سوچ رہا تھا یا گردوپیش کو دیکھ رہا تھا، مَیں اپنی اس وقت کی ذہنی کیفیت کا تجزیہ کرنے سے قاصر ہوں۔ بادوباراں کی طوفانی رات اور دسمبر کا جاڑا یوں معلوم ہوتا تھا کہ زمہریر سے، برف میں لگی ہوئی ہوائیں آ آ کر خون کو منجمد اور جسم کو بے حس کر رہی ہیں کمرے کے کواڑ بند تھے۔ لیکن بارش اور ہوا کے شور سے معلوم ہوتا تھا کہ عناصر شدت سے ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریباں ہو رہے ہیں۔ میرے سامنے ایک انسان موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا، غلیظ سے بستر میں دبکا پڑا تھا۔ آتشدان میں کوئلے بُجھ کر راکھ ہو چکے تھے، لیکن کبھی کبھی کوئی چنگاری دفعتہً چمک کر فضا کو روشن کرنے کی ناکام کوشش کرتی اور فنا ہو جاتی تھی۔ لیمپ کی ناکافی اور دُھندلی روشنی ماحول کو زیادہ افسردہ اور غمناک بنا رہی تھی۔ کمرہ ہر قسم کے سامانِ تزئین و آرائش سے معرّا، برق و باد کے شور اور چراغ کی

کپکپاتی ہوئی روشنی میں معمول سے زیادہ بھیانک نظر آرہا تھا۔ اس فضا میں میرے لئے کسی خوشگوار موضوع پر خیال آرائی ناممکن نہیں تو محال ضرور تھی۔ ڈاکٹر ابھی اٹھ کر گیا تھا اور مجھے "موت وزیست کی کشمکش میں مبتلا انسان" کی تیمارداری کے متعلق اُس کی چند اہم ہدایات پر عمل کرنا تھا۔

یہ مصیبت زدہ انسان جس کی طرف میں دو مرتبہ اشارہ کر چکا ہوں۔ میرا بچپن کا رفیق اور کالج کا ہم سبق دوست اَسلم تھا۔ ہمیں ایک دوسرے سے جُدا ہوئے کم و بیش چار سال گذر چکے تھے اور اس طویل مفارقت کے بعد کارکنانِ قضا و قدر نے آج پھر اُسے میری راہ میں لا ڈالا تھا۔ لیکن کس قدر تبدیل شدہ ہیئت میں۔ وہ بانکا سجیلا جوان، وہ صحت و تنومندی کا نمونہ، وہ حسن و جمال کا مجسّمہ اور عیش و تنعم میں پلا ہوا خوش باش انسان، آج افلاس، غربت اور مرض کے جانکاہ حملوں سے گھُن کی طرح پس چکا تھا میں سہ پہر کو جامع مسجد کے قریب گھوم رہا تھا کہ وہیں اُس کا جاں نثار ملازم جلال مل گیا۔ جس نے بتایا کہ آقا دہلی ہی میں ہیں۔ دہلی میں اَسلم کی غیر متوقّع موجودگی کی خبر سے میرے اعصاب میں مسرّت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ لیکن گذشتہ چند سال سے میں اُس کی اعتدال سے حد درجہ متجاوز اور بے انتہا تعیش میں ڈوبی ہوئی زندگی کے متعلق جو حکایات سُن رہا تھا۔ ان کے پیش نظر مجھے اُس سے

ملتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ جلال نے اپنی عمر بھر کی عقیدت و نیاز مندی کے آنسو، تشکر و امتنان سے لبریز آنسو جن میں حسرت و یاس جھلک رہی تھی، آنکھوں میں جمع کر کے مجھے بتایا کہ آقا ایک عرصے سے پھیپھڑوں کے ورم اور درد گردہ کے عوارض میں مبتلا ہیں اور آج کل احمد بائی کی سرائے میں بغرض علاج مقیم ہیں۔

"سرائے میں مقیم ہیں"؟ اب مجھے محسوس ہوا کہ ذلّت و نکبت کی وہ گہرائی، افلاس و غربت کا وہ عمق اور موت و ہلاکت کی وہ تباہی جس کی طرف اسلم بہ سرعتِ تمام بھاگا جا رہا تھا اُس کے سر پر آ پہنچی ہے۔ ہم ہر چیز سے بچ سکتے ہیں لیکن اُس نتیجہ سے کوئی مفر نہیں جو اسباب کی کڑیوں سے مل کر پیدا ہوتا ہے۔ اسلم کی گذشتہ زندگی کو پیہم بے اعتدالیوں کے مرقعے اور مسلسل گمراہیوں سے لبریز زندگی کو، جس میں وہ انجام و نتائج سے بے نیاز ہو کر تعیش کے راستے پر سرپٹ گھوڑے کی طرح دوڑ رہا تھا، اسی مقام پر منتج ہونا چاہیے تھا۔

کالج کے زمانے میں اسلم نے سیدھی سادی معاشرت، کفایت شعارانہ طرزِ حیات اور ضابطہ اخلاق کی پابندیوں سے محصور زندگی کو چھوڑ کر تعیش و اسراف کی راہ کیونکر اختیار کی، یہ ایک طویل داستان ہے جس کی تفصیل سے مَیں گریز کروں گا۔ جب وہ کالج میں داخل ہوا تو اُس کے سر سے باپ کا سایہ اُٹھ چکا تھا۔ اُس کی ماں نے جو ایک نہایت معزز و متدیّن خاندان سے تعلق رکھتی تھی

اُس کی تعلیم و تربیّت میں کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھا تھا۔ وہ خود بھی مذہب و اخلاق کا حامی، شعائرِ اسلامی کا پابند اور ایک طبّاع و ذہین نوجوان تھا۔ روپے پیسے کی طرف سے وہ حد درجہ فارغ البال اور خوش قسمت تھا۔ شہر کے اندرونی و بیرونی حصّے میں متعدّد عالی شان مکان اور خوبصورت بنگلے اس کی ملکیت تھے زرِ نقد بھی کافی اُس کے نام سے بنک میں جمع تھا۔ اس لئے جہاں تک زندگی کے عیش و آرام سے تعلق ہے اسلم اُن معدودے چند نفوس میں سے تھا۔ جن کے لئے فطرت نے اپنے دہن بستہ خزانوں کے منہ کھول دینے میں دریغ نہیں کیا۔

ایف اے تک وہ بالکل کولھو کے بیل کی طرح زندگی بسر کرتا رہا۔ گھر سے کالج اور کالج سے گھر۔ اُس کے روزمرّہ دستور العمل میں صرف دو ہی چیزیں شامل تھیں۔ کتبِ درسی کا مطالعہ اور اپنی ماں کی خدمت۔ میرے ساتھ اُس کے تعلقات نہایت خوشگوار چلے آرہے تھے اور جوں جوں وقت گذر رہا تھا اُن میں مزید استحکام پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ جب وہ بی۔ اے میں پہنچا تو یکایک اُس کی غیر معمولی ذہانت اور طبیعت کے جوش و خروش نے بھاپ کی طرح اُس کے دل و دماغ کو کھولانا شروع کیا۔ اُس کی ذہانت اپنے اظہار کے لئے وسیع تر میدان تلاش کرنا چاہتی تھی۔ اُس کی طبیعت کی جولانی روزمرّہ کے بے روح و بے ذوق دستور العمل کی قیود کو توڑ پھوڑ کر کسی پہنائے عظیم کی وسعتوں میں گم

ہو جانے کی آرزومند تھی۔ مطالعے سے زیادہ اب وہ مشاہدے کی طرف راغب تھا۔ اپنے قلب، و دماغ کی خلش کی تسکین کے لئے وہ بلا واسطہ دُنیا کا تماشا کرنے کا خواہشمند تھا۔ کتابوں کے رنگ دار شیشوں کے اندر سے وہ دُنیا کو دیکھ دیکھ کر تنگ آگیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس جہانِ رنگ و بو کو دوسروں کی آنکھوں سے نہیں بلکہ اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ نیکی بدی اور خیر و شر کے خود ساختہ ضابطوں اور اضافی معیاروں سے بلند ہو کر اپنی ذہانت و انفرادیت کی روشنی میں گناہ و ثواب کو پرکھے۔ وہ بڑے بڑے مصنّفوں سے تجربات کی بھیک مانگنا نہیں چاہتا تھا۔ اُس کی خواہش تھی کہ عظیم الشان تجربات . . . . کو اُن کی پُوری قیمت دے کر خریدے۔ وہ کتابوں سے اخذ کئے ہوئے خیالات کو اپنے لئے عار سمجھنے لگا تھا۔ اُسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ ایک بلند فطرت اور ہمہ گیر ذہانت کا مالک انسان ہے۔ اُس کی فطرت کی بلندی اور ذہانت کی ہمہ گیری کا تقاضا تھا کہ وہ زندگی کی پامال راہوں سے کنارہ کش ہو کر اپنے لئے جدید راہ بنائے اس تفحّص و تجسّس کے ساتھ ساتھ اُس کا جذبۂ شعریّت بھی بیدار ہو رہا تھا۔ وہ ایک طرف اپنے کرب و اضطراب کو دُور کرنے کے لئے جدید تجربات کا جویا تھا اور دوسری طرف اپنی تپشِ ناتمام کی پذیرائی کے لئے حُسن و موسیقی کا متلاشی۔ دن گذرتے گئے اور اُس کے جنوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ اُس کے خیالات

حد درجہ پریشان اور اُس کا مدعا و مقصود روز بروز مبہم ہوتا چلا گیا۔ اُس نے اپنے ذہنی انتشار کو الفاظ کے ذریعے سے ادا کرنا چاہا۔ لیکن اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ الفاظ اپنی قوتِ اظہار کھو بیٹھے ہیں اور زبان کے مروجہ قواعد اُس کے خیالات کا بوجھ اٹھانے سے معذور ہیں۔ اُس نے غایت دل شکنی کے ساتھ قلم ہاتھ سے رکھ دیا اور پھر خیالات کی بھول بھلیّاں میں گم ہو گیا۔ اُسے محسوس ہوتا تھا کہ یا تو وہ خود کوئی متاع گرانمایہ کھو بیٹھا ہے اور یا دُنیا کے اندر کسی چیز کی کمی ہو گئی ہے۔ وہ راتوں کو بے خواب اور دنوں کو وقفِ اضطراب رہ رہ کر اپنی صحت خراب کر رہا تھا۔ بعض اوقات وہ کوشش کرتا کہ اپنے عجیب و غریب خیالات کا تجزیہ کر کے کسی خاص نتیجے پر پہنچے لیکن جب وہ اپنے دل و دماغ کا جائزہ لیتا تو اُسے محسوس ہوتا تھا کہ اُس کے خیالات اس قدر پیچیدہ، دقیق اور ناقابلِ فہم ہیں کہ تحلیلِ نفسی کے تمام اصول اُن کا تجزیہ کرنے سے قاصر ہیں۔ اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ اپنی علمی بے مائگی کے باوجود وہ نفسیات میں ایک جدید باب کا اضافہ کریگا۔ وہ بتائے گا کہ نفس اور حواس کا تعلق منقطع کر کے ہم حواس کی قائم بالذّات ہستی کو برقرار رکھ سکتے ہیں۔ اور نفس کو متاثر کئے بغیر بھی حواس کی خواہشات کو سیراب کیا جا سکتا ہے۔ یہ نظریہ آہستہ آہستہ اُس کی رُوح پر حاوی ہوتا گیا اور اُسے ایک روز یقین ہو گیا کہ نفس اور حواس ایک دوسرے سے

بالکل بے نیاز ہو کر بھی اپنی ارتقائی جدّوجہد جاری رکھ سکتے ہیں۔ اُس کے دل و دماغ کی یہ کیفیت تھی جب قدرت نے ستم ظریف و بے بصر قدرت نے، اس کی راہ میں ایک ایسا انسان لا ڈالا جو حواس کی خواہشات کی تعمیل ہی کو تکمیلِ حیات سمجھتا تھا۔ پروفیسر شہباز حافظ و خیام کا دلدادہ، آسکر وائلڈ بائرن اور والٹر پیٹر کی قسم کے انسانوں کا مدّاح، اُسی کالج میں ملازم تھا جس میں اسلم پڑھتا تھا۔ شہباز ایک ذہین، خوبصورت، جامہ زیب اور قابلِ رشک طاقتِ لسانی کا مالک شخص تھا۔ کالج میں ادبیات کی تعلیم و تدریس کے فرائض اُس کے سپرد تھے۔ تاہل سے متنفر وہ اب تک تجرد کی زندگی بسر کر رہا تھا معقول تنخواہ پانے اور ذمہ داریوں کے بارِ گراں سے آزاد ہونے کی وجہ سے اُس کے اخراجات میں اسراف کا پہلو غالب تھا جب اسلم پہلے پہل اس شخص سے ملا تو اوّلیں ملاقات ہی میں اُس نے اُس کی آنکھوں کے عمق، زبان کی روانی، لباس کی تراش خراش اور خیالات کی نُدرت میں اپنے قلبی انتشار کا بہت کچھ مداوا پا لیا۔ ملاقات پر ملاقات ہونے لگی اسلم شہباز اور شہباز اسلم کے ہاں بازدید کے لئے جانے لگا۔ اور چند ہفتوں میں دونوں کے باہمی تعلقات اس قدر گہرے ہو گئے، گویا برسوں کے دوست ہیں۔

شہباز کی دوستی سے اسلم میں انقلابِ عظیم آ گیا۔ اُس کی زندگی کی جزئیات و تفصیلات تک میں شہباز دراتا ہوا گھس گیا۔ اُس کا لباس، اُس کا

اندازِ خیال، اُس کا طرزِ کلام، اُس کا اندازِ نشست و برخاست، اُس کے رہنے سہنے کے اطوار غرض کہ اُس کی زندگی کا کوئی پہلو نہ تھا جو شہباز کے اعمال و خیالات سے متاثر نہ ہوا ہو۔ وہ لباس میں زیادہ جدت پسند ہو گیا۔ اس سے قبل وہ صرف انگریزی لباس پہننا پسند کرتا تھا۔ لیکن اب وہ ہر روز کالج میں نئی قسم کے ملبوس میں آراستہ دیکھا جاتا تھا۔ آج سوٹ پہنا ہے تو کل حیدر آبادی طرز کا اچکن اور چست پاجامہ زیبِ تن کر رکھا ہے۔ ایک روز فراک کوٹ کے ساتھ افغانی طرز کی شلوار پہنی ہے تو دوسرے روز بنگالیوں کی طرح قمیص اور دھوتی پہن کر پھر رہا ہے۔ اُس کی تنوّع پسندی اور بوقلمونی نے اُسے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا دیا اور عام طلبہ زیادہ اشتیاق سے اُس کی حرکات کا مطالعہ کرنے لگے مجھ سے وہ روز بروز بعید ہوتا جا رہا تھا۔ کچھ عرصہ گذر گیا اور لوگوں میں چپکے چپکے اُس کے متعلق چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ اُس کی والدہ شاکی تھیں کہ وہ راتوں کو اکثر گھر سے باہر رہتا ہے۔ وہ خود بھی طالب علمانہ ذمہ داریوں کو زیادہ وقعت دینے کا عادی نہ رہا تھا اور زندگی کی اہمیتوں کا ذکر اس ہلکے پن سے کرتا تھا کہ جیسے اس کی نگاہ میں ان کی کوئی قدر و قیمت ہی نہیں۔ کالج میں آتا تو اُکھڑی اُکھڑی باتیں کرتا۔ کتابوں کی طرف متوجہ ہونا تو اس نے ترک کر دیا تھا۔ یہ تو خیر گذری کہ اُس کا سابقہ مطالعہ کافی تھا جس نے اس کی غیر معمولی ذہانت کے ساتھ مل کر اُس کا بھرم قائم رکھا ورنہ

جس بے دلی سے وہ کالج آتا اور جس بے رُخی سے وہ درس و تدریس کی طرف متوجہ ہوتا تھا وہ یقیناً اس قابل تھی کہ اُسے کالج سے جواب دے دیا جاتا۔ سہ ماہی امتحان میں وہ ناکام رہا اور لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ وہ ہونہار اور ذہین طالب علم جس نے ایف اے میں قابلیّت کی دھاک بٹھا دی تھی، اب بلندی سے پستی کی طرف بڑی سرعت سے گر رہا ہے۔ مَیں اُس کی تمام حرکات کو بغور دیکھ رہا تھا۔ ایک روز مَیں نے اُس سے پوچھا کہ "آخر تم نے یہ کیا وطیرہ اختیار کر رکھا ہے؟"

اُس نے حیرت سے جواب دیا "کون سا وطیرہ؟"

مَیں نے کہا "تمہیں پتہ ہی نہیں؟ کیا تم نہیں جانتے کہ تم اپنے تمام اوصافِ حسنہ آہستہ آہستہ ضائع کر رہے ہو؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ تمہاری وارفتہ مزاجی کی وجہ سے لوگ تم پر انگلیاں اُٹھاتے ہیں اور تمہاری آوارگی و اوباشی تمہیں تباہی کے اُس بحرِ موّاج کی طرف لئے جا رہی ہے۔ جس کے ایک ریلے سے تم پاش پاش ہو جاؤ گے؟ کالج کا ہر شخص اس عجیب و غریب تغیّر کو جو تمہارے اندر رونما ہوا ہے حیرت و اذیّت سے دیکھ رہا ہے اور تمہارے تمام خیر خواہ، جنہوں نے تم سے بہترین توقعات وابستہ کر رکھی تھیں، تمہاری طرف دیکھ دیکھ کر خون کے گھونٹ پی رہے ہیں۔ تم اپنی والدہ کو دیکھو جس کے احسانات کی زنجیروں سے تمہارا رواں رواں بندھا ہوا

ہے۔ تمہارے موجودہ رویّے نے اُس محترم خاتون کے دل میں ناسور ڈال دیئے ہیں اور وہ محض محبّتِ مادری کی وجہ سے خاموش ہے ورنہ اُس کا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔"

اُس نے ذرا کبیدہ خاطر ہو کر جواب دیا۔ "تم کس چیز کو میری آوارگی و اوباشی سے تعبیر کرتے ہو اور مجھے بتاؤ کہ میرے اندر کون سا عجیب و غریب تغیّر رونما ہوا جس کو دیکھ دیکھ کر میرے خیر خواہ خون کے گھونٹ پی رہے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "تفصیل کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ تم رات کو کہاں رہتے ہو؟ طالب علم ہونے کے باوجود تم مطالعہ اور کالج کے دیگر علمی مشاغل کی طرف سے کیوں بے پروا ہو گئے ہو؟ تم لباس کے جتنے نمونے چاہو استعمال کرو لیکن خواہ مخواہ اپنے آپ کو اضحوکہ بنانے سے کیا حاصل؟ لوگوں نے تمہیں اکثر ایسے ہوٹلوں اور قہوہ خانوں میں جاتے دیکھا ہے جہاں صرف شرابخوروں اور کوکین کھانے والے اوباش مزاج لوگوں ہی کا دخل ہے تم متعدد بار اُن بالاخانوں میں بھی دیکھے گئے ہو جہاں کوئی شریف آدمی جا کر اپنی عزّت و شرافت کو مجروح کرنا گوارا نہ کریگا۔ تمہیں معلوم ہے تم ان چند ماہ میں اتنا روپیہ خرچ کر چکے ہو کہ وہ تمہاری آئندہ سہ سالہ تعلیم کے لئے کافی تھا۔ اگر تمہارے یہی اللّے تللّے رہے تو یہ جائداد چند سال کی مہمان ہے

میں دیکھتا ہوں جب سے تم نے پروفیسر شہباز سے ربط و ضبط بڑھایا ہے تمہاری حالت کچھ سے کچھ ہوتی جارہی ہے۔ میں شہباز صاحب کی عزّت کرتا ہوں کہ وہ ہمارے اُستاد ہیں لیکن تمہیں معلوم ہے اُن کی خانگی زندگی ہمیشہ محلِ اعتراض رہی ہے اور ایک دُنیا اُن کو نام دھرتی ہے پھر ایسے شخص سے میل ملاقات بڑھانے سے فائدہ ؟ میں جانتا ہوں شہباز صاحب بڑے لسّان اور جادو بیان ہیں۔ اور اُنہیں یہ ملکہ حاصل ہے کہ اپنی طلاقتِ لسانی سے گناہ کو ثواب اور ثواب کو گناہ بنادیں۔ لیکن ہم ابھی طالب علم ہیں۔ ہمارے دماغ غیر پختہ اور دل خام ہیں۔ ہمیں چون وچرا میں پڑنے کے بجائے آرام سے اپنے درسی مشاغل میں منہمک رہنا چاہیے۔"

وہ کہنے لگا۔ "تم کیسی عجیب باتیں کرتے ہو۔ اگر کوئی اور شخص مجھے اس طرح مخاطب کرتا تو شاید میں درگذر بھی کردیتا لیکن تم سا واقف کار اور ذہین آدمی یوں گفتگو کرے، میں برداشت نہیں کرسکتا تم بھی آخر عام دُنیاداروں کی طرح تنگ نظر اور متعصّب ہی نکلے۔ یہ کس قدر حماقت ہے کہ تم نوعِ انسان کو دو حصّوں میں تقسیم کرکے ایک کو نیک اور دوسرے کو بد کا خطاب دے دیتے ہو۔ یاد رکھو کوئی انسان نیک نہیں ہے اور کوئی انسان بد نہیں۔ نیک و بد انسانوں کو اس طرح تقسیم کردینا گویا دونوں طبقے علیحدہ علیحدہ جہانوں کے رہنے والے ہیں حقائق سے چشم پوشی کرنا ہے۔

ہر انسان نیک بھی ہے اور بد بھی ہے۔ بد سے بد تر انسان کے اندر بھی نیکی کی چمک موجود ہوتی ہے۔ اور نیک سے نیک شخص بھی اپنے قلب و دماغ میں کہیں نہ کہیں بدی کے جراثیم رکھتا ہے۔"

مَیں چلّا اُٹھا۔ "آہ! یہ سب تم نے شہبازؔ سے سیکھا ہے۔"

"شہبازؔ کو کیوں بدنام کرتے ہو۔ وہ حقیقتاً نیک آدمی ہے۔ اُس کی نیکی ہر تعریف سے بالاتر ہے۔ علم سب سے بڑی نیکی ہے اور علم صرف تجربات کے ذریعے سے حاصل ہوتا ہے۔ اُس نے مجھے ایسا علم سکھایا ہے جو کتابوں کی نقلی روایات پر نہیں بلکہ حقائق پر مبنی ہے۔ ایسے حقائق جنہیں میں دیکھ سکتا ہوں، سُن سکتا ہوں، چکھ سکتا ہوں، مس کر سکتا ہوں۔ اُس نے میرے حواس کو اوہام کی زنجیروں سے آزاد کر کے میرے سامنے علم و عرفان کی دُنیا کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ مَیں اب تک مانگی تانگی، مستعار زندگی بسر کرتا چلا آ رہا تھا۔ میرے خیالات میرے خیالات نہ تھے۔ میرے حسّیات میرے حسّیات نہ تھے۔ مَیں دوسروں کی آواز کی بازگشت تھا۔ مَیں ایک ایکٹر تھا۔ مَیں اُس طوطے کی طرح تھا جو مالک کے رٹائے ہوئے سبق کو دُہرانے کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ شہبازؔ نے مجھے چراغ کی روشنی سے نکال کر آفتاب عالمتاب کے نورِ جہاں سوز کے سامنے لا کھڑا کیا۔ شہبازؔ نے مجھے شبابِ جاوداں کا راز بتا دیا۔ اب

مَیں ہمیشہ جوان رہونگا۔ مَیں پیری اور کہولت کی لعنتوں کا شکار ہونے سے بچ جاؤنگا۔ تمہیں معلوم ہے جوانی کا راز کیا ہے؟ جوانی نام ہے اُمید، بے قراری، اضطراب، کشمکش اور کربِ پیہم کا اور بڑھاپا نام ہے سکون، یاس، انجماد، برودت اور سکوتِ کامل کا۔ ہمیشہ نئے احساسات کی تلاش میں رہو اور تم جوانی کا راز پالو گے۔ اپنے احساسات پر کہولت طاری نہ ہونے دو اور تم بڑھاپے کا شکار ہونے سے بچ جاؤ گے۔ کسی چیز کو زندہ رکھنے کا راز یہی ہے۔ کہ اُس میں جدّتیں پیدا کی جائیں۔ اگر تمہارے احساسات ایک ہی محور کے گرد چکّر لگا رہے ہیں اور تم ان میں تنوّع پیدا کرنے سے معذور ہو تو سمجھ لو کہ تم پر ذہنی، دماغی اور روحانی موت وارد ہو چکی ہے۔ پیری دل و دماغ کی ایک خاص کیفیّت کا نام ہے جس میں اشتہا کی بجائے سیری اور حرکت کی بجائے سکون کا عنصر حاوی ہوتا ہے۔ اگر تم کسی نفسیاتی طریق سے سیری کو پھر اشتہا اور سکون کو پھر حرکت میں تبدیل کر دو تو گویا تم شباب رفتہ کو نئے سرے سے حاصل کر لوگے شباب رفتہ کے حصول کے لئے ہزاروں ادویہ اور سینکڑوں کیمیاوی طریقے ایجاد کئے جا رہے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس مہم کی فتح کا سہرا اطبّا نہیں بلکہ ماہرینِ نفسیات کے سر ہوگا۔ وہ وقت آنے والا ہے جب ہم ہر مادی انقلاب کے لئے نفسیّات سے استمداد کریں گے۔

احساسات کی تلاش میں تمہیں نیکی اور بدی کی خود ساختہ اور مروّجہ قیود سے آزاد ہونا پڑے گا۔ وہ شخص جو اپنے قلب و دماغ کو نشۂ شباب سے ہمیشہ مخمور رکھنا چاہتا ہے ہرگز ایک منزل پر قیام نہیں کر سکتا۔ منزل کی دُوری قدموں میں سرعت اور دل میں ولولے قائم رکھنے کی کفیل ہے۔ منزل پر پہنچ کر نہ قدموں میں تیزی رہتی ہے اور نہ دل میں جوشِ عمل۔ اسی انحطاطِ تموّج : فقدانِ جوش سے حواس پر غنودگی طاری ہوتی ہے جسے بڑھاپا، پیری، موت مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ہمیں خود اپنی منزلِ مقصود کا پتہ نہیں۔ انسان ازلی و ابدی حیات کا مالک ہے۔ وہ لاتنا ہی زندگیوں میں سے گذر گذر کر تکمیلِ نفس اور عرفانِ روح کے مراحل طے کر رہا ہے۔ تکمیلِ نفس کی غرض سے ہمارے لئے ہر واقعہ اور ہر تجربہ یکساں اہمیت رکھتا ہے۔ جو شخص رُوح کا عرفان اور نفس کی تکمیل چاہتا ہے۔ اُس کے لئے رنج و مسرت ایک ہی چیز کا نام ہے۔ وہ بیماری اور صحت کے ایک ہی معنی لیتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ دنیا کا ہر واقعہ، خواہ وہ معمورِ زُہد و توّرع ہے یا لبریز معصیت و مصیبت، ایک ہی منزل کی طرف رہنمائی کر رہا ہے۔ اُس کی نگاہ میں نیکی بدی، گناہ ثواب، افلاس تموّل کی تمیز اُٹھ جاتی ہے۔ یہ سب مختلف راہیں ہیں۔ جن پر سے گذر گذر کر اُسے وہ چیز حاصل کرنا ہے جس کے لئے انسانیت بے تاب ہے۔ شعوری یا غیر شعوری

طور پر ہم میں سے ہر شخص ایک ہی منزل کی طرف جا رہا ہے۔ وہ منزل تکمیلِ نفس ہے۔ جو لوگ اس راز سے واقف ہیں وہ کامیابی و ناکامی پر یکساں مسرور ہیں، اُن کی نگاہ میں عیب عیب ہے نہ نیکی نیکی۔ وہ ہر تجربے کو مقصودِ حیات پا لینے کا وسیلہ سمجھتے ہیں اور وہ لوگ جن کا شعور و ادراک ابھی پختہ نہیں ہوا جنہیں تخلیقِ انسانی کی غرض و غایت سے آگہی نہیں اور جو اضافی معیاروں اور ہنگامی نقطہ ہائے نگاہ کی قید میں پھنسے ہوئے ہیں کامیابی کے وقت پھولے نہیں سماتے اور ناکامی پر چیخیں مارتے ہیں۔ تم نے اکثر بیمار و منحنی اشخاص کو دیکھا ہوگا۔ جو بہترین مقوی غذائیں کھانے کے باوجود مریض و ناتواں چلے جاتے ہیں اور ایسے افراد بھی تمہاری نظر سے گذرے ہونگے جنہیں دو وقت کی روٹی بآسانی میسّر نہیں لیکن اس کے باوجود نہایت تندرست، صحت ور اور مضبوط جسم کے مالک ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیمار انسانوں کے اندر خاص قسم کی سمّیت ہوتی ہے جو صاف ستھری اور صحت بخش غذاؤں کو بھی جزوِ بدن بننے نہیں دیتی اور تندرست جسم کے اندر حیات افزا مادہ موجود ہوتا ہے جو نانِ جویں تک کے تمام اجزاء کو بھی صحت و قوّت میں تبدیل کر کے خونِ صالح اور گوشت پوست پیدا کرنے کا باعث ہو جاتا ہے۔ یہی اصول جو طبیعیات کی دُنیا میں رائج ہے نفسیات پر بھی حاوی ہے۔ ایک تندرست نفس گناہ اور نیکی دونوں کے تجربات لے کر انہیں اپنی طاقت، قوّت اور غذا میں

تبدیل کرکے زندگی کی حرارت پیدا کر لیتا ہے لیکن ایک ایسا نفس جو بیمار و کمزور اور مضمحل و پریشان ہے جوش و مسرت کے تجربات کو بھی غم و اندوہ اور کمزوری و ناتوانی میں تبدیل کر لیتا اور اپنی بچی کھچی توانائی تک ضائع کر بیٹھتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرے اندر ایک مضبوط، تندرست اور توانا نفس ہے اور مَیں دُنیا کے بدتر سے بدتر تجربے کو بھی اپنے نفس کی تکمیل اور اپنی رُوح کے عرفان کا باعث بنا سکتا ہوں۔ اس لئے میرے سامنے اعمال و افعال کی وہ تقسیم جسے تم گناہ و ثواب یا نیکی بدی سے تعبیر کرتے ہو بالکل مہمل اور بے معنی ہے۔"

مَیں نے کہا اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم ہر گناہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے جاؤ گے اور ترغیب و تحریص یا آزمائش کا مقابلہ کرنا چھوڑ دو گے۔"

"عزیز دوست، آزمائش سے مغلوب ہونا ہی آزمائش پر غالب آنا ہے۔ تم میری بات سے گھبرا کیوں اُٹھے۔ مَیں ابھی اس کی توضیح کئے دیتا ہوں۔ لاکھوں انسان ذہنی طور پر گناہ کرتے ہیں۔ اُن کے دل میں ہر وقت اقدامِ گناہ کی خواہش رہتی ہے لیکن جراءتِ عمل نہ ہونے کی وجہ سے وہ ارتکابِ گناہ نہیں کر سکتے۔ اِن کے اندر فاسد خیالات بغیر کسی روک ٹوک کے جمع ہوتے رہتے ہیں لیکن اُس مواد کے باہر نکلنے کا کوئی سامان نہیں ہوتا۔ چنانچہ اُن کے

دل و دماغ ہمیشہ کے لئے مسموم ہو کر رہ جاتے ہیں اور ترغیب اُن کے لئے ہمیشہ ترغیب، آزمائش ہمیشہ آزمائش اور تحریص ہمیشہ تحریص بنی رہتی ہے۔ گناہ کا خیال کرتے رہنے سے گناہ کا ارتکاب کر لینا بہتر ہے تاکہ زہریلا مادہ جلد از جلد دل و دماغ سے نکل جائے جس طرح تمام عظیم الشان کام پہلے پہل دماغ میں ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں اسی طرح عظیم الشان گناہ بھی دماغ ہی میں جنم لیتے ہیں۔ ارتکاب گناہ سے سم آلود خیالات کا مواد دل و دماغ سے نکلجاتا ہے اور گناہ میں کوئی خاص جاذبیت باقی نہیں رہتی۔ ایک چیز اُسی وقت تک دلچسپ ہے جب تک ہماری دسترس سے باہر ہے۔ گناہ کر لینے کے بعد گناہ ہمارے لئے اپنی رنگینی و دلچسپی کھو بیٹھتا ہے اور جب اُس کی جاذبیت ہی فنا ہو گئی تو بتاؤ آزمائش کہاں رہی؟"

مَیں نے کہا۔" اسلم، مَیں جانتا ہوں جو کچھ تم زبان سے کہہ رہے ہو دل سے نہیں مانتے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تم ایک ادیب اور شاعر بن کر نفسیات کے دریا بہا رہے ہو۔"

"معاف کرنا مَیں ادیب نہیں ہوں۔"

"تم کیا ہو؟"

"مَیں ادیب سے بڑھ کر کچھ اور ہوں۔"

"تم شاعر ہو؟"

"مَیں شاعر ہُوں لیکن اس سے سوا کچھ اور بھی ہُوں۔"

"آخر تم کیا ہو؟"

"مَیں زندگی کا نقّاد یعنی حیاتِ انسانی کا مبصّر ہُوں۔"

وہ تمرّد و سرکشی کی موجوں پر سوار، گناہ کی نت نئی تاویلیں کر کر کے، اپنے نفس کو فریب دیتا ہوّا روز بروز آگے نکلتا گیا۔ اُس نے چاہا، یا کم از کم اپنے آپ کو اور ساتھ ہی دُنیا کو فریب دینے کے لئے چاہا، کہ وہ نفس کو متاثر کئے بغیر حواس کی خواہشات کی پذیرائی کریگا۔ لیکن اُسے معلوم نہیں تھا کہ حواس کی دُنیا میں خفی سے خفی تحریک اور نامعلوم سے نامعلوم حرکت بھی ایسی نہیں جس کا ردِّعمل نفس کی دُنیا میں موجود نہ ہو۔ عالمِ خارجی میں ایسا کوئی واقعہ ظہور پذیر نہیں ہوتا جس کے بالمقابل نفس کا کوئی نہ کوئی تار کھنچ کر نہ رہ جاتا ہو پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ اپنے عجیب و غریب فلسفہ کی تائید میں حواس کو تو شعلوں کے سپرد کر دیتا اور نفس اُس کی سیاہ کاریوں اور آتش فشانیوں کے اثرات سے مبرّا و منزّہ رہتا۔ وہ روز بروز اُس دلدل میں جس کے عمق کو آج تک کوئی نہیں پہنچ سکا دھنستا چلا گیا۔ کچھ عرصہ تو وہ یقیناً پروفیسر شہباز کی رہنمائی کا محتاج رہا۔ لیکن جب نشہ قوی ہو جائے تو ساقی کی محتاجی بھی ختم ہو جاتی ہے اور میخوار خود ہی قدح و سبو بھر بھر کر خالی کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اب وہ

خود سر و آزاد ہو کر، بلا خوف و خطر، جی کھول کر دادِ عشرت دے رہا تھا۔ شراب نوشی کی کثرت سے اُس کا چہرہ ہر وقت سُرخ رہنے لگ گیا تھا۔ اُس کی آنکھیں جو اُس کے چہرے کے تمام دیگر اعضا سے زیادہ خوبصورت تھیں اب باہر کی طرف اُبلی پڑتی تھیں اُس نے شہر والا مکان ترک کر کے شہر سے باہر ایک خوبصورت بنگلے میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ دولت کے بے تحاشا خرچ نے اُسے شہر کے تماشبینوں کی صفِ اول میں لا کھڑا کیا تھا اور اب گویا اسلم کا لفظ معمودِ ذہنی تھا تعیش، اسراف، بدکاری اور بے حیائی کا۔ اس زمانے کا سب سے حیرت انگیز اور پُر لطف واقعہ یہ ہے کہ وہ اب تک کالج آتا اور طلبہ میں بیٹھ کر اپنے آپ کو طالب علم سمجھتا تھا۔ دُنیا کی حیرت و استعجاب کی کوئی حد نہ رہی جب وہ بایں حالت بی اے کے امتحان میں شریک ہوا اور کامیاب ہو گیا۔

بی اے کے بعد اُس نے طالب علمی کی زندگی کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دی اور اس طرح اُس کے اعمال و افعال پر جو تھوڑی سی پابندی تھی وہ بھی غائب ہو گئی۔ وہ کچھ مدت کے لئے لاہور سے باہر چلا گیا اور ہندوستان کے مختلف شہروں کا چکر لگاتا رہا۔ واپس آیا تو اُس کی ماں نے اپنے گھر بہو لانے کی خواہش ظاہر کی اور کہا کہ تمہاری شادی کا بندوبست کرنا چاہتی ہوں لیکن اسلم جن کوچوں کی سیر کر رہا تھا اور جس قماش کی زندگی بسر کرنے کا عادی

ہو چکا تھا۔ اُس کے پیشِ نظر اس تجویز کا قبول کر لینا اُس کے لئے نا ممکن تھا۔
اُس نے شادی سے انکار کر کے اپنی بوڑھی ماں کا دل توڑ دیا اور اُس بدقسمت
خاتون کو اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ صبح سے شام تک اپنے اکلوتے لختِ جگر
کی بربادی کا دلخراش منظر دیکھتی رہے۔ اُس کی ماں اس واقعہ کے بعد زیادہ
دیر زندہ نہ رہ سکی، اور دل میں ہزاروں حسرتیں اور غم کے لاکھوں نشان لیکر
جہانِ فانی سے رخصت ہو گئی۔

میرے اور اسلم کے تعلقات بظاہر ختم ہو چکے تھے۔ مہینوں گذر
جاتے اور ہم ایک دوسرے کی شکل نہ دیکھتے تھے لیکن اس کی والدہ کے
حادثۂ ارتحال سے متاثر ہو کر میں اُس کے پاس اظہارِ تعزیت کے لئے
گیا۔ اُس کے مکان کا ایک ایک چپہ ہوسناکی و سیاہ کاری کی عجیب و غریب
داستانوں کا مرکز تھا۔ اُس کی دیواریں ایسے ایسے شرمناک رازوں کی حامل
تھیں کہ اگر وہ بیک وقت دُنیا پر منکشف ہو جاتے تو شاید سماج اپنے
روایتی تجاہل اور اپنی غفلت و درماندگی کے باوجود اُس شخص کو سنگسار کرنے
پر مجبور ہو جاتی۔ اسلم اور اس کے حواریوں نے چُن چُن کر شہر کی شریف زادیوں
کو خراب کیا تھا۔ کوئی قابلِ ذکر گھرانا نہ تھا جس کو اسلم نے داغدار نہ کیا ہو۔
دولت ہمیشہ اُس کے عیبوں کی پردہ پوش رہی اور وہ ہر شخص کا جس سے
اُسے معمولی سے خطرہ کا بھی امکان ہوتا، مُنہ بھر کر لوگوں کی زبان پر طلائی

قفل چڑھا دیتا تھا۔ میرا مدعا محض اُس کی والدہ کی رحلت پر اظہار افسوس کرنا تھا۔ لیکن باتوں باتوں میں کئی قصّے چھڑ گئے۔ اسلم کو شکایت تھی کہ کہ مَیں نے اُس سے ملاقات ترک کر دی ہے۔ مَیں نے جواب میں صرف اتنا کہا کہ "میرے تمہارے راستے مدّت سے الگ ہو چکے ہیں۔ تمہاری پرواز آسمانوں پر ہے اور مجھ سا بے بال و پر انسان بھلا کیونکر تمہارا ساتھ دے سکتا ہے۔ جو شخص فکرِ معاش سے پاک اور مستقبل کے اندیشوں سے آزاد ہو وہ تمہاری طرح خود فراموشی کی زندگی بسر نہ کرے تو کیا کرے۔ تم مجھے مطعون کرتے ہو کہ مَیں نے میل ملاقات ترک کر دی ہے حالانکہ اگر تم واقعات پر دیانتداری سے غور کرو تو اس بات سے انکار کی گنجائش ہی نہیں کہ جو کچھ ہوا اُس کی تمام تر ذمہ داری تم پر عائد ہوتی ہے۔ ع

خدا کا شکر ہے پہلے محبت آپ نے کم کی

تمہارے لیل و نہار جس رنگ میں گذر رہے ہیں اس میں بحالاتِ موجودہ میرا شرکت کرنا ممکن نہیں ہے۔ مَیں دوست کو ڈوبتا دیکھ کر اگر دستِ اعانت دراز نہیں کر سکتا تو اُس کی غرقابی کا نظارہ دیکھنے سے بھی معذور ہوں۔ تم آج دولت اور شباب کے نشہ میں مخمور ہو اور نہیں جانتے کہ آسمان جب اپنا ترکش خالی کرنے پر آتا ہے تو ایک تیر بھی باقی نہیں رکھتا۔ تم اپنی والدہ کے انتقال سے کچھ عبرت اور سبق حاصل کرو۔ اُس کی موت کی سب سے قوی وجہ

تمہاری موجودہ طرزِ زندگی ہے۔ یاد رکھو ہر انسان کا یہی حشر ہونے والا ہے۔ موت مقدّراتِ انسانی میں داخل ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے کیونکر یاور کر لیا ہے کہ تم اُس سے مستثنیٰ قرار دیئے جاؤ گے؟"

وہ کہنے لگا۔ "میں کب کہتا ہوں کہ میں موت جیسے اٹل، غیر متبدّل اور یقینی قانون سے مستثنیٰ قرار دیا جاؤنگا؟ یقیناً میرا بھی وہی حشر ہو گا جو عام انسانوں کا ہوتا ہے لیکن میں حیات بعد الموت کے چند پہلوؤں کے متعلق تم سے مختلف خیال رکھتا ہوں:- موت ہماری زندگی کا خاتمہ نہیں کر دیتی بلکہ زندگی تو ایک غیر منقطع و غیر مختتم تسلسل ہے۔ ہم موت کے دروازے سے داخل ہو کر زندگی کے ایک بے پایاں اور وسیع تر میدان میں جا نکلتے ہیں میرا عقیدہ ہے کہ وہاں کی کشمکش موجودہ کشمکش سے زیادہ تیز اور وہاں کا ہنگامۂ رستخیز موجودہ ہنگاموں سے زیادہ قوی ہو گا۔ چونکہ ہماری موجودہ و آئندہ زندگی میں ایک تسلسل اور رابطہ ہے اس لئے ہمارے موجودہ احساسات و ادراکات اور ہمارے محسوسات و اعتقادات وہاں بھی ہمارا ساتھ دیں گے۔ ہمارا جسم خاک میں مل جائے تو مل جائے لیکن ہماری روحیّت و معنویّت، کہ انسان در اصل اسی چیز سے تعبیر ہے، فنا نہیں ہو گی۔ اور موت کے بعد اپنی تکمیل کے لئے جد و جہد کی نئی نئی منزلیں طے کرتی رہے گی۔ وہاں غالباً جسم کی قید نہ ہو گی اس لئے شروع سے اخیر تک روحانی تصرفات ہی کار فرما ہوں گے۔ میں

اکثر سوچتا ہوں کہ جس طرح یہاں ہمیں تکمیلِ نفس کے لئے اہرمن و یزداں کی جنگ میں شامل ہونا پڑتا ہے اسی طرح وہاں بھی گناہ اپنی تمام دلفریبوں اور جاذبیّتوں کے ساتھ دامِ تزویر پھیلائے بیٹھا ہوگا۔ جس طرح یہاں نیکی اور بدی آپس میں دست و گریباں ہو رہی ہیں وہاں بھی ان کی جنگ و جدال جاری ہوگی۔ مذہب اور اخلاق کہتے ہیں کہ گناہ انسان کو نیکی کے راستہ سے بھٹکاتا ہے۔ اگر یہ دعوےٰ صحیح ہے تو یقیناً حیاتِ اُخرویٰ میں بھی گناہ ورغلانے کو موجود ہوگا۔ ہم گناہ صرف لاعلمی کی وجہ سے کرتے ہیں۔ علم کی مشعل ہماری شاہ راہِ حیات کو روشن کر کے راستے کے تمام نشیب و فراز واضح کر دیتی ہے اور ہم کنوئیں میں گرنے یا کانٹوں سے پاؤں لہولہان کرنے سے بچ جاتے ہیں۔ علم سب سے بڑی نیکی ہے اور صحیح علم صرف تجربات کی آگ میں کُودنے ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ پھر ہم کیوں نہ یہیں گناہوں سے فارغ ہو جائیں تاکہ حیاتِ بعد الموت میں جب ہم دوبارہ زندگی کی کشمکش میں مصروف ہوں اور گناہ سے سابقہ پڑے تو وہ ہمارے لئے اپنی تمام دلکشی، تمام دلفریبی اور تمام جاذبیّت کھو چکا ہو اور نہایت آسانی سے اُس کی طرف سے دامن جھٹک کر اپنے آپ کو ہمہ تن نیکی کی تحصیل میں وقف کر دیں؟"

اسلم اپنی تقریر ختم کر چکا تو میں خدا حافظ کہہ کر وہاں سے اُٹھ آیا۔

مَیں سمجھ گیا تھا کہ وہ ایک خطرناک، گھناؤنے اور دقیق روحانی مرض میں مبتلا ہے جس میں کوئی دوا کارگر نہ ہوگی۔ پھر میں دوبارہ اُس سے نہ ملا۔ تاآنکہ قدرت نے پُر پیچ حالات کے اندر مجھے اُس سے دہلی میں احمد پائی کی سرائے میں یک جا کر دیا، درحالیکہ وہ مختلف جسمانی عوارض میں مبتلا، افلاس و غربت کے جانکاہ مصائب میں گرفتار، زندگی کی آخری گھڑیاں پوری کر رہا تھا۔

ایک شام

شام کا وقت تھا۔ ہلکا سا مینہ برس کر آسمان کا رنگ نکھر گیا تھا۔ مَیں اپنے کلبۂ احزاں سے باہر، دریا کے کنارے، اُفقِ بعید میں ڈوبنے والے سُورج کی موت کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ آفتاب کی آخری شعاعیں درختوں کے گنجان پتّوں میں سے چھن چھن کر سطحِ آب کو زرّیں بنا رہی تھیں اور پانی کی ننّھی ننّھی لہریں مستانہ وار رقص کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں۔ بادلوں کے چند پریشان ٹکڑے، جادۂ مستقیم سے بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح آسمان پر اِدھر اُدھر چکر لگا رہے تھے۔ میرے سامنے سرسبز لہلہاتے کھیت کسان کی شبانہ روز محنت اور جانفشانی کی زندہ شہادت پیش کر رہے تھے۔ اِن سے بہت دُور، جہاں زمین آسمان ملتے معلوم ہوتے ہیں، درختوں کی لمبی قطار شام کے دھندلکے میں ایک نیلی سی لکیر نظر آ رہی تھی مگر دوپیش کا یہ نظارہ میرے دل میں ماضی کی خوابیدہ یاد کو بیدار کر رہا تھا جب اسی دریا کے کنارے، اسی جھونپڑی کے سامنے، ایسی ہی

شام کو مَیں اور وہ اکٹھے تھے۔ اُن کا قرب حاصل تھا اور میرے ایّامِ حیات کھلے ہوئے پھُول کی مانند شگفتہ تھے۔ قدرت کے دلفریب مناظر، جو آج میرے دلِ افسردہ میں اِک ہُوک پیدا کر دیتے ہیں، اُن کی معیّت میں، اُن کے عکس جمال سے حُسن و رعنائی سے لبریز نظر آتے تھے۔ دریا کا یہ ساحل میری ہزاروں آرزوؤں کا مرقد ہے جہاں مَیں زندگی کے بقیّہ دن ایک پریشان خواب میں گذار رہا ہوں کہ شاید جاگنے پر میری گم شدہ مسرّت مجھے واپس مل جائے۔ یہ سبزہ زار، یہ شاداب و پُر فضا میدان، یہ خنک ہوا کے جھونکے اُس طلسمی عہد کی یادگار ہیں جب دُنیا و مافیہا سے بے خبر، اُن میں جذب ہو کر، میں، گویا ایک نشے کی حالت میں، ایک سرور کے عالم میں، وہی دیکھتا تھا جو وہ مجھے دکھاتے تھے اور وہی کرتا تھا جس کا مجھے حکم دیتے تھے۔ آہ، میرے تخیّل کی ملکہ! دیکھ کہ میرا دل اُن خوش نصیب ذرّوں کی یاد میں جو تیری رُوح افروز محبت کے سائے میں کٹے کس طرح آٹھ آٹھ آنسو رو رہا ہے۔ میرا سینہ جو تُو نے عشق کی پاکیزہ کرنوں سے معمور و منوّر کر دیا تھا اب تیری محبت کی سُنہری روشنیوں کے گُل ہو جانے سے تاریک ہو رہا ہے۔ تجھے کیا معلوم کہ میرے لیل و نہار کس پژمردگی کے عالم میں بسر ہو رہے ہیں۔ سیکڑوں بادل آئے اور برس گئے۔ ایسی کتنی برساتیں آئیں اور گذر گئیں۔ سبزہ خُشک ہوا اور پھر ہرا ہو گیا مگر تیرا

انتظار بدستور قائم رہا۔

چاندنی راتوں میں جب چاند بے نقاب ہو کر اپنے نور کی سپید چادر دریا کے نیلگوں پانی پر بچھا دیتا ہے۔ جب مشرق سے نور کی ایک خاموش لہر اٹھتی ہے اور کائنات ہلکے ہلکے اس میں تحلیل ہونا شروع ہو جاتی ہے، اور جب فضائے علوی میں نیک ارواح آسمانی راگنیاں چھیڑتی ہیں تو میرا دماغ ان تاثرات سے مسحور ہو کر اُس رات کی یاد زندہ کر دیتا ہے۔ جب پہلی مرتبہ، ہاں پہلی مرتبہ، مَیں نے تیرے حضور، بصد عجز و انکسار ہدیۂ نیاز پیش کیا تھا۔ چاند تب بھی اپنی ضیا پاشی میں مصروف تھا۔ اُس کی نورانی کرنیں تیرے چہرے پر پڑ رہی تھیں، اور میں کیا بتاؤں کہ اُس وقت تو کیا معلوم ہو رہی تھی۔ ایک بے خودی کے عالم میں، اِک خود فراموشی کی حالت میں، میری نظریں تیری جادو بھری آنکھوں کو، جن میں ایک کشش تھی، جس سے شاید تو بھی آگاہ ہو، اور جس سے میرا رواں رواں تیری جانب کھنچا جا رہا تھا، تک رہی تھیں۔ مَیں نے ہزار کوشش کی کہ عرضِ مدعا کے لئے زبان کھُلے مگر، جیسا کہ تُو نے محسوس کیا ہو گا، میرا چہرہ ہی کیفیاتِ قلبی کا بہترین ترجمان تھا۔ میرا قلب زور زور سے دھڑک رہا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی تیز دھڑکن اپنی آخری جنبش کے ساتھ

مجھے ہمیشہ کے لیے ساکن و خاموش کر دے گی۔ تُو استغنا کے عالم میں دریا کی ہلکی لہروں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ تیرے لبوں کا پُر اسرار تبسّم مجھے ہمّت دلا رہا تھا کہ اپنا حالِ دل تیرے سامنے منکشف کروں، اپنے شکستہ دل کے ٹکڑے تیرے قدموں پر نثار کر دوں کہ شاید اُن کی قبولیّت کا وُہی مقام ہو کہ تُو نے میری طرف مُنہ پھیرا اور تیری نگاہوں نے بتا دیا کہ اُن میں رحم بھی ہے، شفقت بھی ہے، عفو بھی ہے اور وہ جذبہ بھی ہے جو ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑ سکتا ہے۔

مگر

اب تو وہ طلسم ہی ٹوٹ گیا۔ کیف و سرور جاتا رہا اور حقیقت کی تلخ کامیوں نے مجھے اپنا شکار بنا لیا۔ یہ کیا زندگی ہے جس میں مَیں اب اپنے دن پُورے کر رہا ہُوں۔ آرزوئیں پیدا ہوتی ہیں اور اظہار سے پہلے ہی خاک میں مل جاتی ہیں۔ خیالات دل و دماغ کو محشرستان بناتے ہیں۔ لیکن تم تک پہنچنے سے قبل اندر ہی اندر مر جاتے ہیں۔ وُہ آستانۂ ناز کہاں رہا جہاں میرے عجز و نیاز اور جنون و شیفتگی کو جبیں فرسائی کا افتخار حاصل ہو سکے۔ تم ہی بتاؤ یہ کوئی جینا ہے؟ مَیں نے ایک خواب دیکھا تھا جو پُر لطف تھا۔

اب ہر چند آنکھیں بند کرتا ہوں وہ نظارہ نظر نہیں آتا اُس رات کا سماں میرے ذہن سے کبھی نہیں اُتر سکتا جب گھنگور گھٹائیں آسمان پر چھا رہی تھیں۔ تھوڑی تھوڑی پھوار پڑ رہی تھی، اور رعد کی گرج سے تیرا ننھا سا دل لرز رہا تھا۔ مَیں باہر سے آیا تو تو نے اپنے نرم و نازک ہاتھ میرے ہاتھوں میں دے دیئے۔ ایک برقی رو تھی جو سارے جسم میں دوڑ گئی اور مَیں نہیں جانتا اُس وارفتگی کے عالم میں تجھ سے کیا کچھ کہہ گیا۔ اتنا یاد ہے کہ آخر میں مَیں نے یہی کہا تھا کہ "زندگی کی مصیبتوں پر صرف ایک ہی قوّت فتح پا سکتی ہے اور اُس کا نام ہے محبّت۔ شدید، ہمہ گیر، ناقابلِ برداشت محبّت۔"

تم، یہ سُن کر، پہلے تو مبہوت و متحیّر، چند لمحے میری طرف دیکھتی رہیں۔ پھر یکایک تمہاری آنکھوں سے آنسوؤں کی ایک گنگا بہ نکلی اور تم نے ہچکیاں لیتے ہوئے آہستہ آہستہ کہا "کیا مجھے تم سے محبت نہیں؟"

تمہارا پیمانِ اُلفت اب تک برقرار ہے۔ وُہ وعدۂ محبت سالہا سال گذر جانے پر بھی زندہ و پائندہ ہے۔ عشق غیر فانی ہے۔ وہ عشق جو زمان و مکان کی قید سے بے نیاز اور موت و ہلاکت کی

بربادی سے آزاد ہو۔ وقت کی نامساعدت نے ہمارے درمیان ایک خلیج حائل کر دی ہے جس کا پُر کرنا صرف موت ہی سے ممکن ہے کاش تم آؤ اور مجھے اس بدمزہ زندگی سے نجات دلانے کی کوشش کرو۔ نہیں تو مجھے بھی وہاں بُلا لو جہاں میری رُوح کے لئے سامانِ زیست موجود ہے۔

حکایتِ خونچکاں

بعض کہتے ہیں عشق سُلگتی ہُوئی آگ ہے جو تپ دق کی طرح آہستہ آہستہ ہڈیوں کو پگھلا دیتی ہے بعض کے نزدیک عشق بھڑکتا ہوا شعلہ ہے جو چشمِ زدن میں جان و جسم کو جلا کر راکھ کر دیتا ہے۔ مَیں جس قصّۂ غم و الم اور داستانِ حزن و ملال کو سپردِ قلم کرنے چلا ہوں اُس میں عشق جب اپنی پوری حرماں نصیبیوں اور ہلاکت آفرینیوں کے ساتھ نمودار ہوا تو وہ بیک وقت سلگتی ہوئی آگ بھی تھا اور بھڑکتا ہوا شعلہ بھی۔ افضال مرحوم کے خطوط، جنھیں اُس کی حیاتِ معاشقہ کی روداد کہنا چاہیے، اس وقت میرے پیشِ نظر ہیں اور مَیں اُس زخم کی گہرائی، اُس سوزِ دروں کی تپش اور اُس دردِ جانستاں کی اذیّت کو شدّت سے محسوس کر رہا ہوں جس نے اُس کی زندگی کے آخری ایّام کو ایک بے پناہ خلش و اضطراب سے لبریز کر دیا تھا۔ مَیں مرحوم کے کسی سربستہ راز کو منکشف کرنا نہیں چاہتا اور اب کہ خود اُس کی موت نے تمام واقعات پر سے پردہ اُٹھا دیا ہے،

میری اس تحریر کو افشائے راز سے منسوب نہ کیا جائے گا۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ اُس آگ کی ذراسی گرمی، اُس شعلے کی خفیف سی حدّت اور اُس التہاب کا تھوڑا سا سینک آپ تک پہنچا دوں جس نے افضال کو آتشِ بجاں کر رکھا تھا۔ اُس جذبۂ بے اختیار کی ایک جھلک آپکو دکھادوں جو ہر قسم کی آلائش سے پاک وصاف تھا اور جس نے آناً فاناً دل و دماغ میں وہ انقلاب بپا کیا کہ

گویا نہ وہ زمیں ہے نہ وہ آسماں ہے اب

۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۲ء دو سال اپنی سیاسی اہمیتوں کی وجہ سے ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ ترکِ موالات کی ہنگامہ خیز تحریک انہی ایّام میں اپنے انتہائی عروج پر پہنچی اور ہندوستانیوں کی سرفروشانہ جدّ و جہد اور متّفقہ سعیِ عمل نے ایک عالم کو انگشت بدنداں کر دیا۔ ترکِ موالات کے لائحہ عمل میں سرکاری درسگاہوں کا مقاطعہ بھی شامل تھا۔ چنانچہ جونہی ملک کے سیاسی رہنماؤں نے اس طرف توجہ کی کالج اور اسکول دھڑا دھڑ بند ہونا شروع ہو گئے۔ طلبہ خدمتِ ملک و ملّت کے جذبہ سے بے تاب ہو ہو کر میدانِ عمل میں نکل آئے اور درسگاہوں پر قفل چڑھا دیئے گئے۔ افضال اُس وقت بی اے کر چکا تھا۔ اور قانون کی تعلیم میں اُس کا پہلا سال تھا۔ وہ تو یوں بھی جذبات کی لاتعداد

چنگاریوں کا ایک مجموعہ تھا۔ اب بھلا یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ اس سیاسی ہلچل سے، جس نے برّاعظم ہند کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک متحرک کر رکھا تھا، متاثر نہ ہوتا۔ چنانچہ مادرِ وطن کی پہلی آواز پر اُس نے پُورے جوش سے لبیک کہا۔ اور وقت کی تمام مصلحتوں اور مستقبل کے تمام خطروں کو پسِ پشت ڈال کر جلتی آگ میں کُود پڑا۔ تحریک کے بانیوں نے ایسے طلبہ کے آئندہ طرزِ کار کے لئے کوئی خاص پروگرام معیّن نہیں کیا تھا۔ وہ تو صرف یہ چاہتے تھے کہ قوم کے تمام اعضا موجود الوقت حکومت کے ساتھ عدم تعاون کر کے اس کل کے پُرزوں کو یکلخت معطّل کر دیں۔ ساری توجہ تخریب پر مرکوز کر دی گئی تھی۔ اور ایک ایسا ماحول وضع کرنے کی کوششیں کی جا رہی تھیں کہ جس کے ماتحت ملک میں اندھا دھند انقلاب برپا کرنے کے امکانات بآسانی پیدا ہو سکیں۔

افضال بھی ترکِ تعلیم کے بعد اپنے لئے کوئی مستقل راہ اختیار نہ کر سکا۔ چند ہفتے تو اُس نے یونہی لاہور کے سیاسی جلسے جلوسوں میں شامل ہوتے ہوتے گذار دیئے۔ پھر کچھ عرصہ کے لئے وہ احمد آباد کی قومی یونیورسٹی میں چلا گیا تاکہ براہِ راست بانیٔ تحریک کے زیرِ اثر رہ کر مکمّل طور سے استفادہ کر سکے۔ پان سات مہینے وہاں ٹھہرا ہوگا کہ تحریک میں زیادہ تندی پیدا ہونا شروع ہو گئی اور قید و بند کے شدائد زیادہ عام ہوتے چلے گئے۔ وہ

واپس لاہور آگیا اور اس عزم صمیم کے ساتھ آیا کہ تعلیم و تعلّم کو قطعی طور پر خیرباد کہہ کر محشرستانِ عمل میں اپنے جسم و جان کا ناچیز ہدیہ پیش کرے گا چنانچہ جب میں اُس کی پذیرائی کے لئے ریل کے اسٹیشن پر گیا تو پہلی ہی نظر میں میں نے دیکھ لیا کہ وہ ظاہر و باطن میں اس قدر تغیّر پیدا کر کے آیا ہے کہ کم از کم پوشاک اور آرائش کے معاملے میں اس نے ہمیشہ کے لئے لطافت و کثافت کا امتیاز اُٹھا دیا ہے۔ گھٹنوں سے نیچے تک گاڑھے کا ایک لمبا کُرتا اور موٹے کھدّر کا پاجامہ اُس کا لباس تھا۔ سر پر درویشانہ رنگ میں گاندھی ٹوپی اوڑھے اور پاؤں میں چپل پہنے ہوئے تھا۔ سب سے دلچسپ چیز اُس کی ڈاڑھی تھی جسے دیکھ کر مجھے ہنسی تو آئی لیکن جلد ہی میری آنکھیں نمناک بھی ہو گئیں۔ ہندوستان کی تحریکِ قومیّت نے ہمارے نوجوانوں کے دلوں کی دُنیا بدل ڈالی تھی۔ یہی شخص جو آج سے چند ماہ پہلے لباس کی تراش خراش اور انگریزی طور طریقوں سے اپنے ہمعصروں میں نمایاں حیثیت رکھتا تھا اور چہرے کے حشو و زوائد سے پاک رکھنے کا اس درجہ پابند تھا کہ بیمار پڑنے پر بھی روزانہ خود اپنے ہاتھ سے حجامت بنانے کا عادی تھا اب ایک فقیرانہ تقشّف کے ساتھ، ظاہری تکلّفات سے بے نیاز عجز و فنادگی کا مجسمہ بنا ہوا، لاہور ایسے شہر کے اسٹیشن پر، سیکڑوں انسانوں کے مجمع میں، بے تکلفی سے گھوم رہا تھا۔ ریل سے اُترنے کے بعد افضال نے

اصرار کیا کہ وہ اپنا سامان خود ہی اُٹھائے گا۔ گویا قلی لینا اُس کے نزدیک اسراف اور مزدور کے سر پر اسباب رکھوانا اصولِ مساوات کے خلاف تھا۔ میں نے اُس کے اس خیال کا نہ صرف مضحکہ ہی اُڑایا بلکہ مذمت بھی کی کہ یہ کہاں کی قوم پرستی ہے کہ اب بستر اور صندوق بھی خود اُٹھائے جائیں۔

افضال نے لاہور پہنچتے ہی کانگریس کے رضاکاروں میں اپنا نام درج کرا لیا اور صبح و شام جلوس کے ساتھ شہر میں گشت کے لئے نکلنا شروع کر دیا۔ بعض موقعوں پر اُس نے انقلاب انگیز خیالات کے ماتحت بہت پُر جوش تقریریں بھی کیں۔ حکومت نے جیشِ رضاکاراں کو خلافِ قانون جماعت قرار دے دیا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ قانون شکن جماعت کا رُکن ہونے اور چند اشتعال انگیز تقریریں کرنے کی بناء پر افضال گرفتار کر لیا گیا۔ مقدمہ چلا اور بالآخر دو سال قید بامشقت کی سزا ہو گئی۔

جب وہ قید سے رہا ہو کر نکلا تو ملک کی حالت یکسر بدل چکی تھی۔ اتحاد و یگانگت کی جگہ انتشار و افتراق اور خلوص و ایثار کی بجائے بغض و عداوت کا دور دورہ تھا شدھی اور سنگھٹن کی بے محل تحریکات نے تحریکِ وطنیّت کو عملاً فنا کر دیا تھا۔ ہندوستان کی دونوں قومیں بدگمانی اور ناراضی کے عالم میں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو رہی تھیں۔

چند مخلصین جو اس افسوسناک ردِّ عمل سے اب تک متاثر نہیں ہوئے تھے قومی جد و جہد کی عظمتِ رفتہ کو واپس لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کی مساعی ناکام ہوتی نظر آتی تھیں۔ اس ناسازگار ماحول نے ملک کے بہت سے صحیح الدّماغ کارکنوں کو گوشۂ عزلت میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ اور آہستہ آہستہ ملکی تحریک قوم پرور عنصر سے کلیتہً محروم ہو گئی۔

افضال کے لئے یہ سخت آزمائش کا وقت تھا۔ وہ سیاسیات کے جن اصولوں پر کاربند تھا۔ اُن کا تقاضا تو یہ تھا کہ آخری دم تک قومی مطمحِ نظر کے حصول کے لئے جنگ کی جائے۔ لیکن حالاتِ نامساعد جو ملک پر ابرِ سیاہ کی طرح چھائے ہوئے تھے اُسے اس منزل کی طرف ایک قدم اُٹھانے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ فکرِ معاش سے وہ بے نیاز نہیں تھا اور اب اُس کی مالی حالت خاص طور پر مخدوش ہو گئی تھی۔ طالب علمی کے زمانے میں وہ اپنے والد کا دست نگر تھا لیکن ترکِ موالات میں شامل ہونے کے بعد کانگریس اُس کے مصارف کی کفیل رہی تھی۔ اب خود کانگریس کے اقتدار کا جنازہ نکل رہا تھا وہ کیونکر اُس سے مالی امداد کا خواہاں ہو سکتا تھا۔ بہت سے نوجوان جنہوں نے عدم تعاون کی وجہ سے تعلیم ترک کر دی تھی۔ حالات کی یہ مایوس کن روش دیکھ کر دوبارہ کالجوں میں داخل ہو گئے۔ افضال

کے لئے یہ بھی ممکن نہ رہا تھا۔ وہ آگے قدم بڑھا کر پیچھے ہٹنا گناہ سمجھتا تھا۔ اُس کی افتادِ طبیعت ہی کچھ ایسی تھی کہ جس چیز کو وہ مضر اور قابلِ نفرت خیال کر کے چھوڑ دے اُسے دوبارہ اختیار کرنا اُس کے امکان سے باہر تھا۔ مجبور ہو کر اُس نے ایک قومی درسگاہ میں ملازمت اختیار کر لی۔ لیکن اُس کے مزاج کی شگفتگی، اُس کی طبیعت کی ظرافت اور اُس کے دل و دماغ کی رنگینی اب بالکل ختم ہو چکی تھی۔ تکدّر آمیز متانت اور سکوت افزا افسردگی نے اس کے اندر گھر کر لیا تھا۔ فضا کی ناسازگاری اور زمانے کی نامساعدت کا شکوہ اکثر اُس کے لبوں پر رہتا تھا۔ وہ دیکھتا اور خون کے گھونٹ پی پی کر چپکا ہو رہتا تھا کہ اتحادِ قومی و تحریکِ حُرّیت کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے والی شر انگیز طاقتیں بر روئے کار آ رہی ہیں۔ اور خدمت ملک و ملّت کے صحیح جذبے سے سرشار لوگوں کو مطعون کیا جا رہا ہے۔ واقعات کی رفتار ظاہر کر رہی تھی کہ آئندہ ایک طویل اور غیر معیّن عرصہ تک ہندوستان کے اندر کسی قومی تحریک کے پنپنے کے آثار باقی نہیں رہے۔

افضال نے آزادی کی دیوی کے مندر پر اپنی اعلیٰ تعلیم، اپنے درخشاں مستقبل اور اپنی گرانبہا زندگی کی جو عظیم الشان قربانی پیش کی تھی۔ وہ بظاہر رائگاں ہی گئی۔ اس خیال نے اس کے اندر ایک ایسا شدید جذبۂ یاس پیدا کر دیا کہ اُسے کسی طرف سے فلاح و مسرت کی توقع نہ رہی۔ اُس نے

مجبور و لاچار انسانوں کی طرح کبھی مقدّر کا گلہ نہیں کیا تھا اور نہ وہ اپنے ان ساتھیوں سے حسد کرتا تھا جو تحریک میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد اب معزز سرکاری عہدوں پر فائز تھے۔ اُس نے حکومت اور حکومت کے جاہ و منصب سے برضا و رغبت آنکھ موڑ کر وادیٔ رنج و محن میں قدم رکھا تھا۔ اس لئے اب اُسے افلاس و نکبت کی شکایت کا کوئی حق نہیں تھا۔ وہ تو صرف یہ چاہتا تھا کہ استخلاصِ وطن کے جس مقصدِ اعلےٰ کو پیش نظر رکھ کر قربانیاں کی گئیں تھیں کاش اُس مقصد کی خاطر ہندوستان کا ہر فرزند باہمی تفرقے اور جھگڑے بھول کر آب و آتش کے طوفانوں میں کودنے پر آمادہ ہو جائے۔ ہندوستان کی سیاسیات بد سے بدتر ہوتی چلی گئیں اور ساتھ ہی افضال کے تکدّر و اضمحلال میں اضافہ ہوتا گیا۔ اُس کی صحت خراب رہنے لگ گئی تھی جس نے اس کی اقتصادی پریشانیوں کے ساتھ مل کر اُس کے مستقبل کو بے حد تاریک، اور اندیشناک بنا دیا تھا۔ اُس کے تمام دوست متفکر تھے اور دل سے چاہتے تھے کہ افضال اس یاس انگیز ماحول میں سے نکل کر کسی اچھے مقام پر چلا جائے۔ اس دوران میں ریاست ندیا کے دیوان کو اپنے خورد سال بچے کے لئے ایک قابل اتالیق کی ضرورت محسوس ہوئی۔ شرط یہ تھی کہ اتالیق شمالی ہند کا باشندہ ہو۔ وقت کی بات کہئے یا خوش قسمتی کہ تھوڑی سی کوشش کرنے سے افضال کو یہ جگہ مل گئی

پہلے تو وہ ندیا ایسے دُور افتادہ مقام پر جانے سے گھبراتا تھا لیکن ہم سب نے اصرار کیا تو رضامند ہو گیا۔

ندیا میں افضال بمشکل ڈیڑھ پونے دو سال رہا ہو گا۔ اس عرصہ میں وہ کس قسم کی زندگی بسر کرتا رہا اور کن کن حوادث سے دوچار ہوا اس کی تفصیل بیان کرنے کے لئے میرے پاس واقعات کا کوئی عینی شاہد موجود نہیں ہے۔ اُس کے خطوط میرے سامنے بکھرے پڑے ہیں۔ یہ خطوط اُس کے جذبات و خیالات کے آئینہ دار ہیں۔ انہی خطوط میں بعض بعض مقامات پر اُس نے اپنا دل چیر کر رکھ دیا ہے اور یہی خطوط ہیں جن کی مدد سے میں اُن حیرت انگیز قلبی و دماغی تغیرات کا مطالعہ کرتا ہوں جو لاہور سے جانے کے بعد یکایک اس کے اندر رونما ہوئے۔ میں اس کہانی کو خود اُسی کی زبانی بیان کروں تو بہتر ہے۔ اس کے متعدد مکاتیب میں سے مندرجہ ذیل اقتباسات اسی غرض سے لئے گئے ہیں :-

---

۳۰ اگست ۱۹۲۴ء

تم پوچھتے ہو ندیا کیسی جگہ ہے۔ میرا جواب ہے کہ ندیا خوب جگہ ہے۔ جہاں تک مناظر کا سوال ہے قدرت نے اس خطۂ ارض پر اپنے الطاف و اکرام کی بے دریغ بارش کرنے میں بخل نہیں کیا۔ قدم قدم پر

فطرت نے حسن و رعنائی کے لازوال خزانے بکھیر دیئے ہیں۔ آب رواں اور گل و گلزار کی وہ کثرت ہے کہ اس سرزمین کو جنوبی ہند کا کشمیر کہنا بجا ہے۔ موسم بہت خوشگوار ہے اور سُنا ہے کہ سال بھر ایسا ہی رہتا ہے۔ کم از کم لاہور کی جون جولائی والی گرمی سے یہاں لوگ آشنا نہیں ہیں۔ تم میرے مذاق سے واقف ہو اور جانتے ہو کہ مَیں گنجان آبادی سے کتنا متنفر اور باغوں، پہاڑوں، سبزہ زاروں کا کیسا شیدائی ہوں پس فطرت نے میری دلبستگی کے لئے اس زمین کو تختۂ باغ بنانے میں کمی نہیں کی۔ صرف اتنا رنج ہے کہ ہم خیال و ہم ذوق دوست میسّر نہیں۔ ندیا مختصر سی جگہ ہے۔ لیکن حکومت کا مستقر ہونے کی وجہ سے ریاست بھر میں سب سے اہم مقام ہے۔ شہر بھی خوبصورت ہے۔ صاف ستھری سڑکیں اور چوڑے چکلے بازار ہیں۔ مہاراجہ کے عالیشان محل اور اُمراء کے وسیع و رفیع ایوان صنعتِ تعمیر کے حسین ترین نمونے پیش کرتے ہیں۔ ریاست کی خاموش و پُرسکون زندگی برطانوی ہند کی ہنگامہ خیز زندگی سے، جس کا ہر نیا دن ایک نئے فتنے کو لے کر طلوع ہوتا ہے، دُور کی نسبت بھی نہیں رکھتی۔ یہاں لوگ بہت چُپ چاپ رہنے کے عادی ہیں۔ شاید قدرت کو یہی منظور تھا کہ گذشتہ چند برس کی تیز و تُند سیاسی دوڑ دھوپ کے بعد مَیں اپنے دل و دماغ کی غیر معمولی حدّت رفع کرنے کے لئے ندیا کی برودت اور خنکی

سے استمداد کروں۔"

۱۵ اکتوبر ۱۹۲۴ء

"میرے مشاغل و مصروفیت کا حال کیا پوچھتے ہو۔ پڑھنے لکھنے کا عادی ہوں اور معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے لکھنے ہی کے لئے قدرت نے یہ موقع اور فرصت عطا کی ہے۔ دیوان صاحب کا وطنِ مالوف دہلی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جنوبی ہند کی ایک ریاست کے وزارت پناہ ہونے کے باوجود انہوں نے اپنے بچّے کی تعلیم و تدریس کے لئے شمالی ہند کا باشندہ طلب فرمایا ہے۔ دیوان صاحب مشرق و مغرب کی تعلیم و تہذیب کے جامع ہیں۔ کیمبرج میں تین سال رہ کر اُنہوں نے تاریخ و ادب میں منتہی کا درجہ حاصل کیا ہے۔ لندن کے قانون دان بیرسٹر ہیں اور ولایت جانے سے پہلے علی گڈھ کے مدرسۃ العلوم میں بھی رہ چکے ہیں۔ اردو فارسی ادبیات کا اتنا صحیح مذاق رکھتے ہیں کہ اُن کے ذوق کی پاکیزگی پر رشک آتا ہے۔ اُن کا بیش قیمت کتب خانہ تو میرے لئے ایک نعمت ثابت ہوا ہے۔ ریاست کی سرکاری لائبریری سے استفادہ کرنے کی بھی مجھے اجازت ہے۔ اٹھارھویں صدی کی ہندوستانی سیاسیات پر اتنا گراں قدر اور مستند تاریخی مواد موجود ہے۔ کہ اگر اُس کی چھان پھٹک کر کے کسی خاص ترتیب کے ساتھ اُسے علمی دُنیا

کے سامنے پیش کیا جاتے تو تاریخ ہند کے اُس افسوسناک لیکن حد درجہ دلچسپ، دَور پر سے تاریکیوں کے بہت سے پردے دُور ہو سکتے ہیں۔ غرضکہ جہاں تک علم و ادب کا تعلق ہے ندیا کے اندر بہت سے قیمتی خزانے پنہاں ہیں۔ اگرچہ مجموعی طور پر اس جگہ کا ماحول علمی و ادبی نہیں میرے اوقات کا بیشتر حصّہ دیوان صاحب کے صاحبزادے خالد کی تعلیم میں بسر ہوتا ہے۔ یہ ذہین و خوش فہم لڑکا اپنے بلند اقبال والدین کا تنہا نورِ نظر ہے اور یہی وجہ ہے کہ دیوان صاحب اُس کی تعلیم و تربیت میں بہت کوشاں ہیں۔ دیوان صاحب خود بھی بالکل نوجوان ہیں اور اُن کی موجودہ بلند و بالا حیثیت کے پیش نظر تو انہیں بہت ہی نوعمر کہنا چاہیئے۔ اگر ترقی مدارج کی یہی رفتار رہی تو مجھے اُن کا مستقبل بے حد شاندار نظر آرہا ہے۔ خالد بہت ہی پیارا بچّہ ہے اور حیرت انگیز دماغی استعداد کا مالک ہے۔ دیوان صاحب کی بیگم صاحبہ اودھ کی رہنے والی ہیں اور اس طرح اس گھرانے میں دہلی و لکھنؤ کی تہذیب کے بہترین عناصر جمع ہو گئے ہیں۔ رہنے سہنے کے طریقے تمام تر مغربی ہیں لیکن زبان جو استعمال ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ابھی کوثر سے دُھل کر آئی ہے تم جانتے ہو مجھے بھی اردو دانی کا زعم ہے۔ لیکن "لکھنے کی اُردو" کا۔ "بولنے کی اُردو" کا نہیں۔ یوں تو بولنے میں بھی مجھ سے محاورہ کی غلطی کبھی نہیں ہوتی لیکن ہائے وہ دلّی کا لب و لہجہ اور لکھنؤ

کی لچک کہاں سے لاؤں۔ ابھی کل ہی کا ذکر ہے کہ دیوان صاحب میرے مضامین کی بہت تعریف کر رہے تھے اور کہتے تھے کہ ہندوستان کا ترقی یافتہ ادب اپنے لئے یہی اُردو اختیار کرے گا جو علی گڑھ، لاہور، حیدر آباد کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کے ذوقِ سلیم رکھنے والے لوگ استعمال کر رہے ہیں۔ یہ سارا قصّہ بیان کرنے سے مدعا یہ ہے کہ تم پر واضح کر دوں کہ آج کل لیل و نہار کیونکر گذر رہے ہیں۔ ایسی اچھی فضا میں زندگی بسر کرنے اور دن کا زیادہ حصّہ کام میں مصروف رہنے کے باوجود میں بعض اوقات اپنے تئیں سخت تنہا محسوس کرتا ہوں اور ایک نامعلوم سی افسردگی و محرومی طبیعت پر چھا جاتی ہے۔ یہ شاید اس لئے کہ آپ لوگوں سے دُور ہوں، یا اس لئے کہ واہمہ کبھی کبھی موہوم و بے نام سے خدشات پیدا کرنا شروع کر دیتا ہے۔

---

۲۹ نومبر ۱۹۲۴ء

"تم بعض دفعہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں پوچھ بیٹھتے ہو کہ مجھے تمہاری اس مین میخ کی داد دینا پڑتی ہے۔ گذشتہ خط میں تم نے پوچھا تھا کہ میرے کھانے کا انتظام کیا ہے تمہاری اس ہمدردانہ توجہ کا بہت شکریہ لیکن تم بے فکر رہو میں نڈیا میں بیٹھ کر لاہور سے کھانا نہیں منگواؤنگا۔ تمہیں

معلوم تو ہے کہ میرا قیام دیوان صاحب کی طویل و عریض اور عظیم الشان کوٹھی میں ہے اور جب قیام یہاں ہے تو سمجھ لو کہ طعام بھی یہیں ہو گا۔ میرے رہنے کے کمرے دیوان صاحب کے دفتر سے کچھ فاصلہ پر ہیں۔ اور تمدّنِ جدید کے لحاظ سے تمام ضروری سامان سے مکمل اور لوازم آرائش سے مزیّن ہیں۔ کھانا انگریزی بھی ہوتا ہے اور ہندوستانی بھی۔ دیوان صاحب اکثر انگریزی قسم کا کھانا پسند کرتے ہیں۔ لیکن بیگم صاحبہ کے مرغوب خاطر ہندوستانی کھانے ہیں۔ اس طرح میرے دسترخوان پر بیک وقت اُبلا ہوا نمکین گوشت بھی ہوتا ہے اور لکھنؤ کی بورانی و مزعفر بھی۔ سچ بتاؤ تمہارے مُنہ میں پانی تو بھر نہیں آیا؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں میاں بیوی میرے لئے فرشتۂ رحمت ثابت ہو رہے ہیں۔ ایسے اخلاق فاضلہ کے انسان ہیں کہ دیکھ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ حکومت اور تموّل کے باوجود رعونت کا نام و نشان نہیں۔ ملازموں سے روزانہ تاکید ہوتی ہے کہ میرے آرام و راحت کا ہر لحظہ خیال رکھیں۔ پھر اس پر بار بار مجھ سے دریافت کیا جاتا ہے کہ کوئی تکلیف تو نہیں۔ مَیں تو بعض اوقات اُنکی خاطرداریوں سے شرمندہ ہو جاتا ہوں اور یہ سارا کاروبار مصنوعی سا تکلّف نظر آنے لگتا ہے۔ لیکن امر واقع ہے کہ یہ سب کچھ تکلّف نہیں بلکہ اُن کی

فطرت کی بلندی، طینت کی نیکی اور سرشت کی پاکیزگی کا اظہار ہے۔ لاہور سے آکر میری طبیعت میں ایک عجیب سرمدی سکون پیدا ہو گیا ہے۔ شاید یہ ماحول کا اثر ہو یا میری گذشتہ شورانگیزیوں کا طبعی ردّ عمل۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ مَیں اپنے دل کو پہلے کی بہ نسبت شاداں و فرحاں اور دماغ کو مسرور و مطمئن پاتا ہوں۔

شام کا کھانا مَیں بالعموم دیوان صاحب، بیگم صاحبہ اور خالد کے ہمراہ کھاتا ہوں۔ یہاں جملہ معترضہ کے طور پر مَیں بتا دوں کہ دیوان صاحب پردے کی رسم قبیح کے قائل نہیں ہیں۔ اس لئے بیگم صاحبہ مروّجہ پردے کی پابندی نہیں فرماتیں۔ رات کے کھانے سے فارغ ہو کر ہم گھنٹہ پون گھنٹہ وہیں میز پر بیٹھے رہتے ہیں۔ کبھی دیوان صاحب اپنے قیامِ انگلستان کے زمانے کی کوئی دلچسپ بات چھیڑ دیتے ہیں یا کبھی تہذیب و معاشرت کے کسی پہلو پر گفتگو شروع ہو جاتی ہے جس میں ہم سب دلچسپی سے حصّہ لیتے ہیں۔ حتّےٰ کہ ننھّا خالد بھی اپنی بساط کے مطابق شرکت سے محروم نہیں رہتا۔ دیوان صاحب حد درجہ مہمان نواز انسان ہیں اور ان کی مہمان نوازیوں کے چرچے یہاں خاص و عام کی زبان پر ہیں۔ اُن کا حلقہ احباب بہت وسیع ہے اور ہر ہفتے دُور و نزدیک سے ایک آدھ دوست اُن سے ملنے آ ہی جاتا ہے۔ اُن کے تمام دوست اخلاق و ذہانت کے لحاظ سے ایک دوسرے

سے بڑھ چڑھ کر ہیں اور اپنی شائستہ کلامی و عالی دماغی کے باعث ہندوستان کی بہترین سوسائٹی کا سرمایہ کہے جا سکتے ہیں۔

۲۷؍ دسمبر ۱۹۲۴ء

"تم چونکہ ہر روز شام کا وقت ایک تفریحی پروگرام کے ماتحت صرف کرنے کے عادی ہو، اسی لئے بار بار پوچھتے ہو کہ میری شام کیونکر گذرتی ہے۔ مَیں اگر اُس نگارستانِ ہند میں ہوتا جسے عرفِ عام میں لکھنؤ کہتے ہیں تو شاید اپنے مجروح و درماندہ قلم کی زندگی کی آخری رمق کو کام میں لا کر شامِ اودھ کی لٹی ہوئی بہاروں کا ہلکا سا نقشہ کھینچ دیتا لیکن وائے قسمت کہ ندیا میں ہوں جہاں نہ لاہور کی مال ہے اور نہ لکھنؤ کا چوک۔ پھر ان حالات میں مجھ سے میری شاموں کی تفصیل طلب کر کے میری سوگواریوں میں اضافہ کرنا ہی مقصود نہیں تو کیا ہے؟ مَیں عام طور پر دیوان صاحب کے ساتھ ٹینس کھیلتا ہوں یا کبھی کبھی بیگم صاحبہ اور خالد کی ہمراہی میں ہواخوری کے لئے چلا جاتا ہوں۔ خالد مجھ سے بہت مانوس ہو گیا ہے۔ اور ہمیشہ ساتھ چلنے پر اصرار کرتا ہے۔ راستے میں عجیب عجیب سوال کرتا ہے کہ آپ کا لاہور اچھا ہے یا ندیا؟ مَیں جواب دیتا ہوں لاہور۔ پھر فوراً پکار اُٹھتا ہے وہ کیوں؟ مَیں نے تو سُنا ہے کہ وہاں بہت گرمی پڑتی ہے اور وہاں پہاڑ

بھی نہیں ہیں۔ پھر لاہور کیونکر اچھا ہو گیا۔ بیگم صاحبہ مُسکرانے لگتی ہیں اور میں بھی ہنس کر کہتا ہوں کہ ہاں واقعی ندیا لاہور سے اچھا ہے۔ لیکن اُسی وقت تک کہ تم یہاں ہو۔ اگر تم یہاں سے چلے گئے تو میں واپس لاہور بھاگ جاؤں گا۔

میں نے شاید پہلے بھی تمہیں لکھا تھا کہ بیگم صاحبہ مروّجہ پردے کی پابند نہیں ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ پردے سے نصف لطفِ زندگی ضائع ہو جاتا ہے۔ دیوان صاحب کی خانگی زندگی قابلِ رشک مسرت و اطمینان سے گذر رہی ہے۔ اور میں نے بہت کم گھرانوں میں حیاتِ ازدواجی کو اس قدر برکتوں اور سعادتوں سے لبریز پایا ہے۔ تمہیں یاد ہو گا۔ تحریک میں شامل ہونے سے پہلے جب فارغ البالی میسّر تھی تو ہم کبھی کبھی اپنی ازدواجی زندگی کے پُر کیف خواب دیکھا کرتے تھے اور تخیّل کی مدد سے ایک ایسی فضا پیدا کرتے تھے۔ جہاں محبّت، شعریت اور محبوبیّت کے بادل سایہ فگن ہوں۔ وہ فضا حقیقتاً میری آنکھوں نے یہاں آکر دیکھی ہے۔ اور میں بعض اوقات سخت دلگیر و دل گرفتہ ہو کر سوچتا ہوں کہ قدرت مجھے کبھی ایسی پُرامن زندگی سے ہم کنار نہ کرے گی۔ آہ تم ہی انصاف کرو، گردشِ ایّام کے تیز و تند بگولوں اور جسم و جان کو پگھلا دینے والے طوفانوں میں سے گذرنے کے بعد بھی میں ایسی زندگی کا حقدار نہیں رہا؟

۳۱ر جنوری ۱۹۲۵ء

"کل شام سیر کے لئے ہم باہر جانے لگے تو موسم میں معمول سے زیادہ خنکی تھی۔ مَیں ہلکا سا لباس پہنے ہوئے تھا۔ گاڑی میں سوار ہوتے وقت میری مالکہ (میری مراد بیگم صاحبہ سے ہے) نے میری طرف دیکھ کر حیرت سے کہا کہ "آپ اس لباس میں سیر کو جائینگے۔ دیکھئے تو سہی موسم کس قدر سرد ہو رہا ہے اور آپ کپڑے پہننے میں اتنی بے احتیاطی کرتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ نزلہ ہو جائے تو؟"

میرے دل میں تشکّر و امتنان اور عقیدت و عبودیت کا وہ ناقابلِ بیان جذبہ پیدا ہوا کہ بے اختیار جی چاہا کہ اپنا سر اُن کے پاؤں پر رکھ دوں۔ یہ ہے بھی سچ کہ مَیں ان دنوں اپنی ضروریات کی طرف سے کچھ غافل سا ہوتا جا رہا ہوں۔ کھانا کبھی کھاتا ہوں اور کبھی بغیر کھائے ہی دن گذار دیتا ہوں۔ خدا جانے یہ وحشت کس پُراسرار ذریعہ سے میرے مزاج میں داخل ہو گئی ہے۔ اور خود میری یہ حالت ہے کہ مَیں اس وارفتگی کی وجہ دریافت کرنے پر بھی قادر نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کوئی خوش آئند شے میرا راستہ کاٹ گئی ہے۔ بعض اوقات ایسے تباہ کن خیالات دماغ پر طاری ہوتے ہیں کہ اُن کا اظہار تو ایک طرف مَیں اُن کے تصوّر ہی سے کانپ اٹھتا ہوں۔ مَیں زندگی کی علم شاہراہ سے ہٹ کر ٹیڑھی ترچھی پگ ڈنڈیوں پر چلنا نہیں چاہتا

میری عافیت اسی میں ہے کہ کنارے پر آہستہ آہستہ گامزن رہوں۔ دریا میں کودنے اور موجوں سے ہم آغوش ہونے کی نہ تمنّا ہے اور نہ ہمّت۔ تم بتاؤ میں کیا کروں۔

دیوان صاحب کا میں بہت ادب کرتا ہوں اور اسی طرح بیگم صاحبہ کا احترام بھی میرے لئے ایمان کا مرتبہ رکھتا ہے میں دیوان صاحب کو اپنا مالک سمجھتا ہوں اور بیگم صاحبہ کو اپنی مالکہ۔ آہ اس خیال میں کتنی دلفریبی ہے۔ اپنے قلب کے تمام عجز و نیاز اور اپنی روح کی تمام عبودیّت و فتادگی کے ساتھ اپنی ہستی کو، اپنی روحیّت و معنویّت کو دوسرے کے حوالے کر دینا۔ اپنے کو غلام اور دوسرے کو مالک سمجھنا ایک ایسا جذبہ ہے کہ اس سے سرشار ہونے کے بعد خودی کا سارا سحر اور انفرادیت کا سارا جلوہ دھواں بن کر اُڑ جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اب تک میری ذات ہی میرے افکار کا مرکز و محور رہی ہے۔ میرے تردّدات و تفکّرات کا تعلق تنہا میری شخصیّت ہی سے تھا اور شاید یہی وجہ ہے کہ مجھ سے اطمینان و سکون ہمیشہ غائب اور فراغِ خاطر ہمیشہ مفقود رہا ہے۔ اپنی خوشی سے دوسرے کی خوشی کو مقدم اور اپنی راحت سے دوسرے کی راحت کو عزیز جاننا بھی تزکیۂ نفس و بالیدگیٔ خیال کے لئے کس قدر ضروری ہے۔ یہ حقیقت مجھ پر اب واضح ہوئی ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ وہ لوگ جنھوں نے کبھی اپنا آرام

دوسروں کی خاطر قربان نہیں کیا۔ جنھوں نے کبھی دوسروں کی فلاح و انبساط کو اپنے آرام و آسائش پر ترجیح نہیں دی کس قدر تیرہ بخت انسان ہیں۔ مَیں سُنا کرتا تھا کہ اصلی مذہب محبّت ہے اور محبّت کی معراج قربانی و ایثار۔ اِن الفاظ کی حقیقی روح مجھ پر اب منکشف ہو رہی ہے۔ وہ لوگ جو اپنے ذاتی آلام و افکار سے نکل کر نوعِ انسان کی خدمت کرنے کے جذبہ سے ناآشنا ہیں نہ محبّت کی ماہیّت سمجھ سکتے ہیں اور مذہب کی غرض و غایت۔ میری اس تحریر کو بے ربط نہ سمجھو۔ مَیں جو کچھ محسوس کر رہا ہوں اُس کا عشرِ عشیر بھی صفحۂ قرطاس پر ظاہر کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ شاید ایک دن ایسا آئے کہ تم میرے قلب کی عمیق گہرائیوں میں آرام کرنے والے راز سے آشنا ہو سکو۔ لیکن نہیں نہیں مجھے ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ مَیں اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے سے ہمیشہ پرہیز کروں گا۔

۳ر جون ۱۹۲۵ء

"تم شکایت کرتے ہو کہ میرے خطوط بے معنی ہوتے جا رہے ہیں اور میری تحریر سے تم کوئی خاص مفہوم اخذ کرنے سے قاصر ہو۔ تمہاری شکایت صحیح اور تمہارا اعتراض درست، لیکن یاد رکھو خیالات اپنے اظہار کے لیے ہمیشہ الفاظ کے محتاج ہوتے ہیں۔ اگر میری تحریریں الجھن اور

میرے الفاظ میں ابہام ہے تو سمجھ لو کہ میرے خیالات میں بھی انتشار اور میرے جذبات میں بھی ہیجان موجود ہے۔ مَیں واقعات کی بعض ادنےٰ جزئیات بیان کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن مَیں جانتا ہوں کہ تم مجھے بیوقوف سمجھ کر ہنس دو گے۔ تم نہیں سمجھتے، آہ نہیں سمجھ سکتے، کہ معمولی معمولی باتیں جن کی سود و زیاں والی کاروباری دُنیا میں کوئی قدر و قیمت نہیں، میرے لئے کس قدر اہم ہیں۔ میرے دل میں نئی نئی آرزوؤں نے گھر کر لیا ہے۔ میرے نوزائیدہ خیالات نے حیاتِ انسانی کے مدّ و جزر کے متعلق میرا نقطۂ نگاہ یکسر تبدیل کر دیا ہے۔ غم کا مفہوم بدل گیا ہے، خوشی کے معانی تبدیل ہو گئے ہیں اور زندگی نے اپنی پُرانی کینچلی اُتار کر پھینک دی ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ننّھا خالد کچھ بیمار ہو گیا تو گھر بھر میں پریشانی پھیل گئی تھی۔ صبح و شام صحت کی دعائیں مانگی جاتی تھیں۔ خدا خُدا کر کے وہ تندرست ہوا تو ہماری جان میں جان آئی۔ اس خوشی میں بیگم صاحبہ نے ایک شاندار دعوت کا اہتمام کیا۔ جس کے بندوبست کے سلئے بہت سے امور مجھی کو سرانجام دینا پڑے۔ اپنی مالکہ کے احکام کی تعمیل، اُسکے ارشادات پر بلا چُون وچرا سرِ تسلیم خم کرنا۔ بتاؤ اس سے بڑھ کر میرے لئے انبساطِ رُوحانی و تفرج دماغی کا اور کیا سامان ہو سکتا ہے۔ اپنی مالکہ کو خوش و خُرم اور شادمان و مسرور دیکھنا ہی ایک غلام کی منتہائے زیست ہے۔ میرے

فرائض منصبی تو یہی ہیں کہ خالد کی تعلیم و تدریس میں کوشاں رہوں اور خدا جانتا ہے کہ میں کس کوشش اور تندہی سے ان فرائض کی ادائی میں مصروف رہتا ہوں۔ لیکن میرا دل چاہتا ہے کہ اپنے آقا کے آرام و راحت کی خاطر زندگی کا ایک ایک لمحہ وقف کر دوں۔ چند روز ہوئے میں نے بیگم صاحبہ سے عرض کیا کہ ملازموں کی موجودہ تعداد ضرورت سے زیادہ ہے۔ چند ایک کو برطرف کر دیجئے۔ میرے اوقات کا کافی حصّہ خالی رہتا ہے اور میں نہایت سہولت سے بیکاری کا وقت آپ کی خدمت میں صرف کرنے پر آمادہ ہوں۔ بیگم صاحبہ نے شاید میری اس تجویز کو تکلّف پر محمول کیا اور حسب عادت مسکرا دیں۔ کس قدر نیک دل و پاکیزہ خصلت خاتون ہیں۔ اُن کی گفتگو انسان کے خیالات کو اعلےٰ و ارفع اور اُن کی موجودگی فضا کو معطّر و منوّر بنا دیتی ہے۔ میں تو نظر بھر کر انہیں دیکھتا بھی نہیں۔ بلکہ یوں کیوں نہ کہوں کہ دیکھ سکتا بھی نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تم میری ان باتوں کا مذاق اُڑاؤ گے۔ لیکن کاش تم اُنہیں ایک مرتبہ دیکھ کر فیصلہ کرتے کہ انسانیت و نسائیت کو اُن کے اندر جلوہ گر ہونے کے لئے عروج و کمال کے کتنے مراحل طے کرنا پڑے ہوں گے۔ اور حُسنِ سیرت و صورت کو اُن کا قالب اختیار کرنے میں کن کن کاوشوں سے کام لینا پڑا ہو گا۔ اُن کا نام تمہیں بتا دوں؟ آہ نہیں، ہرگز نہیں، میں اس معاملہ میں سخت خود غرض ہوں۔ میں اس عشرتِ لایزال

ہیں کسی کو اپنا شریک بنانا گوارا نہیں کرتا۔ اُن کا نام اُن کی دلفریب شخصیّت کا ایک جزو ہے تم تک پہنچ جائیگا۔ مَیں بھلا یہ کب برداشت کر سکتا ہوں۔ اچھّا سُنو، اُن کا نام ز سے شروع ہوتا ہے،
آہ ز، ز، ز، ز، ۔"

۱۶ر اگست ۱۹۲۵ء

تمہارا خط میرے پیشِ نظر ہے اور مَیں تمہاری زجر و توبیخ کا جواب دینے سے معذور ہُوں۔ مجھے دیوانہ کہو یا حواس باختہ گنہگار قرار دو یا مصلحت نا اندیش لیکن خدارا میری معصومیِ جذبات کی تحقیر اور میری پاکیزگیِ خیال کی تضحیک نہ کرو۔ میرا دل چھلنی ہو چکا ہے۔ اب للّٰہ نمک پاشی سے اُس کی اذیّت نہ بڑھاؤ۔ مجھے اپنے دل پر قابو نہیں رہا۔ میرا دماغ میرے قلب کی بغاوت فرو کرنے سے عاجز ہے۔ ستم ظریفِ قدرت کا شاید یہی فیصلہ ہے کہ میری چند روزہ زندگی ہمیشہ طوفانوں میں ہو ہو کر گذرتی رہے۔ مَیں آگ کے شعلوں میں سے زندہ بچ نکلا تو میرے دوستوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن کسے معلوم تھا کہ اب کف آلود موجوں کی طغیانیاں اور باد و باراں کی تباہ کاریاں مُنہ کھولے بیٹھی ہیں۔ تم مجھے عقل و خرد کا درس دیتے ہو لیکن یہاں یہ حالت ہے کہ ہوش و حواس

کے ماتم کی فرصت بھی نصیب نہیں، مَیں صبر و شکیب کی طاقت کہاں سے لاؤں جبکہ یہاں دل ناصبور کی پذیرائی کے لئے سوائے بجلیوں کے ہی کچھ نہیں ع

الفراق اے صبر و تمکیں الوداع اے عقل و دیں

مَیں تنہا ہوں اور بے حد پریشان و مضطرب۔ ہر چیز میرے اختیار سے باہر ہے۔ میری آرزوئیں، میری تمنّائیں میری کاہشیں ایسی ہیں کہ اگر اُن کا تجربہ کرو تو ایک ایک ذرّہ میں میری موت و ہلاکت کا سامان پاؤ گے۔ بتاؤ وحشت و بربادی کے اس مسکن میں مجھ خانماں خراب کے لئے عافیت کہاں۔ میرے دل کا ایک گوشہ اگر دُنیا پر بے نقاب ہو جائے تو یقین جانو زمین و آسمان کی ان وسعتوں میں میرے لئے کہیں ٹھکانا نہ رہے۔ یہ راز ایک آگ ہے، سُلگتی ہوئی آگ، جو اندر ہی اندر میرے دل و جگر کو جلا کر راکھ کر رہی ہے۔ آہ شعلوں کی طرح بھڑک اُٹھنا کتنا آسان ہے لیکن تنور کی طرح جسم و جاں کو گداز کر دینے والی گرمی کے ساتھ اندر ہی اندر پکنا کس قدر مشکل۔ میرے اللہ! یہ عذابِ الیم اور میری جانِ ناتواں۔ یہ بارِ عظیم اور میرے نحیف و زار کاندھے!

میرے عزیز دوست، بتاؤ میں کہاں جاؤں۔ مَیں ایک قیدی ہوں

لیکن زنجیروں کو کاٹنا نہیں چاہتا۔ میں ایک غلام ہوں لیکن حرّیت و آزادی کی بجائے اس غلامی پر جان دیتا ہوں۔ کیا تم نے کبھی ایسے مجانین کو دیکھا ہے جو آبِ حیواں کا جام چھوڑ کر زہر کے پیالے کو مُنہ لگا دینے میں تامّل نہیں کرتے؟ اگر دیکھا ہے تو سمجھ لو کہ میرے دل و دماغ کی کیفیّت آج کل وہی رنگ اختیار کر رہی ہے دُنیا یہی کہے گی نا کہ ایک غلام نے اپنی مالکہ سے محبّت کی۔ آہ محبّت! کیا اُس قاتل جذبے کو صرف محبت سے تعبیر کرو گے جس نے میری راتوں سے خواب اور دنوں سے آرام چھین لیا ہے، جس نے زندگی سے بیزاری اور موت سے ہم آغوشی کی تمنّا پیدا کر دی ہے، جس نے میرے دل و دماغ کا گودا پگھلا دیا ہے اور جس کے ہاتھوں جگر خون ہو ہو کر آنکھوں کی راہ بہہ گیا ہے۔ کثرت و عمومیّت نے اس لفظ کے معنے کو اُن کی حقیقی عظمت و رفعت سے محروم کر دیا ہے۔ یہ بوالہوسوں کی دُنیا ہے۔ یہاں فسق کو محبّت اور ہوس کو عشق کہنا جائز ہی نہیں بلکہ ضروری ہے۔ مجھے اپنی فریفتگی اور دیوانگی کو اب کسی اور نام سے موسوم کرنا پڑے گا۔ ہائے غالبؔ

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

۵ر اکتوبر ۱۹۲۵ء

"تمہارا خط پہنچنے سے پہلے بھی مجھے علم تھا کہ میری کاوشوں کا انجام کچھ نہیں اور اب بھی مجھے یقین ہے کہ میری قسمت میں محرومی اور ناکامی کے سوا کچھ نہیں لکھا۔ تم مجھ سے کرید کرید کر کیا پوچھتے ہو۔ تمہارے اندازِ تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ تم میری صداقت پر اعتبار نہیں کرتے۔ خدا گواہ ہے مَیں نے تم سے کوئی بات نہیں چھپا رکھی۔ مَیں نے اپنا دل چیر کر تمہارے سامنے رکھ دیا ہے۔ اس دُنیا میں تنہا تم ہی وہ شخص ہو جسے مَیں نے اپنے محبوب و مہلک راز سے آگاہ کرنے کی جُرأت کی ہے۔ اس پر بھی تم میری طرف شک و شبہ کی نظروں سے دیکھو تو بتاؤ میری جانِ حزیں پر اس سے بڑھ کر کیا ظلم ہو سکتا ہے۔ مَیں تم سے کسی امداد کا خواہاں نہیں۔ مَیں جانتا ہوں کہ اس درد کا درماں ممکن نہیں۔ مجھے علم ہے کہ اس مرض کا علاج پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ پھر اس حالتِ نا امیدی میں جب تکلیف کے ازالے کی نہ خواہش ہے نہ کوشش میں تم سے کس چیز کا متوقع ہو سکتا ہوں۔ مَیں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم کم از کم اپنا پند و نصائح کا دفتر کچھ عرصے کے لئے تہ کر رکھو اور میرے جذبات کی توقیر کرنا سیکھو۔ میرے یہ خطوط میرے نالۂ بے اختیار کی دلدوز چیخیں اور میرے گریۂ بے قرار کے چند خون آلود آنسو ہیں۔

جب ہم صبر و ضبط سے کلیجہ مُنہ کو آنے لگتا ہے تو تمہیں خط لکھ کر بارِ غم ہلکا کر لیتا ہوں۔ ذرا غور کرو، فطرت کی جفا پیشگی اور میری بیچارگی پر غور کرو، کہ ستم ایجاد قدرت نے برق و خرمن کو ایک جگہ بند کر رکھا ہے میں کہتا ہوں کہ قطرۂ شبنم کی ہستی ہی کیا کہ اُس کی آزمائش آفتاب کے روبرو کی جائے۔ میں عین منجدھار میں کھڑا اپنے کپڑوں کو پانی میں تر ہونے سے بچا رہا ہوں۔ کیا تنکے کو آگ میں رکھ کر جلنے سے روکنے کی کوشش بارآور ہو سکتی ہے اور کیا شمع و پروانہ کی یک جائی سے موت و بربادی کے سوا کسی اور منظر کی توقع بھی قائم کی جا سکتی ہے؟ صبح سے شام اور شام سے پھر طلوعِ سحر تک ایک غیر مختتم سلسلۂ خیالات کی الجھنوں میں گرفتار رہتا ہوں۔ ایک ہی مکان میں ایک ہی ماحول کے اندر، مجھ سے چند گز کے فاصلے پر "وہ" مقیم ہے جب قرب کا یہ عالم ہو تو بتاؤ دلِ دیوانہ اگر آپے سے باہر ہو ہو جلنے تو کیا عجب ہے لیکن یقین جانو، ہر چند کہ میرے جذبات میں آگ لگ رہی ہے میری آنکھوں اور میرے ہونٹوں پر مُہرِ ثبت ہو چکی ہے۔ میری ایک بدلی ہوئی نگاہ، میرا ایک معنی خیز لفظ میری ہلاکت کا باعث اور ایک گھرانے کی ذلّت و رُسوائی کا پیامبر بن سکتا ہے۔ قطرے دریا میں اور چنگاریاں شعلوں میں تبدیل ہونا چاہتی ہیں۔ تمنائیں تڑپ تڑپ کر

اور دل مچل مچل کر اپنی داستانِ غم سُنانے پر مصر ہے۔ لیکن میں ہوں کہ پتھر کی بوجھل سِل اپنے سینے پر رکھ کر آہوں کے دبانے اور نالوں کے روکنے میں مصروف ہوں۔ مَیں جانتا ہوں کہ غم و اندوہ کا یہ طوفان رُکنے والا نہیں، اور یہ دریا ایک نہ ایک روز ضرور بہ نکلے گا۔ لیکن اس ساعت کا تصوّر اور اس انجام کا تخیّل ہی میرے رگ و ریشہ سے زندگی کی حرارت کھینچ لیتا ہے۔ میری یہ حیاتِ مستعار یقیناً ایک حقیر شے ہے لیکن "ز" کی عزت و آبرو ایک فردوسی، ایک ملکوتی، ایک آسمانی ہیرا ہے۔ اور اگر اس ہیرے کی آب و تاب کو برقرار رکھنے کی خاطر مجھے اپنی قربانی کی ضرورت پیش آئی تو مَیں ہرگز دریغ نہیں کرونگا۔

۱۱- فروری ۱۹۲۶ء

"سیکڑوں مرتبہ ایسا ہوا کہ قریب تھا مَیں اسے اپنے آغوش میں لے لُوں۔ الٰہی یہ کس قدر رُوح فرسا عذاب ہے کہ حسن مجسّم ہو کر آنکھوں کے سامنے پھرے اور اُسے مس کرنے کی بھی اجازت نہ ہو! حالانکہ مس کرنا نفسِ انسانی کے تمام جبلّی رجحانات میں اوّل درجے پر ہے کیا بچّے ہر چیز کو چھونے کی کوشش نہیں کرتے؟"

یہ الفاظ جرمنی کے مشہور فلسفی ادیب گوئٹے کی ایک اہم تصنیف

سے مَیں نے نقل کئے ہیں۔ لیکن ہائے ان الفاظ کے معانی، ان الفاظ کی جانگداز حقیقت کوئی میرے دل سے پوچھے۔

کئی روز ہوئے ہیں نے شام کی ہوا خوری ترک کر دی ہے۔ شام کی سیر میں مجھے خالدادر" ز" کے ہمراہ جانا پڑتا تھا۔ تم پوچھو گے کہ پھر اُس کا قرب حاصل کرنے کا یہ ذریعہ مَیں نے برضا و رغبت کیوں ضائع کر دیا۔ بھائی! اس کا جواب یہی ہے کہ مجھے اپنے آپ پر اعتماد نہیں رہا۔ گاڑی میں اُس کے بالمقابل بیٹھ کر مجھ پہ ایک بے خودی، ایک وارفتگی سی طاری ہو جاتی ہے۔ اُس کی سیاہ آنکھیں، جنہیں دیکھتے رہنا میرے لئے ہزار عشرتوں کی ایک عشرت ہے، میرے سامنے ہوں۔ اُس کے ریشمیں ملبوس سے ہلکی ہلکی خوشبو نکل کر میرے مشامِ جاں کو معطر کر رہی ہو۔ اس کے لب ہائے لعلین کا ہوشربا تبسّم مجھ پر بجلیاں گرا رہا ہو۔ اور وہ با ایں نازو رعنائی، اپنی دلبری کی ساحرانہ قیامتوں کے ساتھ، عین میرے سامنے

اِک بدیعہ جمال، اک حدیقۂ حُسن و شباب بن کر بیٹھی ہو ——

یوں بیٹھی ہو کہ میرا جسم اُس کے لباس کی سرسراہٹ اور اُس کے ہاتھوں کا لمس تک محسوس کر رہا ہو —— تو بتاؤ اس جذبات انگیز فضا میں تمیز کرنے کی صلاحیت ضائع کر بیٹھوں تو کیا عجب ہے۔ گذشتہ ہفتے کا ذکر ہے جب ہم سیر کے لئے نکلے تو گاڑی میں سوار ہوتے وقت اتفاق

سے میرا ہاتھ اُس کے ہاتھ سے چھُو گیا۔ میرے اعصاب میں ایک بجلی سی دوڑ گئی اور مدّت تک مَیں اپنے اندر ایک ارتعاش محسوس کرتا رہا۔ اس روز وہ خلافِ معمول لکھنؤ کی بیگمات کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ اُس کے حسین و شاداب چہرے پر ایسی تازگی تھی جیسے موسمِ برشگال میں کھُل کر بارش ہو جانے کے بعد ٹھنڈی ہوا میں لہلہاتے ہوئے گلشن کا رُوح افزا نظارہ۔ مَیں بار بار اُس کے چہرے کی طرف آنکھیں اُٹھاتا اور پھر دائیں بائیں دیکھنے لگ جاتا تھا۔ وہ موسم کی خوبی کا ذکر کر رہی تھی لیکن میرے لئے فطرت کے حسین مناظر، پہاڑیوں کے خوشنما سلسلے، آفتابِ بہار کی تابانی اور بید کے درختوں کے درمیان آہستہ آہستہ بل کھاتی ہوئی بہنے والی ندّی اپنی تمام دلکشی ضائع کر بیٹھی ہے۔ خارجی دُنیا کا حسن سمٹ سمٹا کر میرے لئے صرف ایک نقطہ میں جمع ہو گیا ہے اور اب اگر کوئی چیز خوبصورت نظر آتی بھی ہے تو اُسی کے پرتو سے اور اگر کوئی شئے گھڑی بھر کے لئے میری توجہ کو جذب کرنے میں کامیاب بھی ہوتی ہے تو اسی صورت میں کہ وہ اس کے عکسِ جمال سے منوّر ہو رہی ہو۔ میرا یہ طرزِ عمل بے اختیارانہ اور بہت حد تک مجبورانہ ہے۔ کوئی شخص میرے دل میں مسرت و انبساط اور بہجت و شادمانی کے وہ جذبات داخل نہیں کر سکتا جن کے قبول کرنے کی مجھ میں فطرتاً استعداد نہیں۔ خود مَیں شب و روز، صبح و شام اپنے

سینے میں ایک خلا محسوس کر رہا ہوں۔ ——— ایک وحشت انگیز خلا! آہ کبھی کبھی مَیں سوچتا ہُوں کہ اگر ایک بار، صرف ایک بار، اُسے اپنے سینے سے لگا لُوں تو یہ خلا ہمیشہ کے لئے پُر ہو جائیگا۔

---

۱۴ مئی ۱۹۲۶ء

اُس کا التفات میرے لئے اور زیادہ تباہ کُن ہے۔ اُس کی لطف و عنایت کی نگاہیں جو وہ مجھ پر کبھی کبھی ڈالتی ہے میرے صبر و شکیب کی سب سے خطرناک آزمائش ہیں۔ میری طبیعت کی اُداسی اور جذباتِ پنہاں کی طویل کشمکش نے میری صحت پر بہت بُرا اثر ڈالا ہے۔ اگرچہ اب موت اور زندگی صحت اور بیماری زخم اور اندمال میرے لئے مترادف الفاظ رہ گئے ہیں۔ مَیں کئی دن سے سیر کو نہیں گیا۔ کھانا بھی متعدد بار نہیں کھایا۔ عذر یہی پیش کرتا رہا ہوں کہ بیمار ہوں۔ آخر وہ خود کل مجھے دیکھنے کے لئے آگئی۔ اُس کے آنے سے ایک گھنٹہ پہلے میں بے اختیار رو رہا تھا۔ مَیں حیران ہوں میری آنکھوں میں اتنے آنسو کہاں سے آگئے۔ تمہیں یاد ہے میں زندگی کی بڑی سے بڑی مصیبت پر بھی رونا نہیں جانتا تھا۔ مَیں نے قید و بند کے شدائد جھیلے ہیں۔ مَیں نے حکومت کی شدید سزائیں برداشت کی ہیں۔ لیکن میری آنکھیں

ہمیشہ خشک رہیں۔ اب مَیں ہوں اور شغلِ گریہ۔ وہ میرے کمرے میں آئی اور آتے ہی نہایت ملاطفت سے میری طبیعت کا حال پوچھنا شروع کیا۔ ادھر میری گھبراہٹ کا یہ عالم تھا جیسے اسکول کا کوئی طالبعلم شرارت کرتا ہوا پکڑا جائے۔ گویائی کی طاقت میری زبان سے زائل ہوگئی اور مَیں حیرت و استعجاب سے اُس کا مُنہ تکنے لگا۔ وہ بیس منٹ کے قریب بیٹھی۔ مجھے دوا اور غذا کے متعلق ہدایات دیتی رہی خوش و خرم رہنے کی نصیحتیں کرتی رہی۔ وہ مجھ سے اس قدر نزدیک بیٹھی تھی کہ مَیں اُس کے تنفس کی گرمی محسوس کر رہا تھا۔ میرے جی میں آئی کہ اس کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگالوں۔ اپنے سر کو اُس کے قدموں پر گرا کر اُس کے پاؤں کو آنسوؤں سے تر کر ڈالوں اور اگر وہ چند لمحے اور بیٹھتی تو شاید مَیں یہ سب کچھ کر ہی گزرتا۔

میرے عزیز بھائی! یہ بارِ غم، یہ اندوہِ محبّت، یہ کاہشِ فراق میں کب تک برداشت کئے جاؤں۔ میرا سینہ اس راز کی تاب نہ لاکر ایک نہ ایک روز پھٹ جائے گا۔ لیکن وہ روز میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔ غالبؔ کے اس شعر کا مفہوم مَیں غالبؔ سے بھی زیادہ سمجھتا ہوں۔

لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے
ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی

۳ر جولائی ۱۹۲۶ء

خدارا یوں دق نہ کرو۔ تم مجھے بار بار لاہور کیوں بلاتے ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں "اُس" سے دُور رہ کر زندگی گزار سکوں گا؟ اگر تمہارا یہی خیال ہے تو اس خیال کو جلد از جلد اپنے دماغ سے نکال دو۔ اگرچہ یہاں رہنا بھی میرے جسم و جاں کے لئے ایک مستقل عذاب سے کم نہیں لیکن اتنا تو ہے کہ میں "اُسے" دن میں چند بار دیکھ لیتا ہوں۔ یہ عجیب کشمکش ہے کہ یہاں رہ کر بھی میں خوش نہیں اور یہاں سے چلے جانا بھی مجھے منظور نہیں۔ آخر اس درد و کرب کا، اس حزن و ملال کا، اس سوزِ ناتمام کا انجام کیا ہوگا۔ تم نے کبھی سوچا؟ اگر نہیں سوچا تو مجھ سے سن لو۔ اس کا انجام ہے ——— موت!!

اُس کی ماہ پیکر و حُور تمثال شخصیت کا عکس اپنے آئینۂ قلب پر اُتار کر، اُس کے تصوّر کی مدہوشیوں سے اپنے دل و دماغ کو مخمور کر کے، اُس کی سیاہ آنکھوں کے تاب ناک جلووں سے اپنی روح کی ویران خلوتوں کو منوّر کر کے اس جہان سے گذر جانا، اس ظلمت کدۂ ارضی سے سفر کر جانا ——— آہ کس قدر حسین و دلآویز تخیّل ہے۔ شاعری کی دُنیا اسی تخیّل سے رنگین ہے، ادب کا سرمایہ اسی تخیّل سے برقرار ہے۔ اور مصوّری کا جہانِ آب و رنگ اسی تخیّل سے نظر فریب ہے۔

اصمعی کی وہ مشہور نظم جس کا اردو ترجمہ شائع ہو چکا ہے تم نے پڑھی ہی ہوگی۔ ایک فرقت زدہ مریضِ عشق کے لئے اُس نے کیسا اچھا نسخہ تجویز کیا ہے ؎

جس کو فرقت بہت ستاتی ہو
جس نے کھایا ہو چاہ میں دھوکا
جس کو افشائے راز کا ڈر ہو
جس سے اب صبر ہو نہیں سکتا
اُس کا عمدہ علاج مرنا ہے
اس سے بہتر نہیں کوئی نسخہ

اب میری یہی آرزو ہے کہ تم مجھے موتوں اور ہلاکتوں کے لئے تنہا چھوڑ دو اور بھول جاؤ۔ اس مقتل میں میری ناچیز جان کا ہدیہ اُن قربانیوں کی طویل فہرست میں ایک حقیر سا اضافہ کرے گا جو قربانگاہِ عشق پر روزِ ازل سے انسان پیش کرتا آرہا ہے اور یونہی پیش کرتا چلا جائے گا ——— اُس وقت تک کہ انسانی دل دردِ محبّت کی خلش سے محروم نہیں ہو جاتے ——— میں اپنے اندر انبساط و انقباض کے مخلوط جذبات کی شورش محسوس کر رہا ہوں۔ خدا جانے کیوں۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ اس وقت جب میں آخری نتیجہ پر پہنچ چکا ہوں مجھ پر خوشی طاری ہوتی یا غم، یہ دونوں کی آمیزش

کیسی؟ شاید اس لئے کہ اُس غارت گرِ دین و ایماں، اُس فتنہ گرِ ہوش و حواس اُس جانِ آرزو اور ہائے اس آرزوئے جاں کے کان میرے افسانۂ غم سے اب تک آشنا نہیں ہوئے۔ اُس کی آنکھیں میرے دل کی حشر سامانی اور میرے جگر کی خونچکانی سے اب تک واقف نہیں ہوسکیں۔ کیا اس سے زیادہ جبر کوئی انسان اپنے نفس پر کرسکے گا۔ اور کیا اس سے بڑھ کر حرماں نصیبی و تیرہ بختی ابنِ آدم کے حصے میں آسکتی ہے؟ آہ اس کرۂ ارض پر، اس روئے زمین پر، تم ہی وہ شخص ہو جسے اُس راز سے آگہی ہے جو مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے اور جو شاید میرے ساتھ ہی زمین میں دفن ہوجائیگا۔

یہ خط ملا تو گویا مستقبل کے تمام اندیشے حقیقت مجسم بن کر میرے سامنے آگئے اور میں پریشان و ہراساں ہوکر اپنی اوّلیں فرصت میں ندیا کی طرف بھاگا چوتھے روز وہاں پہنچا لیکن افضال میرے پہنچنے سے قبل دُنیا سے رُخصت ہوچکا تھا۔

فریبِ حُسن

فیّاض کو ایک مرتبہ دیکھ کر بھول جانا ممکن نہ تھا۔ اُسکی سُرخ و سپید رنگت، یعنی میدے اور سیندور کی ملاوٹ، فراخ پیشانی، بھرے ہوئے گلّے، ستواں ناک، سڈول بازو، یہ چیزیں تھیں جو اُسے ایک نظر دیکھ لینے کے بعد برسوں دماغ میں موجود رہتیں۔ چھ فٹ لمبا قد اور چوڑا سینہ۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ ہزار آدمی میں بھی اُس کا چھپنا محال تھا۔ جامہ زیب ایسا کہ گاڑھے کے کپڑوں میں بھی دولھا معلوم ہو۔ عمر میں وہ مجھ سے پانچ چار سال بڑا تھا۔ تعلیم میں بھی آگے تھا۔ مَیں جب کالج میں داخل ہوا تو وہ ایم اے میں پڑھتا تھا۔ اس کے حسنِ صوری و معنوی کی وجہ سے کالج کا ہر شخص اُسے جانتا تھا۔ ذہنی و باطنی محاسن عطا کرنے میں بھی قدرت نے بڑی فراخدلی سے کام لیا تھا۔ بے حد ملنسار اور خلیق۔ متواضع اتنا کہ اپنا ہرج کر کے دوسرے کو خوش کرنا وہ فرض سمجھتا تھا۔ لیکن اُسکے اخلاق کی سب سے نمایاں خصوصیّت، وہ خصوصیّت جو حدِّ اعتدال پر

رہ کر اُس کی آئندہ کامیابی کی بہت بڑی معاون ثابت ہوتی، اُس کا حُسنِ ظن تھا۔ وہ ضرورت سے زیادہ خوش گمان واقع ہوا تھا۔ اُس سے گفتگو کرتے وقت ذاتیات کے موضوع کو ضرور بالائے طاق رکھنا پڑتا تھا۔ اور اگر بھولے سے کسی کی ذات مبحث بن بھی گئی تو اُس کے مُنہ سے ہمیشہ کلمۂ خیر ہی نکلتا تھا۔ دوسرے کو بُرا جاننا یا بُرا کہنا اس کے نزدیک بہت بڑا عیب تھا۔ وہ دُنیا کو ایسی عینک سے دیکھنے کا عادی تھا جو نیکی اور صفائیٔ قلب کے شیشوں سے بنی ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ اِس جہانِ خیر و شر میں، جہاں تصنّع اور منافقت نے اندھیر بپا کر رکھا ہے، اس قماش کے لوگوں کے لئے عافیت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا سامان بہت کم ہے۔ ظاہر و باطن کی یگانگت کی مثالیں شاذ و نادر ہی ملیں گی۔ کتنے ہنستے ہوئے چہرے ایسے ہیں جن کے عقب میں مغموم و پژمردہ دل نہیں چھپے ہوئے اور کتنی معصومیت و پاکیزگی سے لبریز آنکھیں جن کے پیچھے حقیقتاً ویسی ہی معصوم و پاکیزہ روحیں جلوہ فگن ہیں؟ ملمع کا سونا سمجھ لینے والے شخص کے لئے یہاں قدم قدم پر ٹھوکریں اور لغزشیں ہیں۔

معاشرتی اور تعلیمی زندگی میں فیاض، مجھ سے اتنا آگے تھا کہ میری اُس کی دوستی محالات سے تھی۔ مَیں ابھی کالج کے مبتدیوں میں تھا اور

وہ ایم اے کا طالب علم لیکن یہاں میرے مذاقِ ادب نے میری رہنمائی کی۔ مجھے ابتدا سے ادبیات اُردو کا بہت شوق تھا۔ اور اپنی عمر کے لحاظ سے مَیں نے اُن سے کافی فائدہ اُٹھایا تھا۔ اسکول ہی میں میں نے مشہور اساتذہ کے دواوین کے مطالعہ سے اچھی خاصی معلومات بہم پہنچالی تھیں تحریر میں اگرچہ پختگی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ مگر مَیں نے جھجکتے جھجکتے ادبی مجالس میں حصّہ لینا شروع کر دیا تھا۔ کالج میں "بزمِ سخن" کے اجلاس مہینہ میں دو، ایک بار ضرور ہوتے تھے جن میں طلبہ بڑے ذوق سے شریک ہوتے اور اپنے کلام سے حاضرین کو محظوظ کرتے تھے فیاض تو کالج کے علمی و ادبی حلقوں کی ایک نامور شخصیت تھی۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ بزمِ سخن اُس کی توجہات سے محروم رہتی۔ چنانچہ یہاں اعزازی صدارت کے فرائض اُس کے سپرد تھے۔ قطع نظر اس منصب سے وہ نہایت پاکیزہ مذاقِ ادب اور صحیح نقادانہ نگاہ کا مالک تھا۔ انگریزی سے چونکہ وہ خوب مستفید ہوا تھا اس لئے ہر وقت اس امر میں کوشاں رہتا کہ کسی طرح اُن مختلف علوم کو جن سے انگریزی زبان بھری پڑی ہے اُردو میں منتقل کیا جائے۔ اس سلسلہ میں اُس کی بعض قابلِ تعریف کوششیں ملک بھر میں استحسان کی نظر سے دیکھی گئی تھیں۔ مَیں بھی التزاماً بزمِ سخن کے جلسوں میں شامل ہوتا تھا۔ لیکن وہ حجاب

جو کالج کے ہر نو واردِ طالب علم پر بُری طرح مسلّط ہوتا ہے مجھے اس میں مزید حصّہ لینے سے روکتا رہا۔

آخر کئی ماہ کے قیام کے بعد مَیں اس قابل ہوا کہ عملی طور پر اس کی کارگذاریوں میں شرکت کر سکوں۔ مَیں نے محنت سے ایک طویل مضمون "اُردو افسانہ نویسی" پر لکھا جس میں افسانے کے ارتقائی پہلوؤں پر بحث کرنے کے علاوہ اس کے مستقبل کے متعلق بھی چند اشارات کئے اُن تمدّنی رکاوٹوں کا ذکر کرتے ہوئے جو ہمارے افسانے کی ترقی میں حارج ہو رہی ہیں۔ مَیں نے اس امر پر خصوصیّت سے زور دیا کہ "ہمیں ناولوں اور مختصر افسانوں کے لئے نسوانی کردار نہیں ملتے۔ ہندوستان میں پردہ اس شدّت سے رائج ہے کہ پردہ نشین عورت کو سوسائٹی میں لانا قطعی غیر ممکن ہو گیا ہے۔ بدقسمتی سے ملک کی موجودہ مضرت رساں سیاسی کشمکش نے برادرانِ وطن کو اُردو سے بہت دُور کر دیا ہے۔ ہندوؤں میں پردے کی اتنی سختی نہیں جتنی مسلمانوں میں ہے۔ اس لئے اگر وہ چاہتے تو اپنی طرزِ معاشرت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اُردو کو جدید ترین طرز کے افسانوں سے مالا مال کر دیتے۔ مگر افسوس کہ اس دَور میں بچاری اُردو کو بھی عہدِ اسلامی کی یادگار شمار کر کے اُس سے مقاطعہ کی ٹھان لی گئی ہے۔ ہمیں افسانہ کے لئے اس قسم کی ہیروئن درکار ہوتی ہے جو اپنی حرکات و سکنات کے لحاظ سے سماج

ہیں ایسی ہی آزاد اور بے تکلّف ہو جیسا مرد۔ مگر ان حالات و روایات کو دیکھتے ہوئے جو ہمارے ملک پر ابرِ سیاہ کی طرح چھائے ہوئے ہیں یہ توقع کرنا کہ مستقبلِ قریب میں ہمارے معاشرتی قوانین ایسی عورت کو منصّۂ شہود پر لا سکیں گے خام خیال ہے۔ ان قیود نے ہماری افسانہ نویسی میں ایک دردناک رکاوٹ پیدا کر دیا۔ آپ دورِ حاضر کے افسانوں کو نظرِ غائر سے دیکھئے وہ ایک ہی محور پر گھومتے نظر آتے ہیں۔ گنتی کے چند افسانہ نگار جو اس وقت اپنی بساط کے مطابق ہماری زبان کی خدمت کر رہے ہیں۔ ان دقتوں کو محسوس کرتے ہیں لیکن عبور نہیں کر سکتے۔ اُنہیں مجبوراً ہیروئن کی تلاش میں غیر قوموں کی طرف توجہ کرنی پڑتی ہے۔ مگر ان مختلف قوموں کی تہذیب و تمدّن سے کماحقہٗ آگاہ نہ ہونے کے باعث نگارش واقعات میں ایسی فاش غلطیاں کر جاتے ہیں جو افسانہ کو اصلی معیار سے بہت نیچے گرا دیتی ہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے یہ صورتِ حال کب تک قائم رہے گی۔ ڈر ہے کہیں مایوسی کے عالم میں ہمیں یہ شعر نہ دُہرانا پڑے کہ ؎

عطا ہو اُس وفا دشمن کو توفیقِ کرم یا رب

مگر نہیں، ہمیں ہر حالت میں روشن پہلو پر نظر رکھنا چاہئے۔ فطرت اتنی بخیل نہیں کہ ادنےٰ سی بخشش کے لئے ہماری بڑھتی ہوئی آرزوؤں کو کچل دے۔ عنقریب ہم میں وہ جوہرِ قابل پیدا ہوگا۔ جو ان بندشوں کو توڑ کر پردہ نشین

عورت کو اُس کے تمام ضروری لوازم کے ساتھ افسانہ کی دنیا میں لے آئیگا۔"

مَیں مضمون پڑھ چکا تو بزم کے متعدد اراکین نے معقول داد دینے کے علاوہ تعریف و تحسین سے میری حوصلہ افزائی کی۔ بس یہ واقعہ تھا جس سے میرے اور فیاض کے تعلّقات استوار ہونا شروع ہوئے۔ اگلے ہی روز وہ میرے کمرے میں آیا اور دیر تک باتیں کرتا رہا۔ گفتگو زیادہ تر شب گذشتہ کے جلسے، ادبی رسایل اور موجودہ ملکی حالات کے متعلق ہوتی رہی۔ مَیں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ اس کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا کتابی مطالعہ سے زیادہ سود مند ثابت ہوگا۔ رسمی تعارف کی ضرورت باقی نہ رہی تھی اس لئے مَیں نے کوشش سے اس کے ساتھ میل جول بڑھانا شروع کیا۔ دن بھر میں کئی مختصر ملاقاتیں ہونے کے علاوہ شام کو کھانے سے پہلے عموماً ایک لمبی نشست ہوتی تھی جس میں ہم دُنیا جہان کی گپیں ہانکا کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ ہم دوست بن گئے۔ اور آپ کے بجائے ایک دوسرے کو تم سے خطاب کرنے لگے۔

مَیں فیّاض کا دوست کیا بنا مجھ پر اُس کی نئی دُنیا ظاہر ہو گئی۔ وہ متین، خاموش طبع، صرف کام سے مطلب رکھنے والا شخص جذبات کی لاتعداد چنگاریوں کا ایک مجموعہ تھا۔ جن کی گرمی سے بعض اوقات وہ کباب سیخ کی کی طرح پہلو بدلتا تھا۔ اُس کی مثال اُس سمندر کی سی تھی جو خاموش و

پُرسکون سطح کے نیچے شورش و اضطراب کے لاکھوں طوفان پنہاں رکھتا ہو
اُس کا حسّاس دل سب سے زیادہ حُسن کی فسوں کاریوں سے متاثر ہوتا تھا۔
کئی بار ایسا ہوا کہ تنہائی میں بیٹھے بیٹھے میں نے کوئی چبھتا ہوا شعر پڑھ دیا۔
بس پھر کیا تھا۔ فیاض صاحب کے قلب کی سب سے نازک رگ پھڑک
گئی اور وہ تمام کام چھوڑ چھاڑ کر تصوّرات کی دُنیا میں جا پہنچے۔ اب بلاتا ہوں
تو بولتے نہیں۔ جھنجھوڑتا ہوں تو جنبش نہیں کرتے۔ شاید یہ ایک حقیقت
ہے کہ حُسن ہمیشہ حُسن کو چاہتا ہے، نہ صرف چاہتا ہے بلکہ اس میں چاہنے
کا جذبہ دوسروں کی بہ نسبت زیادہ قوی ہوتا ہے۔ فیاض کا تشنۂ محبت
دل آگ کی مانند تھا جسے اہم ذمہ داریوں کے احساس، آئندہ کی فکر اور
کام کاج کی کثرت نے مضبوطی سے اپنے اندر دبا رکھا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ
جس وقت یہ بوجھ کم ہوا دبی ہوئی آگ شعلہ بن کر بھڑکے گی اور جو کچھ اُس
کی لپیٹ میں آیا جلا کر بھسم کر دے گی۔ میری دلی دُعا تھی کہ فیاض کی
زندگی ایسی جانگداز ساعتوں سے محفوظ رہے اور اگر خدانخواستہ اُسے ایسے
موقعے سے دوچار ہونا بھی پڑے تو وہ ضبط و تحمل کو کام میں لا کر اپنے آپ
کو اُس کے مہلک چنگل سے بچا سکے۔

فیاض کے دل میں ایک خلش تھی جو اُسے اکثر مضطرب رکھتی۔ عوام
کی نگاہیں شاید اُس کے مطمئن و پُرشکرہ چہرے کو دیکھ کر اُس کی بے چینی کا اندازہ

نہ کہہ سکتی ہوں مگر میں جو اُس کی خلوت و جلوت کا شریک ہو گیا تھا۔ کب تک بے خبر رہ سکتا تھا لیکن میں موقع کا منتظر تھا۔ کہ ذرا سی ٹھیس سے وہ راز خود ہی باہر آجائیگا۔ ایک شام ہم حسب معمول بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتوں میں مصروف تھے۔ دورانِ گفتگو میں فیاض نے کسی طرح میرے اُس مضمون کا جو میں نے اُردو افسانہ نویسی کے موضوع پر بزم سخن کے ایک اجلاس میں پڑھا تھا ذکر چھیڑ دیا اور کہنے لگا۔ "تم نے اُس روز بہت زور سے شکایت کی تھی کہ ہمیں افسانوں کے لئے نسوانی کردار نہیں ملتے۔"

مَیں نے جواب دیا۔ "تو کیا تمہیں اس سے اختلاف ہے؟"

"نہیں، اختلاف تو نہیں۔ تمہاری اس شکایت کو رفع کرنے کی ایک ہنگامی تدبیر سُوجھی ہے۔"

"کیا"

"کل بتاؤں گا۔"

"آخر کچھ تو کہو۔"

"تم تو پیچھے ہی پڑ جاتے ہو۔" اُس نے بظاہر بے پروائی کے لہجہ میں جواب دینے کی کوشش کی۔ حالانکہ اس کی دلی کیفیات اس وضعی لہجے کو جھٹلا رہی تھیں۔ "بات اتنی ہے کہ مجھے یہاں ایک خاتون سے تعارف

حاصل ہے۔ جو نہایت تعلیم یافتہ اور مہذب ہونے کے علاوہ بہت قبول صورت بھی ہیں۔ میرا خیال تھا اُن سے مل کر تم اُن کی جامع صفات ذات سے ضرور کسی افسانہ کا مواد مہیّا کر سکو گے۔"

"لیکن کیا وہ مجھ سے ملنا پسند کریں گی؟ وہ پردہ نہیں کرتیں؟"

"پردہ تو یقیناً کرتی ہیں۔ مگر میرے لئے خاص رعایت ہے اور یقین ہے جس کو مَیں اپنا دوست کہہ کر پیش کروں گا وہ بھی اسی رعایت کا مستحق سمجھا جائیگا۔"

"اُن کا نام کیا ہے؟"

"تمہیں کوئی شجرہ نسب لکھنا ہے؟ کہہ جو دیا باقی کل سہی۔ صبر نہیں ہو سکتا تو لو سُنو۔ اُن کا نام ہے زلیخا۔"

فیاضؔ تو اتنا کہہ کر چل دیا اور مَیں ایک ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ "زلیخا۔ کتنا پیارا نام ہے۔" اور نام کے ساتھ ہی وہ تمام عشق آفریں روایات جو روزِ ازل سے اس کے ساتھ وابستہ ہو چکی ہیں۔ میرے دماغ میں بجلی کی طرح پھر گئیں۔ "گویا فیاضؔ مجھے ایسی عورت سے ملانا چاہتا ہے۔ جو اُس کے خیال میں کسی افسانے کا مواد مہیّا کرے گی کہیں عہدِ عتیق کی زلیخا اپنی کہربائی قوتوں کے ساتھ پھر کوئی رومانِ محبت پیدا کرنے کے لیے تو جلوہ گر نہیں ہو گئی؟ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔"

دماغ کو زیادہ موشگافیوں سے تھکانے کی بجائے مَیں خاموشی سے بستر پر جا لیٹا کہ اگلی صبح طلوعِ آفتاب کے ساتھ سب معاملات روشنی میں آجائیں گے۔ فیاضؔ کے سرسری الفاظ میں کوئی گہرے معانی پوشیدہ نہ تھے۔ اور نہ میں سمجھتا ہوں کہ اُس نے وہ آئندہ کے متعلق کسی پیشگوئی کے طور پر کہے ہونگے۔ مگر حیرت ہے کہ مستقبل نے ان الفاظ پر صداقت کی کیسی خطرناک مہر ثبت کر دی۔ کہ آج جس واقعہ کو افسانے کی صورت میں پیش کر رہا ہوں وُہ انہی دو ہستیوں، فیاضؔ اور زلیخا کا شرمندۂ احسان ہے۔

دوسرے روز کالج سے فارغ ہو کر سہ پہر کے قریب فیاضؔ مجھے اپنے ہمراہ لے گیا۔ میرا خیال تھا کہ کاشانۂ حبیب تک پہنچنے سے قبل وہ مجھے وہاں کے تمہیدی حالات سے مطلع کر دے گا۔ مگر اس نے تو ایک ہی چُپ سادھ لی۔ پُرانی انارکلی میں ایک خوش وضع دو منزلہ مکان کے پاس جا ٹھہرے۔ اُس نے دروازہ پر دستک دی اور ایک بارہ چودہ سال کا لڑکا ملازموں کا لباس پہنے نیچے اُترا۔ فیاضؔ کے استفسار پر اُس نے جواب دیا کہ اُس کی مالکہ اُوپر والی منزل میں ہے۔ اُس نے ہماری آمد کی اطلاع کی۔ چند منٹ کے بعد ہم اندر بلائے گئے۔ بیٹھنے کے کمرے میں سامان بہت زیادہ نہ تھا۔ مگر جس صفائی اور خوش ترتیبی سے سجایا گیا تھا وہ یکین

کے حسنِ مذاق اور نفاستِ طبع کی بیّن دلیل تھی۔ مَیں اور فیاض ایک بڑے صوفے پر بیٹھ گئے۔ کمرے میں بالکل خاموشی تھی اور میرا اضطراب ساعت بساعت زیادہ ہو رہا تھا۔ جیسے کسی بہت بڑے راز کا انکشاف ہونے والا ہو۔

ملحقہ کمرے کے دروازے پر لٹکے ہوتے دبیز پردے کو جنبش ہوئی۔ اور ایک عورت، عورت کہوں یا لڑکی، اُس کا معصوم اور خوبصورت چہرہ اُسے بہت نوعمر ظاہر کر رہا تھا۔ اندر داخل ہوئی۔ فیاض فوراً اُٹھا۔ اور جھک کر آداب بجالایا۔ دوسری جانب سے نہایت لطیف و شیریں آواز آئی۔ "فیاض صاحب، آپ کا مزاج اچھا ہے۔" اور ساتھ ہی اُن یاقوتی لبوں کے اندر سے، جنہیں ایک دلفریب تبسّم نے جدا کر دیا تھا، سپید موتی جھلکتے ہوئے نظر آئے۔

فیاض بھول گیا کہ مَیں بھی اُس کے ہمراہ آیا تھا۔ چند منٹ کی خود فراموشی کے بعد اُس نے ندامت آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر گویا معذرت کے طور پر، زلیخا کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ معاف فرمائیے گا۔ مَیں تعارف کی ضروری رسم ادا کرنا بھول گیا۔" میری طرف اشارہ کرکے "آپ میرے عزیز دوست مظفر احمد ہیں۔ کالج کے علمی حلقے کے ایک ممتاز رکن اور نہایت پاکیزہ مذاقِ ادب کے مالک۔ آج کل اِن

کی وجہ سے وقت بہت اچھا گذر رہا ہے۔ اور یہ سوچ کر کہ جس ہستی کی خوبیوں سے میں بہرہ اندوز ہو رہا ہوں اُس سے آپ کو کیوں محروم رکھوں آج بصد اصرار میں اُنہیں اپنے ہمراہ لے ہی آیا۔"

"بہت خوب" زلیخا نے چودھویں رات کے چاند سی حسین آنکھوں کو روشن تر بناتے ہوتے مجھ پر ایک نگاہ ڈالی اور ہلکا سا تبسّم چہرے پر لا کر کہا۔ "مجھے آپ سے مل کر بہت مسرّت ہوئی میں آپکی تشریف آوری کی تہ دل سے شکر گذار ہوں۔"

مَیں نے بھی اظہار نیاز مندی کے چند الفاظ کہے اور خاموش ہو گیا۔ گفتگو مختلف موضوعات پر ہوتی رہی۔ موسم کے تلوّن سے لیکر نفسِ انسانی تک تمام مسائل زیرِ بحث آ گئے۔ لیکن عجیب چیز جو مجھے محسوس ہوئی وہ گفتگو نہیں بلکہ گفتگو کرنے والوں کی حالت تھی۔ فیاض تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک ایک لفظ کے ساتھ جو اُس کی زبان سے ادا ہو رہا ہے۔ مٹا جاتا ہے۔ اور اپنی رُوح کی تمام آرزوئیں قلب کے تمام جذبات اور دماغ کے کُل تخیّلات پیش کر رہا ہے اِدھر زلیخا بھی مزے لے لے کر سنتی اور اس سے زیادہ مزے لے لے کر باتیں کرتی تھی۔ اِس دوران میں چائے بھی آئی اور زلیخا نے اپنے ہاتھوں سے بنا کر پلائی۔ فیاض نے دو ایک مرتبہ واپس جانے کے لئے کہا۔ مگر زلیخا نے ہر بار یہی کہہ کر

ٹال دیا۔ "آپ کتنی ہفتوں کے بعد آتے ہیں اور آدھ گھنٹہ بھی تو نہیں بیٹھتے۔ واللہ اگر معاشرت کی زیادہ پابندیاں نہ عائد ہوتیں تو میں خود حاضر ہوتی اور گھنٹوں نہیں دنوں آپ کے پاس رہ کر علمی صحبتوں سے مستفید ہوتی۔"

فیاض بھلا ان زہر میں بجھے ہوئے نشتروں کا کیا جواب دیتا مگر مجھے حیرت تھی کہ ان دونوں میں چاند کون ہے اور چکور کون۔ باتوں میں دونوں بہت محتاط تھے جس کی وجہ غالباً میری موجودگی تھی۔ مگر سیدھے سادے الفاظ کے بین السطور معانی معلوم کرنے کے لئے اُن کی کبھی منفعل اور کبھی شوقِ تمنّا سے لبریز آنکھیں، تھرتھراتے ہوئے ہونٹ اور چہروں کے متغیّر رنگ کا مطالعہ کافی تھا۔ مجھے یقین ہے اگر میں نہ ہوتا تو وہ اپنے دل کے محبوب راز جنہیں وہ اشارۃً و کنایتہً جتا رہے تھے ضرور زبان پر لاتے۔ جب ہم وہاں سے اُٹھے تو آفتاب غروب ہونے کو تھا۔ لوٹتے وقت فیاض پھر خاموش تھا۔ جیسے کوئی نشے میں ہو۔ مجھ سے نہ رہا گیا تو میں نے بات چھیڑنے کے بہانے سے کہا۔ "آج کی صحبت بھی خوب رہی۔"

"ہاں دیکھا آپ نے" اُس نے چونک کر جواب دیا۔ گویا وہ یکایک فضائے علوی سے زمین کی طرف آگیا ہے۔

"مگر مَیں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ زلیخا صاحبہ ہیں کون؟ بظاہر تو بہت شائستہ نظر آتی ہیں۔ لیکن لاہور ایسے شہر میں اُن کا تنہا رہنا کچھ معیوب معلوم ہوتا ہے۔"

"مَیں جانتا تھا تمہارے دل میں ضرور شکوک پیدا ہوں گے۔"

مَیں نے ذرا درشتی سے جواب دیا۔ "تو کیا حالات ایسے ہیں کہ ایک نوجوان لڑکی کا جسے آپ پردہ نشین بھی بتاتے ہیں اتنے بڑے شہر میں اکیلے رہنا خطرے سے خالی نہیں؟"

"میرے دوست، وہ اکیلی نہیں۔ اُس کے ساتھ اُس کی ماں بھی رہتی ہے۔" فیاض نے قریب آکر میرے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اور پھر نرمی سے کہنے لگا۔ "ان کی داستان بڑی دردناک ہے۔ مَیں تمہاری تشفی کے لئے مختصراً بیان کرتا ہوں۔ زلیخا کے والد بڑے صاحبِ نسب دولت تھے۔ اُن کی دو بیویاں تھیں اور دونوں سے اولاد بھی تھی۔ آخری عمر میں اُنہوں نے زلیخا کی والدہ سے نکاح کر لیا۔ زلیخا کی والدہ بدقسمتی سے بیوہ تھی اور بہت معمولی گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ زلیخا کے والد کے تمام کنبہ نے اس نکاح پر سخت غیظ و غضب کا اظہار کیا۔ مگر مرحوم کی وجہ سے کسی کی پیش نہ جا سکی۔ زلیخا ابھی اڑھائی سال کی تھی کہ باپ کا

انتقال ہو گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ مرحوم کے کل رشتہ داروں نے مل ملا کر زلیخا کی والدہ کو بیک بینی و دو گوش نکال باہر کیا۔ عورت ذات، نہ اتنا اثاثہ پاس کہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکے نہ کوئی مددگار جو مصیبت کے وقت دستگیری کرتا۔ بچاری صبر کر کے بیٹھ گئی۔ اور اپنی ننھّی بچّی کی تربیت میں مصروف رہی۔ اس دوران میں اُن پر سخت سے سخت وقت آئے۔ مگر اس اللہ کی بندی نے فاقے کاٹے، مصیبتیں جھیلیں لیکن ارادہ سے منہ نہ موڑا۔ زلیخا کو اعلیٰ تعلیم دلائی جس کے طفیل اب وہ یہاں مقامی اسکول میں ہیڈ مسٹرس ہے۔ معقول تنخواہ پاتی ہے جس میں دونوں ماں بیٹیوں کا شریفانہ گذارا ہوتا ہے۔ شکل و صورت کے لحاظ سے تم دیکھ ہی چکے ہو۔ ہزاروں میں ایک ہے۔ اس پر زیورِ علم سے آراستہ۔ سیکڑوں خواستگار پیدا ہو گئے ہیں۔ مگر وہ اپنی ماں کے تجربے کے باعث سرے سے شادی کے خلاف ہے۔"

جب تک فیاض کی یہ وکالت ختم ہو ہم ہوسٹل میں پہنچ چکے تھے میں نے پوچھا "آپ کو یہ حالات کیسے معلوم ہوئے؟"

"زلیخا کی زبانی"

"آپ جانتے ہیں وہ کون سے اسکول میں، ہیڈ مسٹرس ہے؟"

"نہیں! میں نے یہ دریافت نہیں کیا۔" فیاض نے بہت معصومانہ

انداز میں جواب دیا۔

"لیکن یہ تو بتائیے کہ آپ کا تعارف کس طرح ہوا؟"

"مظفرؔ! ایک عجیب واقعہ سے ابتدا ہوئی۔ تمہیں یاد ہوگا میرا ایک افسانہ جذبات کی آگ رسالہ آبشار میں چھپا تھا۔ ایڈیٹر نے مضمون کے ساتھ میری تصویر بھی شائع کی تھی۔ بس اُس کی اشاعت ہی ان تعلقات کی ذمہ دار ہوئی۔ اچانک ایک روز مجھے ایک خط آ گیا جس میں میرے مضمون کی بے حد تعریف کی گئی تھی۔ اور تصویر کے متعلق بھی بہت مبالغہ آمیز الفاظ استعمال کئے گئے تھے۔ لیکن سب سے زیادہ پُر لطف بات یہ تھی۔ کہ خط کے آخر میں مجھ سے ملنے کی بہت تمنّا ظاہر کی گئی تھی۔ میرے تعجب کی کوئی حد نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ خط ایک عورت کی طرف سے ہے، اور لکھنے والی کا نام زلیخا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میرے دل میں بھی اشتیاقِ ملاقات کے ولولے اُٹھے۔ میں بتائے ہوئے پتے کے مطابق مکان پر پہنچا اور یوں یہ راہ و رسم قائم ہو گئی۔"

مجھے اس کے بعد زلیخا سے ملنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ ہاں فیاض سے باتوں باتوں میں اکثر اُس کا ذکر ہو جاتا تھا۔ خواہش تو میرے دل میں کئی مرتبہ پیدا ہوئی کہ ایک بار پھر آنکھوں کو اُس نورِ مجسم سے روشن کروں مگر فیاض اُدھر جانے سے کچھ گریز کرتا تھا۔ بعد میں مجھ پر واضح ہوا کہ اُس کا گریز

کرنا صرف میری وجہ سے ہے۔ آہ عشق است و ہزار بدگمانی لیکن فیاض اپنے پر قابو نہ رکھ سکا۔ ایک روز وہ میرے سامنے پھوٹ بہا۔ اُس نے اعتراف کرلیا کہ وہ زلیخا کی محبت میں سرشار ہو چکا ہے۔ لیکن یہ بھی بتایا کہ زلیخا اُس سے بے اعتنائی کا اظہار نہیں کرتی۔ بلکہ بہت خلوص سے پیش آتی ہے۔ اُس نے ایک خط نکال کر دکھایا جو چند روز ہوئے زلیخا نے اُسے بھیجا تھا۔ بڑے محبّت آمیز لہجہ میں شکایت کی تھی "کہ آپ غریب خانہ پر آنے میں بہت تکلّف سے کام لیتے ہیں۔ کیا حرج ہے اگر شام کو سیر ہی کے سلسلہ میں چند گھڑی کے لئے یہاں آجایا کریں۔ غالباً آپ میرے ساتھ بھی اُن ہی قواعد پر کاربند رہنا چاہتے ہیں جو مردانہ دوستیوں میں برتے جاتے ہیں۔ آپ چاہتے ہونگے کہ ایک بار تشریف لائیں اور پھر مَیں بازدید کے لئے حاضر ہوں۔ باور کیجئے اگر مجھے آزادی نصیب ہوتی یا سماج کی بندشیں ذرا ڈھیلی ہوتیں تو مَیں آپ کو یہاں نہ آنے کی شکایت ہی کیوں لکھتی۔"

امتحان قریب آجانے سے میرے ہوائی قلعے تو سب مسمار ہو گئے تمام دن مطالعہ میں مصروف رہنا پڑتا تھا۔ فیاض سے اول تو ملاقات بہت کم ہوتی تھی۔ ملتا بھی تو کالج کا ماحول اتنا کاروباری ہو گیا تھا۔ کہ سوا پڑھنے لکھنے کے اور کوئی بات ذہن میں آہی نہیں سکتی تھی۔

خدا خدا کر کے امتحان ختم ہوا۔ نتیجہ نکلا۔ فیّاض اور مَیں دونوں کامیاب ہو گئے۔ مَیں بی اے میں داخل ہونے کے لئے پھر کالج میں آگیا، اور فیّاض فارغ التحصیل ہو کر سلسلۂ روزگار میں منسلک ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ کچھ عرصہ بعد اُس کا بہت مختصر سا خط آیا جس سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ وہ راولپنڈی کالج میں قائم مقام لکچرار مقرر ہو گیا ہے۔ بس یہ پہلی اور آخری اطلاع تھی جس سے مجھے اُس کے حالات کا کچھ علم ہو سکا۔ پھر پونے دو سال اُس نے ایک کارڈ تک لکھنے کی بھی تکلیف گوارا نہ کی۔ اتنی طویل خاموشی اور غیر حاضری کے بعد اُس کی غیر متوقع ملاقات نے بجائے اس کے کہ مسرت و شادمانی بخشی ہوتی، اُلٹا مجھے ورطۂ تحیّر میں ڈال دیا۔

ہوسٹل کی تیسری منزل میں میرا کمرہ تھا۔ امتحان شروع ہونے کے باعث ملاقاتوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ دن رات کا بیشتر حصّہ چار دیواری میں بند رہ کر کتب بینی میں صرف ہوتا تھا۔ ایک روز سہ پہر کے قریب کمرے کے دروازے پر کسی نے دستک دی۔ میں نے دروازہ کھولا اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔ سامنے فیّاض کھڑا تھا۔ لیکن اس حالت میں کہ اس کا کوئی معمولی ملنے والا اُسے ہرگز نہ پہچان سکتا۔ اُس کا بھرا ہوا سڈول جسم کسی مرض کا شکار ہو کر اب بہت نحیف ہو گیا

تھا۔ اُس کے سُرخ و سپید چہرے پر سیاہی پھری ہوئی تھی جس پر چیچک کے بڑے بڑے داغ اُسے اور زیادہ کریہہ المنظر بنا رہے تھے۔ مَیں بے اختیار ہو کر اس سے لپٹ گیا۔ اُس نے بھی اپنے بازو جن میں اب گرم جوشی نام کو نہ تھی۔ میرے گرد ڈال دیئے۔ کئی منٹ تک ایک دوسرے کا مُنہ تکتے رہنے کے بعد مَیں نے کرسی آگے کر کے کہا۔ "فیاض بیٹھ تو جاؤ۔" مجھے ہمّت نہ پڑتی تھی۔ کہ اُس کا حال دریافت کروں۔ اُس کی شکل دیکھ کر مجھے یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ دُنیا ہمیشہ کے لئے حسن سے خالی ہو گئی ہے۔ مَیں اس خوفناک حقیقت کی جزئیات معلوم کرنے سے ڈرتا تھا۔ جس کے بھیانک نقوش فیاض کے چہرے پر نظر آ رہے تھے۔ آخر وہ خود ہی بولا۔ "مظفّر، تم خاموش بیٹھے ہو۔ مَیں اُن خیالات کو جانتا ہوں جو اس وقت تمہارے دماغ میں لہریں لے رہے ہیں۔ دل جب محبّت کی ناکامیوں سے چکنا چُور ہو جاتا ہے تو اُس میں دوستی کی وقعت پیدا ہوتی ہے۔ مَیں بھی اپنے زخموں پر پھاہا رکھنے کے لئے تمہارے پاس آیا ہوں۔"

"مَیں تو یہ سمجھے ہوئے تھا کہ تم راولپنڈی میں بڑی آسودگی سے زندگی بسر کر رہے ہو۔ لیکن آج تمہیں جس حالت میں دیکھتا ہوں وہ اُس کے قطعی متضاد ہے۔ تمہیں ہوا کیا؟"

فیاض کی آنکھوں میں آنسوؤں کے بڑے بڑے قطرے نمودار ہو گئے۔ اُس نے میرے قریب آ کر مجنونانہ انداز میں میرے ہاتھوں کو زور سے دبایا اور اضطراب کے لہجہ میں کہنے لگا۔ "دُنیا میں کون ہے جس نے عمر بھر میں کبھی غلطی نہیں کی؟ لیکن لوگ بڑے سنگدل ہیں۔ اپنی کمزوریوں کو بھُول جاتے ہیں۔ اپنے گناہوں کو نظرانداز کر دیتے ہیں اور شاید، انتقام کے لئے، اُس شخص پر ٹوٹ پڑتے ہیں جو اپنی کسی اتفاقی لغزش سے، لغزش بھی وہ جس پر اُسے اپنے جذبات کا لحاظ کرتے ہوئے بالکل قدرت حاصل نہ تھی، نادم ہو کر اُن کے طعنوں کا ترکی بہ ترکی جواب نہیں دے سکتا۔"

مَیں حیران تھا کہ اس نوجوان نے، جو اپنی راست روی دراست گوئی کے لئے ضرب المثل کی طرح مشہور تھا، جس کی زندگی عمل صالح کا بہترین نمونہ تھی، کون سا سنگین جرم کیا ہے جس کی طرف وہ ان مبہم الفاظ میں اشارہ کر رہا تھا۔ مَیں نے کہا۔ "کچھ وضاحت سے بیان کرو۔ تم اتنے عرصہ کے بعد ملے ہو اور اپنے اندر اس قدر ذہنی اور جسمانی تغیر پیدا کر کے آئے ہو کہ مَیں کسی صحیح نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا۔"

فیاض نے اپنی داستان شروع کی۔ "مَیں جس ابتلا میں گرفتار رہا ہُوں وہ سب میرے کاموں کا نتیجہ تھا۔ جیسے ہر گناہ، اور ہر گناہ کے نتائج

براہِ راست انسان کے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہوتی ہے۔ کالج سے نکل کر جب ذمہ داریوں کا بوجھ ہلکا ہوا اور ملازمت مل جانے کی وجہ سے گھر والوں کا دستِ نگر بھی نہ رہا تو دل نے بغاوت شروع کی۔ زلیخا کو تو تم بھولے نہیں ہو گے، مَیں یہی کیوں نہ کہہ دوں کہ میری گذشتہ دو سال کی زندگی کا ماحصل یہی نام ہے۔ مَیں تمہیں زیادہ منتظر رکھنا نہیں چاہتا۔ واقعات جو میری لوحِ حافظہ پر خونی روشنائی سے جلی حروف میں لکھے ہوئے ہیں۔ صاف صاف بیان کر دیتا ہوں۔ زلیخا سے جوں جوں میرے تعلقات بڑھتے گئے مَیں ایک ناقابلِ بیان شدّت سے اُسے چاہنے لگا۔ مجھے انتظار تھا کہ کہیں برسرِ کار ہو جاؤں تو اُسے دائمی محبّت کا پیغام دُوں۔ راولپنڈی میں ملازم ہونے کے چند ماہ بعد مَیں لاہور آیا۔ اور پُورا ایک ہفتہ رہا۔ یہیں مَیں نے زلیخا سے اپنی دلی خواہش کا اظہار کیا جسے اُس نے منظور کر لیا، اور ہم دونوں سلسلۂ مناکحت میں منسلک ہو گئے۔ اس کے بعد زلیخا لاہور میں رہی اور پھر مَیں اُسے اپنے ہمراہ راولپنڈی لے گیا۔ اس چوری چھپے کی شادی کا علم جب میرے والدین کو ہوا تو تم سمجھ سکتے ہو ان کی کیا کیفیت ہوئی ہو گی۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ وہ ایک نہایت معزز گھرانے میں میری شادی کا پیغام دے چکے تھے۔ کچھ نہ پُوچھو والد

نے کیسے کیسے خط مجھ کو لکھے۔ اُنہوں نے دھمکیاں دیں۔ بددُعائیں بھیجیں۔ منتیں کیں۔ اپنے بُڑھاپے کی عزّت اور شفقتِ پدری کے واسطے دیئے۔ مگر مَیں جو دفعتہً ذلّت کی گہرائیوں میں غرق ہوگیا تھا، جس کے کانوں اور آنکھوں پر مہر لگ گئی تھی، بالکل خاموش رہا۔ والد جب مایوس ہو گئے تو اُن کی غیرتِ نفس جو میرے طرزِ عمل سے مجروح ہوگئی تھی محبت و شفقت پر غالب آگئی۔ اُنہوں نے غیظ و غضب کی انتہائی حالت میں مجھ کو ایک خط لکھا کہ "خدا تم ایسے ننگِ خاندان بیٹے کی صورت مجھے اب کبھی نہ دکھائے۔ مَیں نہیں چاہتا کہ تمہارا پلید سایہ آئندہ کبھی میری دہلیز پر پڑے۔ میرے لئے تم مرگئے۔ لیکن یاد رکھو جس طرح تم نے میرا دل دُکھایا ہے دُنیا سے تم بھی خوشی حاصل نہ کرسکو گے۔"

اُنہوں نے مجھ سے تمام تعلقات منقطع کر لئے۔ لیکن زلیخا کے ساتھ پہلو بہ پہلو زندگی گذارنا موسمِ بہار کی گلگشت سے زیادہ پُرلطف تھا۔ زلیخا کی ایک محبّت پاش نگاہ اندوہ و غم کے بادلوں کو پرِ کاہ کی طرح اُڑا دیتی تھی۔ قدم قدم پر مسرتوں کے انبار نظر آرہے تھے۔ مَیں غمِ ماضی و فکرِ فردا دونوں سے آزاد تھا۔ مگر پیمانہ لبریز ہوگیا تھا۔ اب اس میں خوشی کی ایک بوند بھی نہ سما سکتی تھی۔ باپ کے دُکھے ہوئے دل سے نکلی

ہوئی بد دعائیں خالی جانے والی نہ تھیں۔ ایک روز اچانک مجھے بخار نے آلیا۔ دو چار روز معمولی علاج کیا مگر بخار نہ اُترا۔ ایک ہفتہ کے بعد میرے تمام بدن پر چیچک نکل آئی۔ ڈاکٹر نے بہت کوشش کی کہ داغ مٹ جائیں۔ مگر جب میں صحت یاب ہو کر اُٹھا تو میری شکل بگڑ چکی تھی۔ چہرے کی رنگت سیاہ ہو گئی تھی۔ اور چیچک کے بڑے بڑے داغوں نے اُسے زیادہ بد زیب بنا دیا تھا۔ میری روح پر فسردگی جو آج چھا رہی ہے۔ اس کی ابتدا بیماری کے معاً بعد ہو گئی تھی شاید آنے والے سانحہ الیمہ کا پیش خیمہ تھی۔ میں نے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا تو رنج والم سے میری چیخ نکل گئی۔ مجھے اپنے سے نفرت پیدا ہو چلی تھی۔ سب سے زیادہ تکلیف دہ امر یہ تھا کہ میں زلیخا کے طرزِ عمل میں ایک نمایاں تغیّر محسوس کر رہا تھا۔ وہ کچھ کھنچی کھنچی رہتی تھی آخرہ ان سب باتوں کا لابدی نتیجہ ظاہر ہوا۔ یعنی زلیخا مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ میں ایک روز کالج سے واپس آیا تو وہ مکان سے غائب تھی۔ ملازم کچھ نہ بتا سکے کہ ان کی مالکہ کہاں گئی ہے۔ گھر کا کل سامان صحیح وسالم موجود تھا۔"

فیاض نے آنکھیں جھکا لیں اور چپ ہو گیا۔ پھر یکایک کہنے لگا۔

"میری گذشتہ زندگی کا یہ حصّہ خود میرے لئے ایک معمہ ہے۔ اگر زلیخا

کوئی سیلانی مزاج عورت تھی تو اُسے میرے ساتھ تعلقات پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ مَیں کہاں کا رئیس تھا کہ اُسے میری دولت کا لالچ تھا۔ اور اگر اُسے ایسی خواہش ہوتی بھی تو جاتے وقت چند زیور اور قیمتی کپڑے وہ میرے مکان پر کیوں چھوڑ گئی؟"

مَیں نے جواب دیا "پیارے فیاض، حُسنِ ظن اور کسر نفسی تمہارے مزاج میں حد سے زیادہ ہے۔ اور یہی دو چیزیں تمہاری تکلیف کی ذمہ دار ہیں۔ تم نے عورت کی فطرت کو نہیں سمجھا اور حقیقت یہ ہے کوئی شخص یہ دعوٰے نہیں کر سکتا کہ اُس نے عورت کی فطرت کو کما حقہٗ سمجھا ہے۔ جس طرح مرد خوبصورت عورت کو پسند کرتے ہیں کیا عورتیں خوبصورت مردوں کو پسند نہیں کرتیں؟ ذرا اس تصویر کو دیکھو۔"

مَیں نے سامنے دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں فیاض کے زمانۂ طالب علمی کی تصویر آویزاں تھی۔

"کیا اس شخص کی محبّت کسی عورت کے لئے باعثِ افتخار نہیں ہو سکتی؟ اور زلیخا تو مَیں سمجھتا ہوں بے حد حسن پرست عورت تھی۔ اُس کے متعدد خطوط جو تمہارے نام آئے تھے اُن میں صرف ایک ہی جذبہ کار فرما ہے۔ وہ بار بار تمہارے حُسن کی تعریف کرتی اور اپنے آپ کو تمہارا شیدائی ظاہر کرتی ہے۔ مَیں نہیں جانتا زلیخا کون تھی۔ مگر یہ وثوق

سے کہہ سکتا ہوں کہ اس قماش کی عورتوں میں وفاشعاری کا وہ غیر متزلزل جذبہ جو ہندوستانی عورت کی امتیازی خصوصیت ہے نہیں ہوتا۔ وہ اپنے اعمال وافعال میں دور اندیشی کی کوشاں نہیں ہوتیں۔ صرف وقتی اور ہنگامی محرکات کے ماتحت سب کچھ کر گذرتی ہیں۔ تمہاری باتیں سُن کر مَیں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اُسے حقیقتاً تم سے محبت نہ تھی وہ صرف تمہارے چہرے کی پرستار تھی، تمہاری صورت کی عاشق تھی۔ اور جب بدقسمتی سے تم نے اپنا حُسن کھو دیا تو وہ تمہارے ساتھ کیونکر رہ سکتی تھی؟"

میرے آخری الفاظ کے ساتھ فیاض کے مُنہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

امتحان کے اختتام تک میں نے اُس کو اپنے پاس ہی رکھا۔ وہ ایک اور غلطی کر چکا تھا یعنی کالج کی ملازمت سے استعفےٰ دے آیا تھا، اور اب اُس کی شدید خواہش تھی کہ کسی طرح والد کے ساتھ تعلقات اصلاح پذیر ہو جائیں۔ میرا دوست اسمٰعیل مجھے مدّت سے دہلی بلا رہا تھا۔ اب کے میرا پختہ ارادہ تھا کہ امتحان سے فارغ ہو کر چند روز کے لئے دہلی جاؤں گا۔ چنانچہ مَیں اپنے ہمراہ فیاض کو بھی لیتا گیا۔ اسمٰعیل نے

حسبِ عادت مختلف تواضعات و تکلّفات سے ہمیں خوب زیرِ بارِ احسان کیا۔ اور اب اس کی خواہش تھی کہ کسی روز تھیئٹر چلیں۔ آخر اُس کے اصرار پر ہم نے تھیئٹر جانے کی ہامی بھر لی۔ اُس روز آغا حشر کا مشہور ڈرامہ ترکی حور کھیلا جانے والا تھا۔ تمام پنڈال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا لیکن ایک عجیب واقعہ نے ہمیں تماشہ دیکھنے سے محروم رکھا۔ پہلے سین کا ابتدائی حصّہ تھا جہاں عارف اور اُس کی بیوی رشیدہ کے درمیان اُلفت و محبّت کی باتیں ہوتی ہیں۔ عارف اسٹیج پر تھا اور اُس کی بیوی ابھی آنے والی تھی۔ رشیدہ آئی ...... مجھے اپنی آنکھوں پر شک ہونے لگا۔ کیا واقعی وہی تھی؟ فیاض ایک دبی ہوئی چیخ کے ساتھ تڑپ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے میرے بازو کو جھنجوڑ کر کہا۔ "دیکھتے ہو؟" حیرت! تعجب! سامنے اسٹیج پر زلیخا کھڑی رشیدہ کا پارٹ کر رہی تھی۔ سین خدا خدا کر کے ختم ہوا۔ لیکن فیاض کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ مَیں نے زیادہ ٹھیرنا مناسب نہ سمجھا اور فیاض کی التجاؤں کے خلاف اُسے لے کر واپس مکان پر آ گیا۔ اور دوسرے دن لاہور جانے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن صبح ہی چُپکے سے، فیاض کو اطلاع دیئے بغیر، مَیں تھیئٹر کے مینجر سے ملنے چلا گیا۔ مَیں نے اُس سے پوچھا۔

"مس زلیخا آپ کے ہاں کب سے ملازم ہیں؟"

"مس زلیخا کون؟"

"وہی جنہوں نے رات رشیدہ کا پارٹ کیا تھا۔"

"آپ کی مراد مس نازلی سے ہے؟"

مَیں نے حیرت سے کہا۔ "تو کیا اُن کا اصلی نام زلیخا نہیں؟"

مینجر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "نہیں اِن کا نام نازلی ہے اور وہ تو مشہور ایکٹرس ہیں جنہوں نے کسی وجہ سے، جس کا آج تک ہمیں علم نہیں ہو سکا۔ کچھ مدت کے لئے اسٹیج کو چھوڑ دیا تھا۔ مگر اب دو سال کے بعد وہ پھر ہماری کمپنی میں شامل ہو گئی ہیں۔"

میرے سامنے بجلی سی کوند گئی۔ تمام حالات پر سے پردہ اُٹھ گیا۔ اب میرے لئے کوئی معمہ نہ تھا۔ مَیں نے یہ واقعہ فیاض سے بالکل پوشیدہ رکھا اور اُسے ساتھ لے کر اگلے روز لاہور لوٹ آیا۔ چند روز وہاں ٹھیر کر فیاض کے مکان پر گئے۔ فیاض کے والد ضبط نہ کر سکے۔ اُنہوں نے اُسے بغلگیر کیا اور فرطِ جوش سے دونوں کے بے اختیار آنسو بہنے لگے بَیں نے کل واقعات گوش گذار کئے اور فیاض کے لئے معافی چاہی۔

چھ سات مہینے ہوئے اُس کا ایک خط آیا تھا۔

"تم یہ سُن کر خوش ہو گے کہ مَیں نے شادی کر لی ہے۔ والد صاحب نے میری غلطیوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اور حقیقت یہی ہے کہ والدین کے

عفوو درگذر کا جذبہ کبھی نہیں مرتا۔ ہزار نافرمانیوں اور لغزشوں کے بعد بھی باپ کا دروازہ دعوتِ امن و عافیت کے لئے کھلا رہتا ہے۔ اور کون بدنصیب ہے جو پامالِ حوادث ہو کر بھی اس نعمت سے متمتع ہونا پسند نہ کریگا۔ میری بیوی بہت معزز گھرانے کی لڑکی ہے۔ جہاں دولت نہیں بلکہ شرافت عزّت کا معیار سمجھی جاتی ہے۔ میرے دل کو پُورا اطمینان حاصل ہے۔ ایسا اطمینان جو اُس زمانے میں بالکل عنقا تھا جب میری زندگی جذبات کے تیز و تُند طوفان میں سے کسی ڈانواں ڈول کشتی کی طرح گذر رہی تھی۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔"

ایک نظر دیکھ کر

آہ! وہ ایک لمحۂ رنگیں جس پر سیکڑوں برس نثار، وہ ایک وقفۂ زریں جس پر عمرِ طبعی قربان، وہ ایک ساعتِ سیمیں جس پر ماضی، حال اور مستقبل سب کچھ فدا!!!!!!!!!!! تو برقِ تبسّم سے خرمنِ صبر و شکیب کو جلاتی، آنکھوں کی جلوہ ریزیوں سے متاعِ ہوش و خرد کو تباہ و برباد کرتی اور بے پروا قدموں کی ٹھوکروں سے سوتے فتنوں کو جگاتی یکایک یوں نمودار ہوئی جیسے کالی بدلی میں سے چاند نکل آئے۔ پھر دفعتہً اس خروشِ دلخراش سے گھبرا کر، تو نے باغی آنچل کو سمیٹا۔ عرق انفعال سے بھیگے ہوئے چہرے کی درخشانی جس کے سامنے آفتاب و ماہتاب بھی خجل ہوں، نقاب کی آڑ میں چھپالیا۔ اور سمٹ سمٹا کر ایک طرف کو ہوگئی۔ آہ

برق کو ابر کے دامن میں چھپا دیکھا ہے
ہم نے اُس شوخ کو مجبورِ حیا دیکھا ہے

تیرے لئے اس چشم زدن میں ختم ہوجانے والے واقعہ کی بڑی سے

بڑی اہمیت یہی ہو سکتی ہے کہ ایک اجنبی کی گستاخ نظر تیرے حُسن محجوب پر پڑ گئی۔ اور تُو تو شاید اس اضطراری کیفیت کو اپنی دائمی اضطرار انگیز زندگی کی بھول بھلیاں میں فراموش بھی کر چُکی ہوگی۔ مگر میں تمنّاؤں کے اُس محشرستان، آرزوؤں کے اتھاہ سمندر اور افکار کے قلزم بے کراں سے کیوں کر نکلوں جسے تیری ایک نگاہ میرے سینے میں ہمیشہ کے لئے موجزن کر گئی۔ تیری عشق پرداز آنکھوں کی بے پناہ جنبش میرے حواس پر ایک مستقل لرزش بن کر مسلّط ہو چُکی ہے۔ تیرا شرم و حیا سے بھیگا ہوا چہرہ، یعنی گلاب کا پھُول جس کا حُسن شبنم سے زیادہ دمک اُٹھا تھا، میری نظروں کو ایسے منظر سے دوچار کر گیا ہے کہ اب دُنیا آنکھوں میں اندھیر ہو رہی ہے۔ تیری لانبی گھنی پلکوں اور زہد شکن ابروؤں کے اندر سے نکلا ہوا تیر اس شدّت سے جگر میں پیوست ہو چکا ہے کہ میں ڈرتا ہوں اُسے نکالنے کی کوشش میں میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ جائے گا۔ اور آہ سب سے بڑھ کر تیرا خرام حشر انگیز، تیری الھڑ چال، تیرے بے پروا قدم جن سے پامال ہونے کا جنوں مجھے دیوانہ بنا رہا ہے۔

شاید یہ سب کچھ ایک خواب تھا۔ بھلا میری ملول و افسردہ زندگی ایسی تابناک و روشن حقیقت کی کیونکر متحمّل ہو سکتی تھی۔ ایک رنگین تیتری

کی طرح، جیسے موسم نے اپنے بہترین الوان سونپ دیئے ہوں، دوشیزہ بہار کی مانند جس کے بدن سے حسن و موسیقی کے چشمے پھوٹ رہے ہوں۔ تو دور، بہت دور، اُفق کے پار سے، سرد و معطر ہواؤں پر سوار آئی اور میری خواب کی دنیا تیرے پرتو حسن سے جگمگا اٹھی۔

خدا نہ کرے کہ میری زندگی ان نورانی خوابوں سے محروم ہو جائے۔

سفر کی ایک رات

لکھنؤ کی طرف جانے والی آخری گاڑی نکل چکی تھی۔ اب ریل کا وقت باقی نہ تھا اور مجھے آج ہی رات لکھنؤ پہنچنا تھا۔ اسّی میل کی مسافت، اگر کوئی برق رفتار گھوڑا مل جاتا تو شاید طے بھی ہو جاتا۔ لیکن فیض آباد میں تو اِکّے ہی تھے۔ اور وہ بھی چوک میں گھومنے والے۔ میں اس اُلجھن میں گرفتار تھا اور کوئی تدبیر ذہن میں نہ آتی تھی۔ کہ میرے دوست عبدالکریم آپہنچے۔ مَیں نے اُن سے اپنی پریشانی کا ذکر کیا تو وہ فوراً بولے۔ "اگر ٹیکسی کا بندوبست ہو جائے تو کیا اعتراض ہے؟"

مَیں نے کہا۔ "کوئی اعتراض نہیں بلکہ بہت اچھا ہے۔"

فیض آباد اور لکھنؤ کے درمیان کرائے پر موٹر چلانے کا رواج نہیں تھا۔ اس لئے ٹیکسی ملنے میں بہت دقّت پیش آئی لیکن دو تین گھنٹے کی دوڑ دھوپ اور ذاتی اثر و رسوخ کو کام میں لاکر عبدالکریم ایک فورڈ گاڑی لے ہی آئے۔ اب صورت یہ تھی کہ مَیں تنہا جانے والا

اور سالم موٹر۔ میں نے کفایت شعاری کا خیال کر کے شوفر سے کہا کہ اگر ممکن ہو تو ایک آدھ مسافر اور لے لو۔ اس نے بہت روکھے پن سے جواب دیا۔

"صاحب، یہاں مسافر کہاں۔ سچ پوچھیے تو میں بھی ٹھیکہ دار صاحب کے کہنے سے جا رہا ہوں۔ ورنہ اس جاڑے میں کوئی شخص رات کا سفر نہیں کرتا۔"

وہ بھی سچا تھا۔ فیض آباد ایسے دُور افتادہ مقام سے کون دسمبر کی یخ بستہ رات کو موٹر میں نکلنا پسند کرتا تھا۔ قہر درویش بر جانِ درویش پوری موٹر چالیس روپے میں کر کے روانہ ہوا۔ مکمل بستر موجود تھا۔ اُڑھا ٹیڑھا کر کے پچھلی نشست پر بچھایا اور لحاف لپیٹ کر میں دراز ہو گیا۔ شوفر کلینر اور میں کل تین شخص تھے۔ شوفر جو بظاہر اپنے کام سے خوب واقف معلوم ہوتا تھا خاموش سا آدمی تھا۔ لیکن کلینر اتنا باتونی کہ خُدا کی پناہ۔ گفتگو کے ہر مہذب و غیر مہذب، متعلق و غیر متعلق موضوع پر جھوٹے سچے قصّے سُنانا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ موسم کی خُنکی کا ذکر آیا تو جھٹ گلمرگ اور نینی تال کا قصّہ لے بیٹھا۔ رات کی تاریکی کا نام لیا۔ تو فوراً داستان شروع کر دی کہ کیونکہ وہ ایک دفعہ اپنے گاؤں کو جاتا ہوا رات کی ہولناک تاریکی میں چوروں کے مسلح دستہ سے

دوچار ہوگیا اور پھر کس ترکیب سے جان و مال سلامت لے کر اُن کے چنگل سے نکل بھاگا۔ مَیں اس کی ہرزہ سرائی سے تنگ آکر سختی کے ساتھ اُسے ٹوکنے والا تھا کہ شوفر اُس سے کچھ گانے کی فرمائش کر بیٹھا اور پھر شاید بایں خیال کہ اُس کی یہ فرمائش میرے آرام میں مُخل ہوگی اُس نے مجھ سے بھی اجازت طلب کی۔

"اگر آپ کچھ دیر جاگنا چاہیں تو خیراتی کا گانا ہی سُن لیجئے۔"

مَیں نے متامّل ہو کر پوچھا۔ "کچھ اچھا گاتا ہے؟"

"ہاں صاحب خاصا ہے۔"

مَیں نے کہا۔ "لیکن اگر وہ گانے میں بھی ایسی بے پر کی ہانکتا رہا تو مَیں ایک لفظ نہیں سُنوں گا۔"

اس پر وہ دونوں ہنس پڑے۔ خیراتی نے ایک دو چیزیں مزے سے گائیں۔ آواز اچھی تھی۔ گو فن سے واقف نہ تھا۔ سنسان رات کی خاموشی میں جب کہ موٹر فرّاٹے بھرتی ہوئی فاصلے کی دوری کو نگلتی چلی جا رہی تھی اُس کی بلند آواز کانوں کو بہت خوش آہند معلوم ہوتی تھی آہستہ آہستہ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ نیند کا فرشتہ پر پھیلا رہا تھا۔ مَیں نے شوفر سے خوب ہوشیار رہنے کی تاکید کی اور خود بستر میں مُنہ لپیٹ کر سو گیا۔

زور دار دھماکے کے ساتھ یک لخت موٹر رُک گئی۔ اور میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ چاروں طرف اُجاڑ میدان تھا جس پر گھٹاٹوپ اندھیرا مسلّط تھا۔ صرف موٹر کے دو لیمپ فضائے بسیط کی پُر ہول تاریکی سے تھکے ہوئے پہلوان کی طرح جنگ کر رہے تھے۔ ایک خطرہ موہوم کا احساس کرتے ہوئے میں نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"کیا ہوا۔ خیر تو ہے؟"

میرا مخاطب شوفر تھا۔ لیکن وہ مشین کی دیکھ بھال میں انجان بن کر چپکا ہو رہا۔ میں نے درشتی سے پوچھا:۔

"خیراتی بولتے کیوں نہیں۔ کیا ہو گیا ہے؟"

"حضور ٹائر پھٹ گیا ہے۔"

میں نے کمبل اوڑھا اور انتہائی کوفت کے ساتھ دروازہ کھولکر نیچے اُتر آیا۔ وہ دونوں جیبی لالٹین کی مدد سے پہیّوں کا بغور ملاحظہ کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا۔

"کوئی فالتو ٹائر ہے؟"

نہایت مایوسانہ جواب تھا "جی نہیں۔"

میں رنج و غصّہ کی شدّت کو ضبط نہ کر سکا "تم عجب بیہودہ انسان ہو، جب تمہیں علم تھا کہ اسّی میل کا طویل سفر ہے۔ رات کا وقت

ہے، غیر آباد راہ سے گزر رہے ہے۔ پھر تم گھر سے مکمّل سامان لے کر کیوں نہیں چلے۔ اب سردی میں جان سے مارو گے۔ بتاؤ کتنا فاصلہ طے کر چکے ہو؟"

"جناب، رودلی سے گزر آئے ہیں۔"

"الامان! ابھی رودلی ہی میں ہو؟ میرا خیال تھا بارہ بنکی کے قریب پہنچ چکے ہونگے۔" مَیں نے جیب سے گھڑی نکالی گیارہ بجنے والے تھے۔ میرے دل و دماغ میں سخت اذیّت کا احساس ہونے لگا۔ ایسی سردرات میں سفر اختیار کیا۔ اتنی تکلیف برداشت کی معقول معاوضہ بھی ادا کیا اور پھر بروقت منزل پر نہ پہنچ سکا۔ وہ دونوں متعدد اوزار سنبھالے موٹر کے مختلف حصّوں کو کھولتے بند کرتے اور اُلٹتے پلٹتے رہے۔ مَیں صبر شکن انتظار کے ساتھ امید و بیم کی لہروں سے ڈانواں ڈول اُن کی کارروائی مضطرب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ نصف گھنٹہ کی تگ و دو کے بعد انہوں نے فیصلہ سُنا دیا کہ ٹائر اس بُری طرح پھٹا ہے کہ موٹر اب دس قدم بھی نہیں چل سکتی۔ ان الفاظ نے میرے اندر دہشت دہراس کے وہی جذبات پیدا کر دیئے جو ایک مجرم عدالت سے فیصلہ موت صادر کئے جانے پر محسوس کرتا ہے۔ مَیں مغلوب الغضب ہو رہا تھا۔ اور جی چاہتا تھا کہ شوفر کو جان سے

مار دوں۔ اُس کی مہلک غفلت نے میرا قیمتی پروگرام تہس نہس کر ڈالا تھا۔ کم بخت کو اتنا معلوم نہیں تھا کہ فالتو ٹائر کے بغیر سفر کرنا سراسر حماقت ہے۔ کبھی اپنی کاہلی پر افسوس کرتا۔ اگر شام کو ٹرین مل جاتی تو کیسے اطمینان سے لکھنؤ پہنچ گیا ہوتا۔ اب یہ حالت تھی کہ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔ گویا ع۔

مار دیا رِ غیر میں مجھ کو وطن سے دُور

میرے گرد و پیش تمام بنجر سرزمین تھی۔ آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ گیدڑوں کی خوفناک آوازیں رات کی سیاہی سے مل کر کرۂ ہوا میں ہولناک گُونج پیدا کر رہی تھیں۔ مَیں عجب شش و پنج میں مبتلا موٹر کا سہارا لئے خالی نظروں سے، دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔ اور اس ابتلا سے نکلنے کی کوئی تجویز نہ سوجھتی تھی۔ شوفر سہما ہوا ایک طرف کھڑا تھا۔ مَیں نے پھر پوچھا

"اب کیا ارادہ ہے؟"

وہ آہستہ آہستہ میری طرف بڑھا۔ "حضور، معاف کر دیجئے۔ میری غلطی کی وجہ سے آپ کو اتنی تکلیف ہوئی۔ یہاں سے دو میل پر راؤ ... ... صاحب کا گاوں ہے۔ راؤ صاحب یہاں کے بہت بڑے رئیس اور تعلقہ دار ہیں۔ کئی بار میں انہیں موٹر

پر لکھنؤ لے گیا ہوں۔ مجھ پر ہمیشہ مہربانی کرتے ہیں اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کا سامان اُٹھا کر اُن کے یہاں لے چلوں، آپ رات وہیں آرام فرمائیے۔"

میں نے اس تجویز کو پسند کیا۔ مگر پھر سوچا کہ آدھی رات کے وقت راؤ صاحب کو بے آرام کرنا بھی مداخلت بے جا سے کم نہیں ممکن ہے وہ مجھے ناخواندہ مہمان سمجھ کر ناک بھوں چڑھائیں۔ پھر خیال آیا کہ میں کونسا اُن کے ہاں مہینوں رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے تو طلوعِ آفتاب تک چھت کا سایہ اور ایک چارپائی درکار ہے۔ قصہ مختصر میں نے رضامندی کا اظہار کیا اور شوفر میرا اسباب سر پر رکھ کر روانہ ہو گیا۔ میں اس کے ساتھ ہو لیا اور خیراتی کو نگرانی کے لئے وہیں چھوڑ گئے۔ پون ایک گھنٹہ کے چل چلاؤ کے بعد ہم "دیس نگر" پہنچے۔ راؤ صاحب کی عظیم الشان کوٹھی اور وسیع پائیں باغ واقعی اُن کی امارت و ثروت کی شہادت دے رہے تھے۔ شوفر نے شاگرد پیشہ مکانات کی طرف جا کر کسی ملازم کو جگایا اور غالباً میرے متعلق کچھ کہا۔ ملازم پہلے تو بڑبڑاتا رہا۔ پھر مجھے بغور گھورتا ہوا کوٹھی کے اندرونی حصے میں داخل ہو گیا۔ میں دل ہی دل میں نادم ہو رہا تھا کہ بے وقت ایسے صاحبِ خانہ کو تکلیف دی۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد نوکر برآمد ہوا اور

بہت غیر شگفتہ لہجہ میں بولا۔

"چلئے جناب، راؤ صاحب نے یاد فرمایا ہے۔"

میں نے حیرت سے کہا۔ "راؤ صاحب کیا جاگ رہے تھے؟"

"جی نہیں، وہ تو سو چکے تھے میں نے جا کر جگایا ہے۔"

"افوہ کتنی تکلیف ہوئی اُن کو۔"

میں ملازم کے ہمراہ راؤ صاحب کی خواب گاہ میں داخل ہوا۔ وسیع و عریض کمرہ بہت نفیس سامانِ آرائش سے سجا ہوا تھا اور پلنگ کے قریب آرام کرسی پر وہ خود تشریف فرما تھے۔ مجھے دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور نہایت خندہ پیشانی سے ملے پچاس پچپن سال کا سن ہو گا۔ لیکن چہرے پر جوانی کی سُرخی موجود تھی۔ بالوں میں ابھی کہیں کہیں سفیدی نمودار ہوئی تھی۔ گفتگو شروع کرتے ہی میں نے تکلیف دہی کی معذرت طلب کی جس کے لئے حقیقتاً میں بہت شرمندہ ہو رہا تھا۔ اُنہوں نے بہت شفقت سے کہا۔

"آپ بھی غضب کرتے ہیں۔ موٹر کا بگڑ جانا تو غنیمت ہوا کہ ہمیں آپ کے درشن ہو گئے۔ آپ تکلیف وغیرہ کا ذکر نہ کیجئے۔ میری تو عمر ہی دوستوں کی خدمت میں بسر ہوئی ہے۔"

اس کے بعد اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ وہ کھلنے کا اصرار

کر رہے تھے۔ لیکن مجھے مطلق اشتہا نہ تھی۔ ان کے ملازموں نے کوٹھی کے مردانہ حصے میں میرے سونے کا انتظام کر دیا۔ اور میں تعظیم ادا کر کے اور دل میں اُس شخص کی شرافت کا گہرا نقش لئے ہوئے آکر دراز ہو گیا۔

مجھے سوئے ہوئے تھوڑی ہی دیر گزری ہو گی کہ کوٹھی کے احاطے میں کہرام مچ گیا۔ "ڈاکو۔ ڈاکو۔ پکڑو۔ مار دیا۔" کی مخلوط آوازیں ور خوفناک چیخیں کان میں پڑیں تو میں سراسیمہ ہو کر جاگ اُٹھا۔ اور واقعہ کی اصلیت معلوم کرنے کو باہر دوڑا۔ میری آنکھوں نے عجیب منظر دیکھا۔ راؤ صاحب خود، اُن کے لواحقین اور ملازم پانچ سات آدمیوں کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ رات کی منجمد تاریکی میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ حقیقت حال سے باخبر ہوئے بغیر لیکن موقع کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے میں بھی اُن کے پیچھے بھاگ اُٹھا۔ میں نے تیزی سے ایک شخص کو جا پکڑا۔ لیکن جوں ہی اُس کے جسم کو چھوا اُس نے برق آسا پھرتی کے ساتھ تلوار کا ایک ایسا وار میرے ہاتھ پہ کیا کہ میرا پہنچا کٹ کر زمین پر گر پڑا۔ اور میں بے ساختہ چیخ کے ساتھ وہیں بیٹھ گیا حملہ آور دل کے پاس موٹر تھی جس میں سوار ہو کر وہ چشم زدن میں ہماری نگاہوں سے غائب ہو گئے۔

راؤ صاحب اور اُن کے متعلقین نے میرے گرد گھیرا ڈال دیا۔ خون بے تحاشا میرے زخم سے بہ رہا تھا۔ اور مَیں اگرچہ صبر کرتے تھا لیکن حواس ایک جانکاہ اذیّت میں مبتلا تھے۔ مجھے ایک شخص کندھوں پر اٹھا کر واپس کوٹھی میں لایا۔ طبّی امداد تو وہاں کیا پہنچ سکتی تھی بچارے راؤ صاحب دیوانوں کی طرح ادھر اُدھر بھاگے بھاگے پھر رہے تھے اور کچھ بن نہ پڑتا تھا۔ کپڑے پانی میں بھگو بھگو کر میرے زخم پر رکھتے تھے لیکن خون کی دھار تھی کہ بند ہونے میں نہ آتی تھی۔ اسی پریشانی میں رات تمام ہو گئی۔ زنانخانے کے اندر سے روتے اور بَین کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ مَیں سمجھا شاید کوئی سخت حادثہ ہو گیا ہے۔ صبح ہوئی تو ایک نوکر نے ڈرتے ڈرتے اور رُک رُک کر مجھ سے کہا۔

"آپ کو نہیں معلوم؟ رات وہ شخص سرکار کی صاحبزادی کو اُٹھا کر لے گئے۔"

راؤ صاحب کی صاحبزادی کو؟"

جی ہاں!"

یہ افسوسناک خبر بجلی کی طرح مجھ پر گری جس نے مجھے اپنی تمام تکلیف بھلا دی۔ مَیں حیران و ششدر رہ شب گذشتہ کے واقعات اپنے دماغ میں دُہرانے لگا۔ اُجاڑ بیابان میں موٹر کا پھٹ جانا۔ راؤ صاحب

کے ہاں آمد۔ آدھی رات کو ڈکیتی۔ میرا ہاتھ کٹ گیا اور راؤ صاحب کی صاحبزادی کا اغوا۔ ایک حیرت انگیز ڈرامہ تھا۔ یقیناً وہ بہت ہی منحوس گھڑی ہوگی جب میں نے سفر کی نیّت باندھی تھی۔ اگر مجھے ان مصائب کا ہلکا سا علم بھی ہوتا تو میں گھر سے نہ نکلتا۔ لیکن اب کہ تیر کمان سے نکل چکا تھا پچھتانا بالکل بے سود تھا مجھے اندیشہ تھا کہ اگر میں چندے وہاں ٹھیرا رہا۔ تو وہ شیطانی طاقتیں جو برسرِ پیکار تھیں اور جنہوں نے میرے عزائم کو ملیامیٹ کر کے مجھے سخت جسمانی و روحانی عذاب میں مبتلا کر دیا تھا مزید گزند پہنچانے سے باز نہ رہیں گی۔ میں جلد از جلد اس چار دیواری سے بھاگنا چاہتا تھا۔ راؤ صاحب مخلصانہ اصرار کرتے تھے کہ میں چند روز اور قیام کروں اور جب تک زخم کی حالت بہتر نہ ہو جائے اُن کے پاس سے نہ جاؤں۔ وہ باتیں کرتے تھے اور اُن کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ وہ آنسو رنج و غم اور شرم و ندامت کے آنسو تھے۔ وہ سوچتے ہونگے کہ ایک اجنبی چند گھنٹوں کے لئے مہمان کی حیثیت سے ان کے ہاں آیا اور معاوضہ میں اپنا ایک ہاتھ دے چلا۔ اُن خیالات کو جو میری روانگی کے وقت اُن کے نیک دل میں موجزن تھے۔ میں خوب سمجھتا تھا۔ لیکن اس متحمل و بردبار انسان نے اپنے ذاتی نقصان اور رنج و الم کا اشارۃً بھی اظہار مناسب

نہ سمجھا۔ ان کی دعائے خیر لے کر اور آئندہ ملاقات کا وعدہ کر کے میں اُن سے رُخصت ہوا اور واپس فیض آباد آگیا۔ تمام راہ مجھے یہی خیال رہا۔ کہ رائے صاحب کی صاحبزادی کا اغوا کسی بڑے راز کا حامل تھا۔ معزّز گھرانوں میں جب ایسے حادثے ظہور پذیر ہوتے ہیں تو تلاش و تفتیش اُن کی خانگی زندگی کے سنسنی پیدا کرنے والے حالات سے پردہ اُٹھا دیتی ہے۔ کیا رائے صاحب بھی پولیس میں اطلاع کر کے اپنی ذات کو اخبارات کی آراء اور قیاسات کا مرکز بنانا پسند کریں گے؟

دو ہفتے کی مرہم پٹی سے میرا زخم تو بالکل مندمل ہو گیا۔ لیکن کٹا ہوا ہاتھ ایسا بدنما معلوم ہوتا تھا کہ میں نے اُس کو ہمیشہ کوٹ یا پتلون کی جیب میں رکھنے کا ارادہ کر لیا۔ علاوہ ازیں میں روزمرہ کی کاروباری زندگی میں ایک ہاتھ کی اعانت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا تھا۔ اور اس محرومی کو ہر لحظہ شدّت سے محسوس کرتا تھا۔ یہ نقصان ایسا ناقابلِ تلافی ثابت ہوا کہ لکھنؤ کے قابل ترین سرجن نے بھی مشورہ دیا کہ ہندوستان میں تو اس درد کی دوا میسّر آنا قریب قریب ناممکن ہے۔ ہاں یورپ میں بعض ایسے ماہرین عضویات ہیں جو مصنوعی ہاتھ اس خوبی سے تیار کر دیتے ہیں کہ نقل پر اصل کا دھوکا

ہو۔ کیونکہ جنگِ عظیم کے بعد وہاں جرّاحی کے اس شعبہ کو خاص طور پر بہت تقویت ملی ہے۔

چند ماہ مصروفیّت کے بعد میرا آب و دانہ پھر پنجاب کی طرف منتقل ہو گیا۔ اس دوران میں مَیں نے شمالی ہند کے بہترین اطبّاء سے استصواب کیا مگر سبھی اس معاملہ میں عاجز نظر آتے تھے۔ میرے ایک عزیز نے مجھے بتایا کہ بمبئی میں دو ایک ڈاکٹر ایسے ہیں جو انگلستان اور جرمنی سے فنّ جرّاحی میں مہارت نامہ حاصل کر کے آئے ہیں اور عضویات کی اس شاخ کے معالج خصوصی ہیں۔ اگر ان سے مشورہ کیا جائے تو ممکن ہے بہتری کی کوئی صورت نکل آئے۔ مجھے یوں بھی ایک ضروری کام سے بمبئی جانا تھا۔ اور اب تو سمندِ شوق کو اک اور تازیانہ ہوا۔ چنانچہ بعض کاموں کو ادھورا چھوڑ کر میں بمبئی روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر اپنی اوّلیں فرصت میں مَیں نے ان ڈاکٹروں کا پتہ چلانے کی کوشش کی اور مجھے جلد ہی معلوم ہو گیا۔ کہ میرے اُس عزیز کی اطلاع بے بنیاد نہ تھی۔ ڈاکٹر رائے اور ڈاکٹر سہادل دو نام تھے۔ جو متعدد حضرات کی زبان سے مَیں نے سُنے۔ ان میں ڈاکٹر رائے کا نام میرے احباب بہت اعتماد اور وثوق سے لیتے تھے بلکہ سرجری میں اُن کے چند کارہائے نمایاں کو تو لوگ معجزات سے تعبیر

کرتے تھے۔ مَیں بھی اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تیس پینتیس سال کی عمر ہو گی۔ مضبوط جسم، لانبا قد۔ نہایت خوبصورت ہنس مکھ آدمی تھے۔ شکل و شباہت سے شمالی ہند کے باشندے معلوم ہوتے تھے۔ اور جب گفتگو شروع ہوئی تو لب و لہجہ نے بتا دیا کہ انہیں خاک پاک اودھ سے نسبتِ وطن حاصل تھی۔ رسمی تعارف اور مزاج پرسی کے بعد میں نے اپنی آمد کی غرض بتائی پہلے تو میرے بازو کو مدت تک بغور دیکھتے رہے۔ پھر ایک خاص قسم کے چشمے سے ملاحظہ کیا اور ہنسنے لگے۔ "آپ کا ہاتھ کسی تیز دھار آلہ سے کٹا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ آپ بتا سکتے ہیں یہ زخم آپ کو کیسے پہنچا؟"

مَیں نے کہا۔ "ایک حادثہ ہو گیا تھا۔"

وہ مسکرائے۔ "آپ چال ڈھال سے فوجی سپاہی تو معلوم نہیں ہوتے اور نہ وضع قطع ظاہر کرتی ہے کہ آپ اس غیر ذمہ دار طبقہ سے ہیں جہاں صبح و شام جنگ و پیکار کا بازار گرم رہتا ہے۔ پھر آپ کو حادثہ کیسے پیش آگیا؟"

مجھے ان کے اس سوال سے جس سے وہ گویا بال کی کھال نکالنا چاہتے تھے کچھ ناگوار سا احساس ہوا۔ مَیں نے کہا۔

"آپ حادثہ کی نوعیّت کی طرف نہ جائیے۔ بس آپ کی تشفی کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ تیز دھار آلہ سے یہ پنجا کٹ گیا تھا۔"

میرے اس گول مول جواب سے اُن کے شوق جستجو میں ہی تحریک پیدا ہوئی اور میرا ہاتھ چھوڑ کر وہ اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گئے۔

"آپ جانئے ایک معالج کا کام صرف یہی نہیں کہ وہ دوا تجویز کردے۔ دفع امراض کے سلسلے میں دوا تجویز کرنا آخری مرحلہ ہے۔ جس پر پہنچنے کے لئے بہت سے دریافت طلب امور کا حل نہایت ضروری ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس زخم میں تیز دھار آلہ کا استعمال ہوا تھا۔ لیکن یہ جاننا کہ وہ کیونکہ ہوا اور کن حالات میں ہوا میرے علاج کو مکمّل و مؤثر بنانے کے لئے لابدی ہے۔ اس لئے آپ براہِ عنایت حالات کے انکشاف میں بخل سے کام نہ لیں۔"

میں حیران تھا کہ یہ کس قسم کا ڈاکٹر ہے جو زندگی کے خفیہ واقعات کُرید کُرید کر پوچھ رہا ہے۔ اگر اصل حالات کو چھپاتا ہوں تو اس کے ناراض ہو جانے کا ڈر ہے اور اگر الف سے یٓ تک سب قصّہ بیان کر دوں تو ایک معزّز رئیس کی شرافت و عزّت پر حرف آنے کا احتمال ہے۔ میری چشم تصوّر کے سامنے راؤ صاحب

کی محبوب و مکرم شخصیت آگئی اور دل نے کہا کہ ایسے شریف دوست کے راز کو رسوا کرنا آئینِ مروّت سے بعید ہے۔ اتنے میں ڈاکٹر صاحب کے ہنسنے کی آواز آئی۔ "اجی صاحب! آپ کس گہری سوچ میں پڑ گئے۔ دُنیا میں ایسی کوئی چیز نہیں جسے راز کہا جا سکے۔ ہر انسان کی زندگی ایک کھُلا ہوا مرقع ہے جسے تمام دُنیا بیک وقت پڑھ لیتی ہے۔ آپ کیوں تذبذب میں پڑ گئے؟ ایک مریض کی حیثیت سے آپ کا فرض ہے کہ آپ اپنے مرض کے تمام امور متعلقہ مجھ سے صاف صاف بیان کر دیں۔ ورنہ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکوں گا۔"

مَیں نے بھی جانا کہ اب زیادہ رُکنا مناسب نہیں چنانچہ تمام داستان از اوّل تا آخر ان کے سامنے کہہ دی۔ مَیں بول رہا تھا اور ڈاکٹر صاحب پتھر سے تراشے ہوئے بُت کی مانند، حیرت و استعجاب سے پھٹی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ٹکٹکی باندھے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ہر لحظہ اُن کا رنگ متغیّر ہو رہا تھا۔ جب قصّہ ختم ہو چکا، تو وُہ حیرت انگیز تبسّم کے ساتھ، جس سے اُن کے رُخساروں پہ پھر سُرخی دوڑ گئی تھی، کھڑے ہو کر مجھ سے لپٹ گئے۔

"آیئے آیئے اندر چلئے۔ آپ تو اپنے ہی آدمی نکل آئے۔" وہ

مجھے مطب سے کھینچ کر ملحقہ مکان کے سکونتی حصّہ میں لے گئے۔ مَیں حیران و ششدر یہ سب کارروائی دیکھ رہا تھا۔ اور کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ گول کمرے میں مجھے صوفے پر بٹھا کر ڈاکٹر صاحب نے بلند آواز میں پکارا۔ "سوشیلا۔ سوشیلا۔"

بغل والے کمرے کا دروازہ سرکا اور ایک نہایت دلفریب صورت نمودار ہوئی۔ ریشمی ساڑھی میں ملبّس، ماہِ تاباں کی سی ضیا پیشانی پر قشقہ لگائے، یہ پری وش بے دھڑک کمرے میں داخل ہو گئی۔ مَیں تعظیماً اپنی جگہ سے اُٹھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اور میری جانب اشارہ کر کے کہا۔ "آپ سے ملو۔ یہ ہمارے بہت بڑے محسن ہیں۔"

ہم دونوں نے مصافحہ کیا اور مختلف کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے مخاطب کیا۔ "حضرت، یہی وہ خاتون ہیں جنہیں چھڑانے میں آپ نے اپنا ہاتھ کھو دیا تھا۔"

"واقعی؟" اتنا کہا اور وفورِ حیرت سے میری زبان گنگ ہو گئی اور آنکھیں اس نازنین کے چہرے پر گڑ گئیں۔ میری حیرانی کا یہ عالم تھا کہ وہ مکان میری نگاہوں میں ایک جادو گھر نظر آنے لگا۔ اور ڈاکٹر صاحب کے الفاظ کا صحیح مفہوم متعیّن کرنے میں مَیں سراسر قاصر تھا

نووارد خاتون ندامت آمیز نظروں سے مجھے گھور رہی تھی۔ چند منٹ کے مرگ آسا سکوت کے بعد ڈاکٹر صاحب بولے۔ "ہم میں سے ہر شخص طلسم ہوش ربا کی کافی سیر کر چکا ہے۔ بہتر ہے کہ اب حقیقت سے پردہ اُٹھا دیا جائے۔ سوشیلا، مجھے ان صاحب سے ذرا تخلیہ میں باتیں کرنا ہیں تم . . . ." ابھی فقرہ ختم نہ ہوا تھا کہ سوشیلا موجِ رنگ و بُو کی طرح ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی کُرسی میرے قریب کر لی اور کہنے لگے۔ "آپ سمجھ گئے ہوں گے، سوشیلا میری بیوی ہے۔ دیس نگر کی اُس ہنگامہ خیز رات کو جب بد قسمتی سے آپ کو یہ حادثہ پیش آیا میں اور میرے چند جاں نثار دوست ہی حملہ آوروں کی صورت میں نمودار ہوئے تھے۔ راؤ صاحب کی جس صاحبزادی کا اغوا ہوا وہ سوشیلا ہی تھی۔ اس اجمال کی تفصیل سُننے کے یقیناً آپ مشتاق ہوں گے اس لئے میں واقعہ کو ابتدا سے بیان کئے دیتا ہوں۔ یہ تو آپ جانتے ہیں محبت اور جنگ میں سب طریقے مستحسن ہوتے ہیں۔ اور پھر اس جنگ میں . . . . جس کا انعام سوشیلا ایسی ہمہ صفت موصوف خاتون ہو۔ اس لئے اپنے طرزِ عمل کی مدافعت کی میں چنداں ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ بزرگوں

کے دیرینہ مراسم کی وجہ سے مَیں اور سوشیلا بچپن میں اکٹھے کھیلے اور
ایک ہی ماحول میں پرورش پائی۔ حُسنِ اتفاق سے مذاق بھی یکساں
تھے۔ سِنِ بلوغت کو پہنچ کر کچھ فطری حجاب اور کچھ تعلیمی مشاغل نے
ہمیں ایک دوسرے سے علیٰحدہ کر دیا۔ لیکن بچپن کی طبعی موانست میں
اب محبت کے جذبۂ رنگیں نے گل کاریاں شروع کر دیں اور یہ
جذبہ عمر کے ساتھ ساتھ پختہ ہوتا گیا۔ سوشیلا کی والدہ کے ملنے والوں
میں ایک شخص پرکاش تھے جنہیں دنیوی وجاہت اور زمینداری
کے ٹھاٹھ نے بہت برخود غلط بنا رکھا تھا۔ ان کے تموّل نے سوشیلا
کی والدہ کی آنکھوں کو خیرہ بنا دیا تھا اور اُن کا ذاتی ارادہ یہی تھا کہ وہ
سوشیلا کو اُس کے حوالہ کریں گی۔ لیکن سوشیلا کے والد زمانہ شناس
آدمی تھے۔ اُن کی نگاہِ دُور بین میں امارت کی ظاہری رونق کی بہ نسبت
تعلیم اور ذاتی اخلاق کو بہت زیادہ وقعت حاصل تھی۔ پرکاش صاحب
بظاہر لکھنؤ میں طالب علم تھے۔ لیکن اُن کے وقت کا زیادہ حصہ سیر و شکار
ہی میں گزرتا تھا۔ اس دوران میں مَیں نے کالج کی تعلیم کامیابی کے
ساتھ ختم کر لی تو میرے والد نے مجھے انگلستان بھیجنے کا ارادہ ظاہر کیا۔
لیکن اس ارادے کی تکمیل سے قبل وہ مجھے علائقِ دُنیا کا پابند بنا
دینا چاہتے تھے تاکہ مغرب کی آزادی سے محفوظ رہ سکوں۔ میرا سینہ

جس آتشِ سوزاں کا مدت سے شکار ہو رہا تھا اُس کے اظہار کا وقت آپہنچا تھا۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ اگر سوشیلا نے میری رفیقِ زندگی بننے سے انکار کر دیا۔ تو میں ساری عمر تیاگ میں بسر کر دونگا۔ اُدھر سوشیلا کی والدہ کو یہ چڑ تھی وہ اپنی لڑکی پرکاش کو دیگی۔ راؤ صاحب یوں تو دانا اور روشن خیال بزرگ ہیں لیکن گھر میں بیوی کے سامنے بالکل بے دست و پا ہو جاتے ہیں۔ اُن کی یہ حالت بہت قابلِ رحم ہوتی ہے۔ اُنھوں نے بیوی کو بہت سمجھایا کہ پرکاش کی دولت اُس کی فضول خرچیوں کی کب تک متحمل ہو سکے گی۔ زمانے کی روش کی طرف دیکھو۔ ذاتی خصائل اور علم کا لازوال خزانہ انسان کی سب سے بڑی جائداد ہے۔ لیکن وہ کج فہم اور ضدی عورت ان حقائق کو سمجھنے سے عاجز تھی۔ راؤ صاحب ترپاہٹ سے مجبور ہو گئے تو اُنھوں نے کہا بہتر ہے پرکاش بھی انگلستان جائے اور دونوں اُمیدواروں میں سے پانچ سال کے بعد جو ڈاکٹر بن کر واپس آئے گا میں اپنی بیٹی اُسی کو دونگا۔

پرکاش صاحب محض جذبۂ رقابت سے متاثر ہو کر اور اپنی مَتاعِ علم کا جائزہ لئے بغیر عازمِ انگلستان ہو گئے۔ راؤ صاحب کا یہ فیصلہ حقیقتاً میرے حق میں تھا۔ میں اپنے داخلے کا انتظام پہلے ہی سے کر چکا تھا۔

چنانچہ پانچ سال جس دماغی محنت میں مَیں نے گزارے اُس کا اندازہ مَیں ہی کر سکتا ہوں۔ صرف سوشیلا کا عشق میرے گرتے ہوئے قدموں کو سنبھال رہا تھا۔ خدا خدا کرکے وہ زمانۂ مفارقت ختم ہوا اور مَیں اس کڑی آزمائش میں سے کندن بن کر نکلا۔ کامیاب و بامراد مَیں واپس وطن آیا۔ پرکاش بچارے ابھی ابتدائی امتحانوں سے بھی عہدہ برآنہ ہو سکے تھے لیکن میری واپسی کی خبر سُن کر وہ بھی ہندوستان لوٹ آئے اور قسمت آزمائی شروع کر دی۔ میرا پلڑا بھاری تھا۔ مَیں عائد کردہ شرط پوری کر چکا تھا اس لئے موعودہ انعام کا حق دار تھا لیکن سوشیلا کی والدہ نے پھر میرا راستہ روک لیا۔ وہ مُصر تھی کہ خواہ اِدھر کی دُنیا اُدھر ہو جائے وُہ اپنی بیٹی پرکاش کو دے گی۔ حالات کی یہ مایوس کُن منزل تھی۔ جب مَیں نے آخری قدم اُٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ پرتھی راج شاہ دہلی کی مثال میرے سامنے تھی کہ کیونکر اس نے سنجوگتا کو حاصل کرنے میں اپنی جان جوکھوں میں ڈال دی تھی۔ آخر مَیں بھی راجپوت ہوں۔ میری رگوں میں بھی وُہی خُون جاری ہے۔ مَیں جلتی آگ میں کُودنے سے کیوں گھبراتا؟ مَیں نے سوشیلا کو اپنے ارادے سے مطلع کیا تو شکر ہے وہ میدان عشق میں ثابت قدم نکلی۔ خفیہ نامہ و پیام سے وقت مقرر کر لیا گیا۔ اور اپنے

چند جاں نثار دوستوں کے ساتھ میں نے دھاوا بول دیا۔ مقام کا تعین کرنے میں کچھ غلط فہمی ہو گئی تھی۔ اس لئے راؤ صاحب کے چند ملازم جاگ اُٹھے۔ اور خلاف توقع یہ ہنگامہ برپا ہو گیا۔ لیکن میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔"

ڈاکٹر صاحب کی مسحور کُن تقریر ختم ہوئی۔ گویا طلسم ٹوٹا۔ اور مجھے زندگی میں دوسری مرتبہ اس بات کا احساس ہوا کہ حقیقت افسانے سے زیادہ دلکش اور حیرت انگیز ہوتی ہے۔

شہیدِ تغافل

شادی کے بعد تین مہینے کا عرصہ ریاض نے کیف و مدہوشی کے عالم میں گذار دیا۔ ریاض کے والدین اُس کی آزاد طبیعت اور اس کے شاعرانہ خیالات سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ اپنی مجلسِ احباب میں اور دیگر اعزّہ کے سامنے بھی کئی مرتبہ اس آزادی کا اظہار کر چکا تھا۔ بالخصوص شادی کے معاملہ میں وہ اپنے آپ کو رسم و رواج کی پابندیوں سے آزاد خیال کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا "والدین کی خدمت اولاد کا فرض ہے۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ محبت میں بھی ہم والدین کی رضا کے ماتحت چلیں۔ محبت کوئی اختیاری چیز نہیں ہے۔ کسی کے کہنے سے پیدا نہیں ہوتی۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایسی لڑکی سے جس کو ہم نے عمر بھر نہیں دیکھا جس کے مذاق اور خیالات کے متعلق ہمیں کوئی علم نہیں۔ اور جو اتفاقیہ ہمارے ساتھ وابستہ کر دی گئی ہے۔ محض والدین کی خوشنودی!!

اُن کے جبر کی وجہ سے محبت کریں۔ وہ محبت جو کسی بیرونی زور سے پیدا ہو یا جس کی بنا، کوئی خود غرضانہ ہوس ہو ہرگز محبت نہیں۔ خود غرضی کی ابتدا محبت کی موت ہے۔ ایسی ہی جبری اور خلافِ طبیعت شادیاں ہمارے ہاں رائج ہیں۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ ہندوستانی خاوندوں کو اپنی بیویوں سے عشق نہیں بلکہ ہمدردی ہوتی ہے۔ عورت دُنیا کے حسن وجمال کا بہترین مرقع ہے، عورت خالقِ ازل کی حسین ترین صنعت ہے۔ اور عورت ہی درسِ ادب و اخلاق کی سب سے بڑی معلمہ ہے۔ کیا یہ ظلم نہیں کہ اس گراں بہا نعمت کے حاصل کرنے میں ہمارے جذبات و انتخاب کی پروا نہیں کی جاتی۔ وہ شادی جس کی بنیاد طرفین کی باہمی محبت نہ ہو یقیناً اس قابل نہیں کہ معاشرت میں اُس کا وجود قائم رکھا جائے"۔

اپنے ان خیالات کی وجہ سے، یا اُس کی بڑھی ہوئی خوش قسمتی کہئے، ریاض ہندوستان کے جذبات کش طرزِ انتخاب سے بچ گیا۔ اُس کی بیوی اُس کی برسوں کی محبت کا نتیجہ تھی۔ سلک ازدواج میں منسلک ہونے سے قبل اُنہیں بارہا ایک دوسرے سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اُن کو یقین تھا کہ شادی کے بعد اُن کی روشن و زرّیں زندگیاں ناقابلِ بیان انبساط و سرور سے معمور ہو جائیں گی۔ اور فی الحقیقت

ایسا ہی ہوا۔ تین مہینے ریاض اپنی متاعِ حیات و مایۂ زیست ممتاز میں جذب ہو کر رہا۔ وہ خود کو ایک جسدِ بے جان تصوّر کرتا تھا۔ اور ممتاز کو رُوح و رواں۔ دوستوں سے ملنا تو قریب قریب اُس نے ترک کر دیا تھا۔ دن کا بیشتر حصّہ وہ گھر ہی میں رہتا۔ سیر کے لئے باہر جانا بھی وہ بے سُود سمجھتا تھا۔ کائنات کا تمام حُسن اور دُنیا کی تمام دلچسپیوں کا ماحصل اب اُس کے پاس موجود تھا وہ باہر کیوں جاتا۔

ریاض بی اے کر چکا تھا۔ اُس کی آئندہ زندگی کا پروگرام اُس کے والدین نے مرتب کر رکھا تھا۔ اُس کو اب انگلستان جانا تھا کہ وہاں سے چار سال کے مطالعہ اور محنت کے بعد انجنیئر بن کر واپس آئے۔ اس پروگرام کو تبدیل کرنے کی ہمت اُس میں نہ تھی۔ اور نہ ایسا کرنا وہ جائز سمجھتا تھا۔ کیونکہ اس کی ترتیب میں بہت حد تک خود اُس کی رائے کو دخل تھا۔ ممتاز سے علیحدگی بظاہر اُسے قیامت نظر آتی تھی۔۔ لیکن جب وہ سوچتا کہ چار سال کی جُدائی کے بعد ایک پُرامن و آسائش زندگی اُن کی منتظر ہے، وہ زندگی جس کا خوشگوار خواب وہ کئی سال سے دیکھ رہا تھا، تو اُس کے خوبصورت چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ جاتی اور اُس کی بڑی بڑی مخمور آنکھیں اس زندگی کے دلفریب مناظر کی سیر میں مصروف ہو جاتی تھیں۔

(۲)

انگلستان روانہ ہونے سے کچھ روز قبل ریاض اپنے عالیشان مکان کے ایک خوبصورت آراستہ کمرے میں بیٹھا ممتاز سے باتیں کررہا تھا۔ ممتاز اس آنے والی جدائی سے بے خبر نہ تھی لیکن وہ کرہی کیا سکتی تھی۔ وہ ڈرتی تھی کہ کہیں مغربی زندگی کی گوناگوں دلچسپیوں میں محو ہو کر ریاض اس کو بھلا نہ بیٹھے۔ ریاض کا تغافل وہ اپنے لئے موت سے بدتر سمجھتی تھی۔ لیکن اس کا یہ خدشہ بے بنیاد نہیں کہا جاسکتا۔ اُس کے سامنے اس امر کی زندہ شہادتیں موجود تھیں کہ ہندوستانی نوجوان طلبہ، جن کے دل و دماغ ہنوز غیر پختہ ہوتے ہیں، انگلستان کے اثراتِ ماحول اور وہاں کی معاشرت سے مغلوب ہو کر اپنے آپ کو کھو بیٹھتے ہیں، اور اُن کے عزیزوں کی تمام توقّعات جو اُن کے یورپ بھیجنے سے وابستہ ہوتی ہیں، دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ لیکن جب وہ ریاض کے بے تابانہ اظہارِ تعشق پر نگاہ ڈالتی تو اُس کو اپنا گمان غلط معلوم ہوتا تھا۔ ان خیالات سے متاثر ہو کر اُس نے کہا۔ "پیارے ریاض! تم انگلستان جارہے ہو، تمہیں وداع کرنے کو جی تو نہیں چاہتا مگر کیا کیا جائے حصول آرام کا یہی طریقہ ہے کہ انسان پہلے تکلیف اُٹھائے۔ چار سال بڑا لمبا عرصہ

ہے۔ عیش و مسرت کے چار سال آنکھ جھپکنے میں گذر جاتے ہیں۔ مگر فراق کے چار سال ایک کوہِ گراں ہے۔ دیکھو پیارے مجھے وہاں جاکر بھلا نہ دینا۔"

ریاضؔ بے تاب ہوگیا۔ اُس نے ممتازؔ کے حنا آلود ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں نرمی سے دبایا اور بے خود سا ہو کر کہنے لگا۔ "پیاری ممتاز، میری مسرت اور راحت تم ہو۔ میری دُنیا بھر کی خوشیاں تمہارے ساتھ وابستہ ہیں۔ تمہاری خدمت ہی میری زندگی کا مقصد ہے۔ تمہیں بھول جانا اپنی خوشی کو عمداً ضائع کرنا ہے۔ تمہاری یاد ہمیشہ میرے دل کو بے قرار رکھے گی۔ تمہارا رُوح پرور تصوّر میری زندگی کی کلفتوں کا تنہا علاج ہوگا۔ اگر محبّت بھی کوئی مادی شے ہوتی اور اُس کی مقدار مقرّر ہوتی تو شاید میں تم کو بتا سکتا کہ میرا دل تمہیں کس شدت سے پیار کرتا ہے۔ چار سال کی جُدائی کے بعد ہم ہمیشہ کے لئے یکجا ہو جائینگے۔ میں، تو جب کبھی اُس زندگی کا، آہ، لاانتہا ہی مسرّتوں کا جو تمہارے ساتھ رہنے پر پیدا ہوں گی، خیال کرتا ہوں، تو میرا رواں رواں خوشی سے لبریز ہو جاتا ہے۔ یہ چار سال کا عرصہ گذار لو۔ اس کے بعد ایک نشاط آمیز زندگی ہمارے لئے چشم براہ ہے۔"

ریاضؔ انگلستان روانہ ہوگیا۔ جُدا ہوتے وقت دونوں کی آنکھیں

ملیں۔ شدّتِ غم سے الفاظ حلق میں پھنس کر رہ گئے تھے لیکن آنکھوں ہی آنکھوں میں اُنھوں نے الوداعی پیغام کہہ دیا۔ ممتاز کا چہرہ غم و حرماں کی زندہ تصویر تھا۔ اس نے اپنی جان و دل کے مالک کو اپنے سے ہزاروں کوس دُور چار سال کے طویل عرصے کے لئے علیحدہ کردیا تھا۔ مستقبل کے متعلق وہ کوئی صحیح رائے قائم نہ کرسکتی تھی۔ شعاعِ امید اس کے سامنے تھی۔ لیکن اُس کا ہمیشہ اسی طرح روشن و فروزاں رہنا یقینی نہ تھا۔ ریاض نے جہاز پر سوار ہوتے وقت اور پھر دورانِ سفر میں کئی خط ممتاز کو لکھے۔ اُس کو ممتاز سے بہت محبّت تھی۔

(۳)

انگلستان کی مصروف اور لااُبالیانہ طرز کی مخلوط زندگی ہندوستانی نوجوانوں کو ہمیشہ ایک معمہ نظر آتی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اپنے گردوپیش کی حسین اور دلآویز چیزوں سے آنکھیں بند کرکے اپنے کام میں لگے رہیں۔ اور فراغت کے وقت دماغ کو تمام فرائض کے احساس سے محروم کرکے وہاں کی جدید دلچسپیوں میں بدرجہ اتم حصہ بھی لیں۔ لیکن تجربے کی خامی اور وہاں کی طرزِ بود و ماند سے کماحقہٗ واقف نہ ہونے کے باعث افراط و تفریط کا شکار ہو جاتے ہیں اور کام اور تفریح میں جو مساوات قائم رکھنا چاہتے ہیں نہیں رکھ سکتے۔ ریاض نے گلاسگو کی

یونیورسٹی میں داخل ہو کر باقاعدہ تعلیم شروع کر دی۔ اپنے لئے موزوں قیام گاہ تلاش کرنے اور دیگر ابتدائی ضروریات پورا کرنے میں مصروف رہنے کی وجہ سے وہ ممتاز کو بہت مفصل خط نہ لکھ سکا۔ فرصت کے وقت اُس کو اکثر ممتازؔ یاد آتی تھی۔ لیکن خطوں میں وہ اس بات کی احتیاط رکھتا تھا کہ مصائبِ فرقت کا بے تابانہ اظہار نہ ہونے پائے۔ وہ ممتاز کو ہمیشہ محبت آمیز تسلّیاں لکھ لکھ کر بھیجتا تھا۔

(۴)

ریاضؔ کو انگلستان میں تین سال گذر چکے تھے۔ اُس پر آہستہ آہستہ افسردگی طاری ہوتی گئی۔ ہندوستان اور ہندوستان کی ہر چیز سے وہ متنفّر ہو گیا۔ یہ خیال کہ ایک ہندوستانی بیوی کا خاوند ہونے کی حیثیت سے وہ بہت سی ذمہ داریوں کا مالک ہے۔ اُس کے عیش و آرام کو گاہے گاہے سخت منغّص کر دیتا تھا۔ اس کی ازدواجی زندگی اُس کے لئے ایک بوجھل زنجیر بن گئی جس نے اس کی آزادی کو بُری طرح سلب کر لیا۔ وہ اکثر سوچتا کہ اگر تجرّد کی حالت میں وہ انگلستان آتا تو کیسے اطمینان اور کس بے فکری سے وقت گذرتا۔ یہیں کسی شعلہ جمال حسینہ کو اپنے لئے منتخب کر لیتا اور بقیہ زندگی اسی معمورۂ عشرت میں بسر کر دیتا۔ وہ کبھی کبھی گویا ایک ناگوار

فرض ادا کرنے کے لئے، ممتاز کو خط لکھ دیتا تھا۔ ممتاز نے اس تبدیلی کو شدت سے محسوس کیا۔ وہ اظہارِ جذبات کے طریقوں سے واقف تھی۔ اب وہ ریاض کی تحریر میں صاف تصنّع اور بناوٹ پاتی تھی اُس کی محبّت اُسے جھوٹی نظر آنے لگی۔ اس تلخ حقیقت کا انکشاف اُس کی جان کو ایک روگ بن کر چمٹ گیا۔ اُس نے ریاض کو درد و حسرت سے لبریز خط لکھے مگر ریاض، ہندوستانی ریاض، ممتاز کا عاشقِ زار ریاض نہیں بلکہ مغرب زدہ، انگریزیّت پرست اور دلدادۂ نمائش ریاض کو کہاں فرصت تھی کہ ہندوستانی نادان لڑکی کی چیخ پکار کی طرف متوجہ ہوتا۔ وہ ان خطوط کو جو کبھی اُس کے لئے نویدِ بہار تھے۔ اب نوحۂ غم سمجھتا۔ اور چاہتا تھا کہ اُس کی جدید پُرعشرت زندگی میں اُس کے کان جو نغمہ ہائے شیریں سے مانوس ہو چکے تھے۔ اس نوحہ سے نا آشنا ہی رہیں۔ رفتہ رفتہ اُس نے ممتاز کو خط لکھنا بالکل ترک کر دیا۔ ہفتے اور مہینے گذر جاتے مگر ممتاز بدستور انتظارِ مجسّم ہے۔ اُس کی آنکھیں ریاض کی تحریر دیکھنے کی منتظر ہیں۔ مگر ریاض کی سنگین خاموشی اُس کی آرزوؤں کو ہمیشہ کی نیند سُلا رہی ہے۔ ہزاروں کوس کے فاصلے پر صرف خط و کتابت ہی کا سلسلہ تھا۔ جس نے دونوں کی روحوں کو باہم پیوست کر رکھا تھا۔ مگر اب وہ تعلق بھی منقطع ہو چکا

تھا۔ ممتازؔ اب کس آس پہ زندگی بسر کرتی۔ جس شخص کو وہ اپنا سمجھ رہی تھی، جس کی محبت پر اُسے ناز تھا۔ اب وہی اُسے ایک غیر ضروری چیز سمجھ کر اپنے سے علیحدہ کر رہا تھا۔ جب وہ مستقبل کا خیال کرتی تو بیم و یاس کی ہولناک تاریکی سے اُس کا دل لرز اُٹھتا تھا۔ وہ بار بار سوچتی کہ کیا ریاضؔ کی تمام الفت منافقت اور ریاضؔ کا تمام عشق دھوکا تھا۔ جب وہ اُس کے شوق کی وارفتگی اور شیفتگی کا مقابلہ موجودہ سرد مہری سے کرتی تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ ریاضؔ کے الوداعی الفاظ کہ "یہ چار سال کا عرصہ گذار لو۔ اس کے بعد ایک نشاط آمیز زندگی ہمارے لئے چشم براہ ہے۔" اب اُسے بے حقیقت، خطرناک مردانہ مذاق معلوم ہو رہا تھا۔ مہینوں گذر گئے مگر ریاضؔ کے دلخراش سکوت میں مضبوطی ہی ہوتی گئی۔ ممتازؔ کو اب یقین ہو گیا۔ کہ سارا ماجرا ایک خواب تھا، جس کی مصنوعی دلفریبیوں نے اُسے مسحور کر رکھا تھا۔ اُسے اب معلوم ہوا کہ مرد کی محبت تارِ عنکبوت سے زیادہ کمزور اور ہوا کے جھونکے سے جلد ختم ہو جانے والی چیز ہے۔ اس پر اعتبار کرنا گویا آگ کے شعلوں سے کھیلنا ہے۔

(۵)

ریاضؔ کے تغافل کا لازمی نتیجہ ممتازؔ کی صحت پر ظاہر ہوا۔ اگر

کوئی اور لڑکی ہوتی تو شاید اس قدر اثر پذیر نہ ہوتی مگر ممتاز تو غیر معمولی طور پر سریع الاحساس تھی۔ عورت کو اگر انتہائی یاس کے عالم میں دیکھنا چاہو تو اُس وقت دیکھو جب وہ ناکامِ محبت ہو ممتاز کو اپنے تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ وہ اب بھی حسین تھی۔ مگر پژمردہ کلی کی طرح۔ وہ گھنٹوں محوِ خیال رہتی اور بسا اوقات اپنی کمزور طبیعت پر قابو نہ پا کر پہروں رویا کرتی تھی۔ ریاض کی بیوفائی نے اُس کی رُوح کو پگھلا دیا تھا۔ نیرنگیٔ دہر کا یہ تکلیف دہ سبق اُس نے حیرت کے ساتھ پڑھا۔ اُس پر اب واضح ہوا کہ مرد کس قدر چاپلوس، کتنے بے مروّت اور کیسے بے وفا ہوتے ہیں۔ اپنی غرض کے لئے دوسروں کے مفاد کس سنگدلی سے قربان کر دیتے ہیں۔ ممتاز کے والدین بہت متفکر ہو رہے تھے۔ اُنہوں نے بیسیوں علاج کئے مگر ممتاز کے درد کا درماں ممکن نہ تھا۔ عورت کی تمام بیماریوں کا علاج مرد کی محبّت ہے ممتاز کا چہرہ ہر وقت آلام و تفکّرات کا مسکن بنا رہتا تھا اور وہ خود محسوس کرتی تھی کہ اُس کی رُوح آہستہ آہستہ اُس کے بدن سے علیحدہ کی جا رہی ہے۔ ہلکا ہلکا بخار اُس کی ہڈیوں میں ٹھہر گیا تھا۔ کھانسی اور زکام گھڑی بھر کے لئے جُدا نہ ہوتے تھے۔ وہ بے انتہا لاغر ہو گئی تھی۔ اب اُسے صحتیاب ہونے کی قطعاً امید نہ تھی جب

وہ چاروں طرف سے مایوس ہو گئی، جب امید کی ٹمٹماتی ہوئی شعاع اُس کے سامنے بُجھ کر رہ گئی، جب یاس کی ناقابلِ شگاف گھٹائیں ہر طرف سے اُس پر اُمنڈ آئیں تو اُس نے ایک رات بصد دقّت لیمپ کی روشنی میں ذیل کا خط ریاض کے نام لکھا۔

"اگر میری ندائے درد تمہارے عیش و آرام کو گھڑی بھر کے لئے پراگندہ کرے تو مجھے معاف کر دینا۔ میرا کوئی حق نہیں کہ تمہاری خوشیوں میں خلل انداز ہونے کی کوشش کروں۔ میرا دل قابو سے باہر ہو رہا ہے اور شدّتِ غم سے سینہ پھٹا جاتا ہے۔ کاش تمہیں معلوم ہوتا کہ تمہاری ممتاز کی زندگی کا سہارا تمہاری نگہِ التفات ہے۔ تمہارے لئے انگلستان کی سدا بہار سرزمین میں سیکڑوں دلچسپیاں ہوں گی جہاں تمہاری ہر کلفت کی تلافی ہو سکتی ہے۔ مجھ حرماں نصیب کے لئے صرف تمہارے نام کا وظیفہ ہے۔ جب دل بہت بے قرار ہو جاتا ہے تو تمہارے گذشتہ خطوط جن سے محبّت کی خوشبو آتی ہے پڑھتی ہوں اور سیکڑوں بار چومتی ہوں۔ مجھے یقین نہ تھا کہ تمہاری محبّت اس قدر جلد بدل جانے والی ہے۔ اُس موہوم زندگی کی دلفریبیوں کا تصوّر کیا کرتی تھی جو تمہارے واپس ہندوستان آنے پر پیدا ہوں گی۔ مگر آہ میری امیدوں کا خون کس حسرتناک طریقے سے

ہوتا۔ میری زندگی ویران ہو گئی ہے۔ سُنا کرتی تھی کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ ممکن نہیں کہ ایک شخص دوسرے کی محبت میں سرشار ہو۔ اور دوسرا اُس کا جواب تغافل و بے اعتنائی سے دے۔ مگر تجربے نے اس پر مہر تصدیق نہ لگائی۔ اس وقت رات کے سنّاٹے میں جب سب خاموشی سے سو رہے ہیں۔ میرا دل آگ کی طرح بھڑک رہا ہے۔ کسی پہلو کل نہیں اور یہ حالت آج سے نہیں بلکہ مہینوں سے ہے۔ میری بیماری کا حال تو تم نے سُن ہی لیا ہو گا والدین علاج معالجہ کی زحمت میں کوشاں ہیں۔ مگر مجھے یقین ہے کہ اگر ایک بار تمہارا پُر تبسّم پیارا چہرہ دیکھ لوں تو یہ تمام بیماری کافور ہو جائے۔ ریاضؔ! خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو۔ میرا دل تمہاری پرستش کرتا ہے میرے دن اور میری راتیں تمہیں کیا معلوم کیسے گذر رہی ہیں۔ یہ زمانہ ایک پہاڑ ہے جس کے ٹلنے کی کوئی امید نہیں۔ یہ بیماری اب مجھ سے جدا نہ ہو گی۔ بیسیوں علاج ہوئے مگر شفا تو صرف تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اب زندگی کی آس منقطع ہو چکی ہے۔ میرا یہ آخری عریضہ تمہاری خدمت میں پہنچتا ہے۔ اس کے بعد تم سُنو گے کہ فرقت نصیب ممتازؔ اپنے جان سے پیارے ریاضؔ پر قربان ہو گئی۔ دل تو یہی چاہتا تھا کہ جان تمہارے ہاتھوں میں نکلتی مگر قسمت نے یہ موقع بھی نہ دیا۔

دل اندر ہی اندر ڈوب رہا ہے۔ ہاتھوں میں اب سکت نہیں رہی۔ قلم بے طرح جنبش کر رہا ہے۔ اس باصرہ خراشی کی مجھے معافی دیدو۔ خدا کرے تمہیں زندگی کی بہاریں دیکھنا نصیب ہوں۔"

ممتاز نے خط لکھنے کے بعد ایسا محسوس کیا کہ اُس کی رُوح پر سے بوجھ اُتر گیا ہے۔ وہ ایک ضروری فرض ادا کر چکی تھی۔ اب وہ اپنے آپ کو زیادہ مطمئن پاتی تھی۔ مگر وہ اطمینان کیفیّتِ اضطراب سے کہیں زیادہ تکلیف دہ تھا۔ اُس کی آنکھیں سامنے دیوار پر جمی ہوئی تھیں شاید وہ قوّتِ متخیلہ سے عہدِ گذشتہ کے واقعات کو دوبارہ اپنے سامنے لا رہی تھی۔ اُس کا چہرہ حسرت و اندوہ کی مکمل تصویر تھا۔ اس بات کا تیقّن کہ اب وہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ ریاض کو جس کا خیال اُس کے دل و دماغ پر مستولی تھا، اب آخری مرتبہ بھی وہ نہیں دیکھ سکتی۔ اپنی ناداری اور بے بسی کا تصوّر۔ ان سب نے مل کر اُس کے دماغ میں ہیجان پیدا کر دیا۔ اُسے یوں محسوس ہوا کہ اُس کا دل مسلا جا رہا ہے۔ وہ اس بے چینی کی متحمّل نہ ہو سکی۔ اُس کے بے تاب لرزتے ہوئے آنسو اُس کے رُخساروں پر گرے اور گھڑی بھر میں بستر کا تکیہ اشکوں سے تر ہو چکا تھا۔

دوسری صبح ممتاز کا یہ حال تھا جیسے کوئی غریب بے بس پرندہ

قید سے تنگ آکر قفس سے نکلنے کی بے سود کوشش کرتا ہے اور چند گھنٹوں کی سعی لاطائل کے بعد خود ہی نڈھال ہوکر گر پڑتا ہے۔ آج وہ بے انتہا کمزور اور لاغر معلوم ہوتی تھی۔ اُس کے چہرے پر رونق اور بشاشت نام کو نہ تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی زندگی کی گھڑیاں پوری ہو چکیں۔ اس کے عزیز واقربا اپنے غمگین اور پریشان چہروں سے اُس کے گرد حلقہ کئے ہوئے تھے کہ وہ کچھ بولے۔ مگر مریضۂ عشق کی آنکھیں چھت کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ شاید وہ اب بھی اُس نام کو جس نے اُسے دُنیا سے بیگانہ کر دیا تھا اپنے دل میں دہرا رہی تھی کہ ہچکی آئی اور ساتھ ہی اس کی رُوح قیدِ حیات کے بندھنوں سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہوگئی۔

رات کی خاموشی میں!

رات کی خاموشی میں، تنگ و تاریک جھونپڑے کی گلا گھونٹنے والی ہوا کے اندر فرشِ خاک پر لیٹے ہوئے کتنی مرتبہ مَیں نے چاہا کہ اب ایسی نیند سو جاؤں کہ پھر نہ اُٹھوں۔ گناہ کا بار سینے پر لئے ہوئے اس طرح غائب ہو جاؤں کہ دُنیا اور دُنیا والوں کے لئے کوئی نشانِ عبرت بھی باقی نہ رہے۔ مگر ہر صبح، جب صبحِ قیامت کے استقبال کو اُٹھتا ہوں، تو کیا دیکھتا ہوں کہ وُہی روزمرّہ کا سُورج اپنی آتشیں شعاعوں کے ساتھ پھر ایک بار مجھے دُنیا کی راز جُو نگاہوں کے سامنے عریاں ہدفِ استہزا بنانے کے لئے چمک رہا ہے۔ اندھیری راتوں کو جب جھکّڑ کی خوفناک تُندی اور آندھی کا زور بدن میں سنسناہٹ پیدا کر دیتا ہے۔ جب بڑے بڑے تناور درخت جڑ سے اُکھڑ جاتے ہیں اور جب بارش اور اولوں کے طوفانی شور میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ خبیث روحیں تحت الثریٰ سے نکل کر کائنات کو اپنی لرزہ انگیز چیخوں سے

تہ و بالا کر ڈالیں گی میں اپنے پر نگاہ ڈالتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ انسان کا دل ان طوفان زدہ عناصر سے کس قدر مشابہت رکھتا ہے۔ "انسان کا دل!" میں نے غلط استعمال کیا۔

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا

وہ جنہیں زندگی کی تلخ کامیوں سے واسطہ ہی نہیں پڑا۔ جنہوں نے آنکھ کھولتے ہی گلشنِ حیات میں شگوفے نکلتے، کلیاں چٹکتی اور نواسنجانِ چمن کو نغمہ پیرائی میں مصروف دیکھا۔ جن کے کان سازِ زندگی سے صرف نغمہ ہائے عشرت ہی سُننے کے عادی رہے۔ جن کی سماعت نوحۂ غم کی دلدوز صداؤں سے ہمیشہ محفوظ رہی، آہ، وہ بھی انسان ہیں۔ اگر یہی "انسان" ہیں تو کیا اس لفظ کا اطلاق اُن سوختہ سامانوں پر بھی ہو سکے گا۔ جن پر آسمان کے ترکش کا آخری تیر ختم ہو چکا ہے۔ جنہوں نے آنکھ کھولی تو زندگی کے باغ میں پت جھڑ شروع ہو چکی تھی۔ اور جُوں جُوں دن گزرتے گئے بادِ خزاں کے تُند جھونکوں سے پتے گرتے اور پھول مرجھاتے گئے۔ جن کی اُمید کی کلی کھلنے سے پیشتر ہی مصائب کی گرم لُو نے جلا کر خاک کر دی۔ جن کی کشتیٔ حیات سفر کی شروع منزل میں حوادث کی سخت چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی۔ وہ خوش نصیب جن کی آنکھیں اشکِ خونناب اور دل بارِ الم سے آزاد ہیں کیونکر سمجھ سکتے

ہیں کہ انسان کا دل بھی ان طوفان زدہ عناصر کی طرح بجائے خود ایک پُرخروش طوفان ہے۔ وہ بیدار بخت ہستیاں جن کے لئے "ہزار بستر خارِ بستر" اور "سر رنج بالیں" نہیں ثابت ہوتا کیا جانیں کہ ایک طوفان زدہ دل کو پہلو میں لے کر سونا گویا کانٹوں پر لیٹنا اور دہکتے کوئلوں پر جلنا ہے۔

اکثر راتیں اسی طرح آنکھوں میں کٹ جاتی ہیں صبح کے انتظار میں نہیں۔ کیونکہ فکر فردا و غمِ ماضی تو میری جان کے قاتل ہیں۔ آرزوئیں پیدا ہوتی ہیں اور اندر ہی اندر مر جاتی ہیں۔ خیالات آتے ہیں اور کسی کے کان یا زبانِ قلم تک پہنچنے سے قبل ہی فنا ہو جاتے ہیں۔ رات کے اختتام پر سپیدۂ سحر نمودار ہو کر حیاتِ تازہ کا پیغام دیتا ہے۔ ہر شب آسمان پر تیرہ و تار بادل چھائے رہتے ہیں اور کائنات ایک گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ملفوف رہتی ہے۔ لیکن اُس وقت بھی گاہے گاہے بجلی چمک کر زمان و مکان کو، ایک لمحہ کے لئے ہی سہی، پُر نور کر جاتی ہے۔ مگر آہ میرا مطلعِ حیات !!!!!!!!! سالہا سال گذر جانے پر ایک امیدِ گریزاں، ایک فریبِ نفس میں مبتلا ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہوں کہ شاید اُس کے اُفقِ تاریک پر بھی کوئی روشنی جلوہ گر ہو۔ مگر جہاں میری اور تمنّائیں لاحاصل ثابت ہوئیں یہ آرزو بھی بجھتی نظر آ رہی ہے۔

میرے آقا، عین اُس وقت کہ مَیں صبح مسرّت کی شادکامیوں سے ہمکنار ہونے والا تھا۔ تو نے مجھے شامِ غم کی حسرتوں سے دوچار کردیا۔ جامِ عشرت میرے لبوں تک پہنچتے پہنچتے تلخ آبِ حیات میں مبدّل ہوگیا۔ لوگ کہتے ہیں ہر شخص کو آگ اور پانی کے طوفان میں سے گزرنا پڑتا ہے اور پھر زندگی کی تکمیل ہوتی ہے۔ سب صحیح۔ لیکن ایسے تہی دستانِ قسمت بھی تو ہیں جو تکمیلِ حیات کے اس مرحلہ سے گذرتے ہوئے شعلوں کی نذر ہوگئے یا موجوں کا لقمہ بن گئے۔ جاڑا، گرمی، برسات، بہار، خزاں رنگ رلیاں منانے والوں کے لئے قدرت کے مختلف اللّون مظاہر ہیں جن سے بلحاظِ موسم وابستگی کے لوازم بہم پہنچائے جاتے ہیں۔ مگر غم کا ایک ہی موسم ہے۔ غمگین دلوں کے لئے وقت بدلتا نہیں گردش کرتا ہے۔ کتنی برساتیں آئیں اور گذر گئیں مگر میرا دیدۂ گریاں نہ تھما۔ بادل آئے، کھُل کر برسے اور برس کر کھُل گئے، لیکن ادبار کی کالی گھٹائیں نہ چھٹیں۔ گرمی کی شدّت دُنیا کو نمونۂ جہنّم بناکر سردی میں تبدیل ہوتی گئی مگر اُس تپش کا کیا علاج جس نے میری جانِ ناتواں کو شعلۂ نار اور روحِ حزانہ کو آتش کدہ بنا رکھا ہے۔

اے آقا! مَیں تجھ سے شبہائے عشرت کا طالب نہیں ہوں حیاتِ مستعار کے چند دنوں کو جھوٹی خوشیوں سے بھر لینا نہیں چاہتا۔ مَیں تیرے پاس

شکایت لے کر نہیں آیا کہ کیوں مجھ سے کم استعداد والے لوگ موردِ الطاف و اکرام ہو رہے ہیں۔ میں کون کہ تیری تقسیمِ انعامات پر حرف گیری کروں؟ ہاں اس دُنیائے فانی میں، جہاں روزِ محشر سے قبل نفسی نفسی کا عالم طاری ہے، اطمینان کا ایک سانس چاہتا ہوں۔ قلب کو وہ کیفِ سرمدی عطا کر جو رنج اور راحت، دُکھ اور سُکھ کو یکساں برداشت کر لے اور شکوہ زبان پہ نہ آئے۔ تیری رضا سے اپنی رضا وابستہ کر لُوں۔

مجھے دوست دشمن کسی سے گلہ نہیں۔ ہر چند کہ اپنوں کی بیگانگی اور دوستوں کی بے مروّتی نے کئی مرتبہ خون کے آنسو رلائے۔ تُو، جو لطف و احسان کا سرچشمہ اور انوار و تجلّیات کا منبع ہے، مجھ سیاہ کار کے قلبِ حزیں کو، جو کثرتِ عصیاں سے اپنی درخشانی کھو چکا ہے، لمعاتِ قدسی کے ایک پرتو سے منوّر کر دے۔ تیری ذات میری حدِّ نگاہ سے بھی بلند ہے اور اتنی پاکیزہ کہ میں اس کا تصوّر کرنے کا اہل نہیں۔ مگر اے نَحْنُ اَقْرَبُ کہہ کر کشتِ اُمید کو سرسبز کرنے اور مایوس دلوں کو ڈھارس دینے والے! میں دیوانہ وار تیری طرف دوڑتا ہوں۔ مجھ کو دامنِ شفقت میں چھپا لے۔ پانی کا بے مقدار قطرہ سمندر میں مل کر بحرِ بے پایاں کا لقب اختیار کر لیتا ہے۔ ریت کا حقیر ذرّہ ریگ زار میں سماتا ہے، تو صحرا بن جاتا ہے۔ میں بھی ہر چند کہ کون و مکاں کی بے پناہ پہنائیوں اور

عالمگیر وسعتوں میں گم کردہ راہ مسافر کی طرح بھٹک رہا ہوں، تیری جانب دوڑوں گا۔ اگر سمندر کی لہریں چاند تک پہنچ سکیں گی۔ اگر دیدۂ نرگس کی بے نوری دیارِ حبیب سے روشن ہو سکے گی۔ اور اگر بلبل سینہ چاک کو بہارِ جاوداں کی دائمی مواصلت کبھی میسّر آ سکے گی تو شاید میں بھی، آہ میں بھی، ایک دن اپنی ذات کو جو میری رُوح کے لئے بوجھل اور رُوح کو جو میری ذات کے لئے بارِ گراں ہے تجھ میں فنا کر کے مقصدِ حیات پا سکوں۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

سُہیل

سالہا سال گذر گئے۔ طالب علمی کی زندگی ایک خواب ہو گئی ۔۔۔ روزمرّہ کی مصروفیتیں اور انکار اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ میں اُس دَورِ حیات کو، جسے اپنی دلپذیر روش کے لحاظ سے اب میری زندگی سے کوئی مماثلت نہیں رہی، ایک دلچسپ افسانہ تصوّر کرنے لگا ہوں۔ لیکن اب بھی کبھی دُنیا کی اُلجھنوں سے دماغ بہت پریشان ہو جاتا ہے تو اُسی بھُولے ہوتے خواب کی یاد میں محو ہو کر اپنے موجودہ لیل ونہار سے غافل ہو جانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس عارضی خود فراموشی سے کچھ قلیل سی ذہنی عشرت تو میسّر آجاتی ہے۔ مگر یہ ایک طلسم ہے جس کے جلدی ہی ٹوٹ جانے پر پھر وہی زندگی اکاروباری زندگی، جس میں صبح سے شام تک مجھے حصولِ معاش کے لئے سرگرداں رہنا پڑتا ہے اپنی تمام تگ و دَو کے ساتھ میرے پیش نظر ہوتی ہے۔ مقابلۂ زیست اس قدر سخت ہو گیا ہے کہ مُڑ کر پیچھے دیکھنے کی فرصت

ہی نہیں۔ اور لبسا اوقات حالات سے مغلوب ہو کر میں تو یہ خیال کرنے لگتا ہوں کہ میرا دماغ کبھی کسبِ معیشت کی فکر سے آزاد نہ تھا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ زمانۂ تعلیم میں میرا شمار کالج کے اُن طلبہ میں ہوتا تھا جن کے عیش و آرام میں فکرِ فردا نے کبھی دخل دینے کی جرأت نہ کی تھی۔

بی اے کے دو سال تعلیمی نقطہ نگاہ سے تو اہم تھے ہی مگر جس خصوصیت سے وہ میری نظروں میں ممتاز ہیں وہ ان مختلف دلچسپیوں اور گوناگوں مشاغل کا ایک دلفریب مجموعہ تھا جس نے اس زمانے میں خود میری زندگی کو میرے لئے قابلِ رشک بنا رکھا تھا۔ اُن پُر لطف ایّام کو جو اب ناقابلِ حصول ہیں میں برضا و رغبت چھوڑنے پر کبھی آمادہ نہ ہوتا۔ مگر حالات کے تغیّر نے مجبور کر دیا کہ کالج کی محدود چاردیواری سے نکل کر زندگی کے وسیع کارزار میں حصّہ لیا جائے، یہ دو سال، جو میری دسترس سے باہر ہونے کے باعث بظاہر بہت لطف و مسرّت سے لبریز نظر آتے ہیں، اپنے اندر ایک ایسے افسوسناک واقعہ کی یاد پنہاں رکھتے ہیں۔ جس نے کالج سے نکلنے کے بعد عرصہ دراز تک میرے دماغ کو پریشان اور ہمہ اوقات اپنی طرف متوجہ رکھا۔ انسانی فطرت کا یہ بھی ایک ستم ظریفانہ پہلو ہے کہ ہر چیز جسے ہم ناممکن الحصول

سمجھتے ہیں ہمیں دلفریب معلوم ہوتی ہے۔ ماضی، خواہ وہ ہمارے مصائب و نوائب کی ایک داستان ہی کیوں نہ ہو، اس نظریے کے ماتحت ہم کو حال سے زیادہ خوشگوار نظر آتا ہے۔ وہ واقعہ جس کا تذکرہ مجھے ذیل کی سطور میں کرنا ہے اپنی نوعیت کے اعتبار سے اتنا رنج دِہ ہے کہ میرے دماغ سے اُس زمانے کی تمام دلچسپیوں کو محو ہو جانا چاہیے تھا۔ مگر تعجب ہے کہ مَیں اب بھی ماضی کی یاد میں آنسو بہا رہا ہوں۔

سہیل نے جو کچھ کیا وہ ٹھیک تھا یا غلط؟ اس کا صحیح محاکمہ کرنے کے مَیں اب قابل ہوا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر سہیل میرے ساتھ ساتھ مراحلِ زندگی طے کرتا ہوا یہاں تک آ پہنچتا تو جس طرح دُنیا کے نشیب و فراز آج میری آنکھوں کے سامنے بے نقاب ہو رہے ہیں۔ اسی طرح وہ بھی زندگی اور اُس کے مختلف پہلوؤں پر بخوبی حاوی ہو جاتا۔ مگر افسوس کہ "واقعات" کی بادِ مخالف نے ایسے وقت جبکہ اُس کا دماغ پوری طرح پختہ بھی نہ ہونے پایا تھا اُسے تصویر کے ایک ہی رُخ کے مطالعہ میں غرق کر دیا۔ مَیں نہیں کہہ سکتا کہ یہ اُس کی دماغی ساخت تھی جو اُسے ورثہ میں ملی تھی یا ہوش سنبھالتے وقت حالاتِ گرد و پیش تھے۔ جنہوں نے اُس کی قوّتِ احساس کو حد درجہ تیز کر دیا تھا۔ بہر حال یہ ضرور کہوں گا کہ کچھ اُس کی اپنی طبیعت کا رُجحان اور کچھ

اُس کے موافق اُس فضا کا اثر جس میں سِنّ بلوغ کو پہنچا۔ کہ اُس کے خیالات کی ایک خاص رو بن گئی جس میں آخر تک ترقی تو ہوتی گئی مگر تبدیلی نہ ہوئی۔

ابتدا سے سُہیل کو ایسے واقعات پیش آنا شروع ہوئے جنہوں نے اُس کے دماغ کو طالب علمی کی نازک جالیوں سے نکال کر زندگی کے ٹھوس جنجالوں میں ڈال دیا۔ ہمارا بے فکری کا زمانہ تھا۔ صبح سے شام تک ایک ہی راگ الاپا جاتا تھا۔ حسن کے روز افزوں مشاہدے نے مذاق اس قدر لطیف بنا دیا تھا کہ تاریکی کے تصوّر ہی سے طبیعت گھبرا جاتی تھی۔ افلاس، ناداری، مصیبت، موت ایسی چیزیں تھیں کہ ہمیں کسی صورت گوارا نہ تھا۔ کہ اُن کے خیال سے اپنی زندگی مکدر کر لیں مگر سُہیل، بالکل اس کے برعکس، ہم سے چھپ چھپا کر انہی دماغ سوز مسائل پر اپنے فرصت کے گھنٹے ضائع کیا کرتا۔ اس کی وجہ، جہانتک مَیں سمجھ سکا ہوں، سوائے اُس کے وسیع مطالعہ کے، جو نہ صرف کتابوں کے صفحات پر حاوی تھا بلکہ جس کے ساتھ دنیوی تجربہ بھی شامل تھا، اور اُس کی کامل تنہائی کے اور کچھ نہ تھی۔ بچپن میں اُس کی والدہ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا تھا اور اس طرح وہ زندگی کے دورِ اوّل ہی میں اُس نعمت سے محروم ہو گیا جو اس حیاتِ مستعار میں صرف ایک مرتبہ ملتی ہے اور جس کا نعم البدل کچھ بھی نہیں۔ آغوشِ مادر جہاں

مصائبِ زیست سے تھکے ہوئے دماغ کو سچی راحت میسّر آتی ہے۔ اُسے نصیب ہی نہ ہوئی تھی۔ اس حادثے نے نہ صرف اُس کی فطری جولانی کو، جو ایامِ طفلی کی امتیازی شان ہوتی ہے، روک دیا بلکہ اُس کے خدوخال پر ایک ایسی مُہر لگادی کہ دیکھنے والا جھٹ پہچان جاتا کہ یہ کسی مستقل غم کی مُہر تھی۔

میری اور سہیل کی ملاقات پہلے پہل اسکول کے ہوسٹل میں ہوئی اُس کے والد اُسے اسکول میں داخل کرا کے واپس چلے گئے۔ مگر سہیل نے عام نو واردہ طلبہ کی طرح باپ کی جدائی کو بالکل محسوس نہ کیا۔ اُس کا چہرہ ہشاش بشاش تو نہ تھا مگر اُس پر اُداسی کی علامتیں بھی نہ تھیں۔ اتفاق سے اُسے رہائش کے لئے میرے ہی کمرے میں جگہ ملی اور یوں "ہم کمرہ" و ہم جماعت ہونے کے لحاظ سے ہم میں آہستہ آہستہ بے تکلفی سی پیدا ہوگئی۔ جوں جوں ہمارے تعلقات بڑھتے جاتے تھے میں یہ محسوس کرتا تھا کہ سہیل کی اور میری طبیعت میں بہت مغائرت ہے۔ مگر تعجب ہے کہ اس اختلافِ مزاج کے باوجود ہم کیونکر شیر و شکر ہوگئے۔ اسکول کے عام لڑکوں کی طرح وہ بہت چلبلا نہ تھا۔ ہاں بامذاق خوب تھا۔ اس چھوٹی سی عمر میں اس کا اصول کہ "ہر ایک کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آؤ لیکن دوستی کا شرف صرف ایک کو عطا کرو۔"

کیسا پاکیزہ خیال تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اُس نے اپنے جینِ حیات میں کسی کو یہ شرف بخشا تو میں ہی تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو خوب سمجھ گئے تھے۔ اور وہ اختلاف جس کی طرف مَیں نے ابھی اشارہ کیا ہے۔ ایسی چیز نہ تھی کہ اُس کی وجہ سے ہمارے دلوں میں کوئی کدورت پیدا ہو جاتی۔ بلکہ کئی مرتبہ اُسی اختلاف کے سبب ایسی دلچسپ اور شگفتہ بحثیں ہمارے درمیان ہوئیں کہ اُن کی یاد آج بھی روح میں بالیدگی اور دماغ میں جلا پیدا کرتی ہے۔ جب ہم ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتے تو یہی اختلاف تھا جو اشتیاق ملاقات میں ہیجان پیدا کرتا اور بوقت ملاقات ہمیں گھنٹوں مصروفِ گفتار رکھتا تھا۔

ہوسٹل کے لڑکوں کا قاعدہ تھا کہ اسکول میں ایک آدھ چھٹی ہوئی تو گھر بھاگ گئے۔ مَیں بھی غربت سے تنگ آیا ہوا فرصت کے ہر موقع کو غنیمت جان کر اپنے عزیزوں سے ملنے چلا جاتا تھا۔ مگر سہیل ایسا مستقل مزاج نکلا کہ متواتر سات آٹھ تعطیلیں ہوسٹل میں گذار دیتا تھا۔ پہلے تو میں نے خیال کیا کہ اُسے لاہور سے غیر معمولی اُنس ہو گیا ہے مگر اس چھوٹی سی عمر میں گھر بار چھوڑ کر غریب الوطنی کو پسند کر لینا عام بات نہ تھی۔ لڑکے گھروں سے تازہ دم ہو کر واپس آتے اور کئی کئی دن اُس پُرلطف مگر سادہ زندگی کے چٹخارے لیتے رہتے تھے۔

سہیل کے چہرے کو دیکھ کر یہ معلوم کر لینا بالکل آسان تھا کہ یا تو اُسے ایسی زندگی سے مس ہی نہیں اور یا اُس کا تجربہ اُس کے برعکس تھا۔

ایک روز باتوں باتوں میں اُلفت مادری کا ذکر چھڑ گیا۔ ہم میں سے ہر شخص اس نعمت سے مالامال تھا۔ سہیل کی آنکھیں اس گفتگو کے دوران میں پُرنم ہو گئیں۔ مَیں سمجھ گیا کہ یہ آنسو اُس زمانے کی دُھندلی یاد نے پیدا کئے ہیں جو اُس کے ذہن میں خواب کی سی مبہم کیفیت رکھتا تھا۔ ایک دفعہ وہ خود ہی مجھ سے کہنے لگا کہ "جب تم لوگ ماں کا ذکر کرتے ہو تو مَیں اپنے آپ کو اجنبی یا کسی اور دُنیا کا رہنے والا تصوّر کرتا ہوں۔ مَیں ہزار کوشش کروں۔ مگر پھر بھی اُس محبت کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ جسے تم ایسے ایسے شاندار لفظوں میں بیان کرتے ہو۔ کبھی تو تم اُسے دُنیا کی عظیم ترین نعمت کہتے ہو۔ کبھی قدرت کا سب سے پاکیزہ عطیہ" اور کبھی آسمانی رحمت۔ مگر مَیں اپنے تخیّل کی انتہائی پرواز سے بھی نہیں سمجھ سکتا کہ یہ کیا چیز ہے۔ کیونکہ حصولِ ادراک سے قبل ہی یہ تحفہ مجھ سے چھن گیا تھا اور اس کی بجائے آج تک ایک ناکام حسرت میرے دل میں جاگزیں رہی۔ ذرا ایک روز کی فراغت ہوتی ہے تو لڑکے جھٹ گھروں کو بھاگ جاتے ہیں اور تم حیران تو ضرور ہوتے ہو گے کہ مَیں چھٹیوں کا لمبا زمانہ بھی اسی مسافرت میں گذار دیتا ہوں۔ آخر سوچو تو سہی کہ مَیں

گھر کس لئے جاؤں؟ اور جب جاتا بھی ہوں تو میری آنکھیں اُس چیز کو ڈھونڈتی ہیں جس کا تذکرہ اکثر تم سے سُن چکا ہوں۔ وہ خاص چہل پہل جو گھر کی فضا میں صرف ماں کی موجودگی پیدا کر سکتی ہے میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ میرے والد میری ضروریات کو سب سے پہلے پورا کرتے ہیں۔ ہر قسم کی سہولت میرے لئے مہیّا کی جاتی ہے۔ مگر پھر بھی میری روح کو وہاں حقیقی مسرت نہیں ملتی۔ پہلے تو مَیں اس کیفیت کا سبب معلوم کرنے سے قاصر تھا۔ مگر جب تمہاری گفتگو سُننے اور دوسرے لڑکوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تو یہ عقدہ کُھلا کہ جس چیز کا مَیں متلاشی ہوں وہ تو مجھے کبھی نہیں مل سکتی۔ گھر کی تمام رونق میں مجھے ہمیشہ ایک خلص کمی معلوم ہوتی رہی ہے۔ مگر مَیں اُس کمی کی وجہ دریافت نہ کر سکتا تھا۔ ان پیچیدگیوں سے میری طبیعت میں اُلجھن سی پیدا ہو گئی۔ اس لئے مَیں نے گھر چھوڑ کر ہوسٹل میں رہنا پسند کر لیا۔ والد ہمیشہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ مَیں ہر قسم کے جسمانی و روحانی عوارض سے محفوظ رہوں اور اُن کی خاطر داریاں بعض اوقات مجھے شرمندہ بھی کر دیتی ہیں۔ مگر مَیں، معلوم نہیں کیوں، ایسا محسوس کرتا ہوں کہ یہ سب باتیں وہ ایک فرض سمجھ کر کرتے ہیں۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ محبت کا وہ پاک اور بے پناہ شعلہ جو دُنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کو خس و خاشاک کی طرح جلا دیتا ہے۔

صرف ماں کے سینے میں فروزاں ہے۔ اولاد کی پرورش اور تربیت کو باپ ایک حد تک فرض سمجھتا ہے۔ مگر ماں ——— آہ خدا کی وہ برگزیدہ ہستی، تو صرف بے لوث محبت کے ہاتھوں قربان ہو جاتی ہے میری مرحوم ماں کی نشانی اور میرے دل کی ڈھارس صرف میری ایک بہن ہے جس کی محبت گاہے گاہے مجھے گھر کی طرف کھینچ لے جاتی ہے اُسے مجھ سے بے حد اُنس ہے اور میں اکثر سوچتا ہوں کہ شاید والدہ کی رُوح اُس میں نمودار ہو کر میری خبر گیری کر رہی ہے۔ اُس کی چمکدار آنکھوں میں، جب وہ پیار سے میری طرف دیکھتی ہے مجھے اُس فردوسی محبت کی جھلک نظر آتی ہے جس کا میں ہمیشہ سے جویا رہوں مگر یہ شاید سراسر واہمہ ہے۔"

یہ تھے سہیل کے خیالات اُس زمانے میں جبکہ ہم بچپن سے ذرا آگے نکل کر، اسکول کی محدود دُنیا میں، زندگی اور اُس کے فرائض سے بالکل بے خبر، مزے سے اپنے دن گذار رہے تھے۔ اُس نے اپنے ذہنی قوا قبل اس کے کہ وہ اس شدید سوچ بچار کے متحمل ہو سکیں، دن رات کے غور و فکر سے خراب کر لئے تھے۔ بچپن میں معمولی معمولی واقعات انسان کے دماغ پر بہت دیر پا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ انہی حالات کے ماتحت سہیل اور میں اسکول سے نکل کر کالج میں پہنچ گئے۔ کالج میں سہیل ایک

سنجیدہ، خوش مذاق اور قابل نوجوان مشہور تھا۔ مگر اس سارے عرصے میں وہ طالب علمانہ شہرت کا کبھی مالک نہ بن سکا۔ اُس کی وجہ صرف یہ تھی کہ بوقتِ مطالعہ وہ اپنے دماغ کو دوسرے خیالات سے کلیتہً آزاد نہ کر سکتا تھا۔ مَیں نے اکثر دیکھا کہ اُس کی آنکھیں کتاب کے صفحہ پر جمی ہیں۔ اور بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیرونی اثرات سے محفوظ مطالعہ میں غرق ہے۔ مگر فی الحقیقت اُس کی توسنِ متخیّلہ خدا جانے کہاں کہاں کی سیر میں مصروف ہوتی۔ سہیل کے مذہبی خیالات ایک سیدھے سادے مسلمان کی طرح عقائد پر قائم تھے۔ مذہبی بحثوں سے ہمیشہ اُسے نفرت رہی۔ ہاں فلسفۂ مذہب اور وہ تمام امور جن کا تعلّق انسانی فطرت و اخلاق سے ہے وہ سمجھنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ مَیں حیران ہوں کہ انہی عقائد کے اُلٹ پھیر نے کس طرح اُس کی زندگی کو تلخ بنا کر اُسے تباہ کر دیا۔

جنوری کے ابتدائی دن تھے اور جاڑا زوروں پر تھا۔ ایک روز سہ پہر کے قریب سہیل گھبرایا ہوا میرے پاس آیا۔ آتے ہی اُس نے ایک خط میری طرف پھینک دیا۔ مَیں نے تعجب سے پوچھا۔ "خیر تو ہے؟"

اُس نے بھرّائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "خیر کیا ہوگی۔ یہ خط پڑھ لو"

مَیں نے پھر دریافت کیا۔ "آخر بات کیا ہے۔ کچھ کہو تو سہی"۔
"کیا بتاؤں۔ ابھی ابھی ابّا کا خط ملا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ سلمیٰ یعنی میری بہن کو ایک ہفتے سے سخت بخار ہے۔ افاقے کی کوئی صورت نہیں۔ حدّت کسی وقت کم نہیں ہوتی۔ اب وہ بغرض علاج اُسے لاہور لا رہے ہیں۔ میرے تو اوسان خطا ہو گئے ہیں تمہیں معلوم ہے کہ دُنیا میں اگر کسی کو مجھ سے سچّی، معصوم اور شدید محبت ہے تو یہ بہن ہے۔ مَیں ہمیشہ اُسے والدہ کی نشانی سمجھتا رہا ہوں۔ گھر میں بھی اگر میرے لئے کوئی کشش ہے تو اسی کے دم سے۔ لے دے کے یہی ایک ہستی تھی جس کی موجودگی نے مجھے دُنیاوی تعلقات میں منسلک کر رکھا تھا۔ ورنہ اکیلا تو خدا دشمن کو بھی نہ کرے۔
مَیں نے اُسے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ "تم کیا باتیں کرتے ہو معمولی بخار ہے انشاءاللہ رفع ہو جائے گا۔ تم تو حد سے زیادہ گھبرا گئے۔ آخر بیماری بھی انسان کو لاحق ہوتی ہے۔ ہمیشہ تندرست تو کوئی نہیں رہتا۔ اُنہیں یہاں آنے دو۔ صحیح تشخیص اور باقاعدہ علاج سے جلد فائدہ ہو جائیگا"۔

تیسرے روز سہیل کے والد مریضہ کو لے کر لاہور پہنچ گئے۔ ایک ہفتہ انتہائی سرگرمی سے علاج ہوتا رہا۔ مگر کوئی تبدیلی رونما نہ ہوئی۔

بخارِ تپِ محرقہ کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ سہیل تمام مشاغل سے بے خبر، دیوانوں کی طرح پھرتا تھا۔ کئی مرتبہ میں نے اُسے حوصلہ دینے کی کوشش کی مگر وہ کچھ مایوس سا ہو گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ دُنیا میں بہت کم انسان ہیں جو مصیبت کی نامعلوم طوالت کو یکساں سکونِ خاطر سے برداشت کر سکیں۔ سلمیٰ کی حالت روز بروز خراب ہوتی گئی اور ساتھ ہی ساتھ سہیل کی پریشانی میں اضافہ ہوتا گیا۔ جب دواؤں کی پے در پے تبدیلی سے بھی مرض میں تخفیف نہ ہوئی تو سہیل ایک روز میرے پاس آیا۔ اُس کے بال پریشان تھے۔ اور چہرے پر جھُریاں پڑی ہوئی تھیں۔ کئی راتوں سے وہ مطلق نہ سو سکا تھا۔ اُس نے مضطربانہ طور پر میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبا کر کہا۔ "اب کیا کریں؟"

سوال کی نوعیت اور پھر اُس کا طرزِ استفسار، جس سے لجاجت اور بے بسی کا اظہار ہو رہا تھا، ایسی چیزیں نہ تھیں کہ میرا دل ہلائے بغیر رہ جاتیں۔ مَیں بھی مجبور تھا۔ مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑتا تھا۔ سہیل بچّہ تو نہ تھا کہ اُسے طفل تسلیوں سے اطمینان دلایا جاتا۔ وہ مجھ سے زیادہ معاملہ فہم اور ذہین تھا۔ آخر مَیں نے وُہی کہا جو کمزور انسان انتہائی مایوسی کے عالم میں کہہ سکتا ہے۔ "خدا پر بھروسہ رکھو۔ وہ جو کچھ کریگا بہتر ہوگا۔"

"بہتر ہوگا ——— کیسا لایعنی خیال ہے۔" سہیل نے

ایک حقارت آمیز تبسّم کے ساتھ یہ فقرہ اس انداز میں کہا گویا اس کا دل قانونِ قدرت کے خلاف بغاوت کرنا چاہتا ہے۔" کون سمجھدار انسان گھڑی بھر کے لئے باور کر سکتا ہے کہ قدرت کا ہر فعل بہتری پر مبنی ہے؟ کیا یہ ظلم اور فساد، قحط اور تباہیاں، دُکھ اور مصیبتیں کسی بہتری کے لئے ہیں؟ دُنیا میں خوشی ناپید ہے۔ ہم میں سے ہر شخص کسی نہ کسی تکلیف اور پریشانی کا شکار ہو رہا ہے۔ جدھر دیکھو مصیبت ہی مصیبت نظر آتی ہے۔ ایک دُکھ کا مداوا کرو تو دوسرا تیار ہے۔ اور اس طرح مصیبتوں کے ایک لامتناہی سلسلے کا نام ہم نے زندگی رکھ لیا ہے۔ کہتے ہیں مرنے کے بعد انسان کو ابدی راحت ملتی ہے۔ مَیں پوچھتا ہوں کہ اگر موت ہی راحت کا دروازہ ہے تو پھر قدرت کو تخلیق انسانی سے کیا مقصود تھا؟ انسان جیسی کمزور ہستی کو دُنیا میں پیدا کیا اور ساتھ ہی اُس کی بربادی کے لئے بے شمار آزمائشوں اور تکلیفوں کا عظیم الہیبت انبار لگا دیا۔ خالق، جسے ہم علیم اور حکیم بھی کہتے ہیں، جانتا تھا کہ انسان خامیوں اور کمزوریوں کا مرکب ہے اور یہ جاننے کے باوجود اُس نے ہمارے راستے میں ہر قدم پر ایک آدھ آزمائش کھڑی کر دی اور ساتھ ہی حکم لگا دیا کہ دیکھنا اگر تم میں سے کوئی اس آزمائش کا شکار ہوا تو اُسے جہنّم کا ایندھن بنا دیا جائیگا۔ ذرا سوچو۔ اندھی تقلید کو چھوڑ کر گھڑی بھر کے لئے غور کرو کہ یہ کام اُس ہستی کا

ہو سکتا ہے جسے تم رحیم و کریم بھی کہتے ہو؟ عالمِ انسانی کا جائزہ لے لو اور بتاؤ کہ اس کرۂ ارض پر تمہیں کتنے افراد خوش و خرّم نظر آتے ہیں۔ یقین جانو کہ دُنیا میں خوشی بالکل عنقا ہے۔ ان حالات کو دیکھ کر یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ خدا نے انسانوں کو پیدا ہی اس لئے کیا تھا کہ وہ غریب مصروفِ آلام رہیں۔ میرا خیال ہے کہ اُسے اُن کے رونے اور چیخنے میں اُن کی گریہ و زاری میں اور اُن کی ہلاکت و بربادی میں کچھ مزا ملتا ہے۔"

مَیں حیران و ششدر سہیل کی تقریر سُن رہا تھا۔ میرے پاس اُسکے خیالات کا کوئی جواب نہ تھا۔ مَیں نے آخر جھجکتے ہوئے کہا۔ "دُعا کرو یہ تمہاری حالت واقعی قابلِ رحم ہے۔"

"دعا؟" وہ پھر چمک کر بولا۔ "تم کیسی عجیب باتیں کرتے ہو۔ کیا دُعا بھی ایسی چیز ہے کہ انسان اُس پر بھروسہ کرے؟ ہماری کمزوری کی اس سے بڑھ کر کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ ہم صبح و شام دعا مانگتے رہتے ہیں۔ اگر انسان کو ذرا سا علمِ غیب ہو تو وہ کبھی دعا کے نزدیک نہ جائے۔ فرض کرو تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری تکلیف دس روز کے بعد ختم ہو جائیگی تو کیا تم اتنے بیوقوف ہو کہ اس علم کے بعد بھی دس روز تک ہاتھ آسمان کی طرف بلند کرکے گڑگڑاتے جاؤ گے؟ یہ تضیعِ محنت و اوقات نہیں تو کیا ہے؟ اگر بیش از قسمت اور قبل از وقت نہیں مل سکتا، اور یقیناً نہیں مل سکتا، تو بتاؤ دعا کیا کریگی

اوّل تو مَیں پُوچھتا ہوں کہ دُعا مانگنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ کیا وہ خدا جسے تم ارحم الرّاحمین مانتے ہو اور جو اِس صفت کے ماتحت ماں سے بھی زیادہ رحمدل ہے، اپنے بیکس بچوں کی ضروریات کو اُن کے گڑگڑاتے بغیر پُورا نہیں کر سکتا؟ کیا وہ اِس بات کا شائق ہے کہ مصیبت زدہ انسان پہلے اُس کی حمد و ثنا کرے، پھر روئے اور اُسے پُکارے اور اس کے بعد اُس کا مُدّعا پُورا کیا جائے؟ یہ تو خوشامد و تملّق پسندی کی وہی صفات ہیں جو ایک معمولی انسان میں پائی جاتی ہیں"۔

جوشِ تقریر سے سہیل کی آنکھیں سُرخ ہو گئی تھیں۔ اُس کے خیالات میں حیرت انگیز انقلاب ہوا تھا۔ اس سے پہلے کبھی اُس کی زبان سے ایسے الفاظ نہ نکلے تھے اور مَیں حیران تھا کہ یہ کایا پلٹ کب اور کیونکر ہُوئی۔ بات یہ ہے کہ مایوسی ایمان و اعتقاد کو ملیامیٹ کر دیتی ہے سہیل جب تمام دُنیاوی اسباب استعمال کر بیٹھا اور کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ تو اُس کا حزن و ملال یاس و قنوط کی صورت اختیار کر گیا۔ چند دن کے بعد اُس کی ہمشیرہ کا انتقال ہو گیا۔ مگر اُس کے چہرے پر غم کا کوئی نشان اور پریشانی کی کوئی علامت نہ تھی۔ تجہیز و تکفین کا انتظام اُس نے نہایت اطمینان سے کیا۔ اُس کی آنکھوں کی چمک، اُس کے ہونٹوں کی مضبوط پیوستگی اس بات کا پتہ دیتی تھی کہ یہ حادثہ اس کی توقع کے خلاف نہ تھا۔ بلکہ وہ اپنے

دل میں کسی مستقل ارادے کو جگہ دے رہا ہے۔ کئی دن بعد وہ مجھ سے ملا۔
اور جب میں نے دوسری مرتبہ اظہار افسوس کیا تو بہت بے پروائی سے
ٹال کر کہنے لگا۔ ” زاہدوں اور صوفیوں نے دُنیا کو دارالمحن کہا ہے۔ میں
سمجھتا ہوں کہ اُن کی یہ رائے صحیح ہے۔ زندگی نام ہے ان گنت تکلیفوں
کے ایک مجموعے کا، جس کا شیرازہ صرف موت ہی بکھیر سکتی ہے جیتے جی
نہ کسی کو آرام و اطمینان حاصل ہوا اور نہ ہوگا۔ میں نے اپنے وقت کا
بہت سا حصّہ یہ معلوم کرنے پر صرف کیا کہ انسان کی تخلیق سے قدرت
کو کیا مقصود تھا۔ میری کوششیں رائگاں جاتی معلوم ہوتی تھیں اور
میں یہ سمجھنے سے معذور تھا کہ آخر ہمیں اس آزمائش میں مبتلا کرنے کی
وجہ کیا ہے۔ میں حیران تھا کہ وہ مدبّر بالا رادہ ہستی جو ہم پر حکمران ہے
ہم سے کس چیز کی طلبگار ہے۔ دُنیا میں اس قدر تضاد و تفاوت ہے
کہ میں معلوم نہ کر سکتا تھا کہ وہ کونسا فرض ہے جو ہم سب انسان ہونے
کی حالت میں یکساں حیثیت سے ادا کر رہے ہیں۔ آخر میں نے
دریافت کر لیا اور خوب دریافت کیا۔ ذرا غور سے سُنو۔ ہم سب
ایک جدّوجہد میں مصروف ہیں۔ بادشاہ بھی اور فقیر بھی، امیر
بھی اور غریب بھی۔ اس جدّوجہد کو جاری رکھنے کے طریقے مختلف
ہیں۔ مگر مقصد جس تک ہم پہنچنا چاہتے ہیں ایک ہی ہے۔ کیا وہ مقصد

قابلِ حصول ہے ؟ اس کے متعلق مَیں صرف اتنا کہوں گا کہ ہم ایک سراب کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ ہمارا ہر قدم جسے ہم بزعمِ خود منزل کی طرف بڑھا رہے ہیں ہمیں منزل سے دُور لئے جاتا ہے۔ اطمینان و راحت ہمارا مطمحِ نظر ہے۔ مگر مجھے بتاؤ کہ اس بالا از شمار آبادی میں کتنے افراد ہیں جو اس نعمت کے مالک اور اس دولت سے مالا مال ہیں ؟ ہر طرف سے کراہنے کی آوازیں آتی ہیں۔ ہر شخص قسمت کا شاکی ہے۔ دُکھ اور مصیبت ہی ہماری زندگیوں میں ایک جزوِ مشترک ہے۔ "دُنیا میں کوئی مطمئن و مسرور نہیں" یہ زندگی کے مسلّمات میں سے ہے۔ اور شاید خدا نے انسان کو پیدا ہی اس لئے کیا تھا کہ وہ چند در چند مصائب و حوادث میں سے گذرتا ہُوا قبر تک پہنچ جائے۔ اور اگر زندگی کی تعریف ایک طویل مصیبت ہے۔ تو بہتر ہے کہ ہم جلد از جلد اس مصیبت کا خاتمہ کر دیں۔"

مَیں نے گھبرا کر پوچھا۔ "اس سے تمہاری مراد ؟"

اُس نے نہایت اطمینان سے جواب دیا "خودکشی"

مَیں تڑپ کر اُٹھ کھڑا ہُوا۔ مَیں نے سہیل کے دونوں شانے تھام لئے اور اُسے جھنجوڑ کر کہا۔ "تمہارے دماغ میں خلل واقع ہو گیا

ہے۔ تم خودکشی کر سکتے تھے اگر تمہاری زندگی صرف تمہاری ذات تک محدود ہوتی۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ تمہاری زندگی کے بہت سے حصّے ہیں جن کے واحد مالک تم ہی نہیں ہو۔ انفرادی زندگی کا دُنیا میں کوئی مفہوم نہیں ہے۔ تمہاری زندگی مختلف تعلقات کے مجموعے کا نام ہے۔ وہ رشتہ جس نے تمہیں والدین سے پیوست کر رکھا ہے۔ تمہاری زندگی کا ایک جزو ہے۔ وہ تعلق جو تمہارے اور تمہارے دوستوں کے درمیان قائم ہے تمہاری زندگی کا دوسرا جزو ہے۔ اور اسی طرح وہ مختلف تعلقات جو تمہیں سماج کے مختلف شعبوں سے باندھے ہوئے ہیں مل کر تمہاری زندگی کہلاتے ہیں۔ اب بتاؤ کہ تم اکیلے ان رسیوں کو توڑنے کے کس طرح مجاز ہو سکتے ہو؟ اور تمہارا یہ خیال کس قدر غلط ہے کہ دُنیا میں تکلیف ہی تکلیف ہے۔ مَیں تمہیں بتاتا ہوں کہ دُنیا کچھ بھی نہیں صرف اپنے خیال کا پرتو ہے۔ اگر آج تم میرے کہنے سے اس نظریے کو بدل دو تو کل ہی تمہیں یہ دارالمحن لہلہاتا ہوا گلشن نظر آئے گا۔"

دن گذرتے گئے۔ ہفتے گذر گئے۔ سہیل اور مَیں آپس میں ملتے رہتے نہ اُس نے پھر وہ مسئلہ چھیڑا اور نہ مجھے لب کشائی کی جرأت ہوئی۔

مگر اُس کی ہیئت مجموعی سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کسی خاص نتیجے پر پہنچ چکا ہے۔ سہیل کے والد سلمیٰ کے انتقال کے بعد ابھی تک لاہور میں مقیم تھے اور سہیل ہوسٹل چھوڑ کر عارضی طور پر اُن کے پاس چلا گیا تھا۔ ایک صبح مَیں کالج جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ ہوسٹل میں کہرام مچ گیا۔ مَیں کمرے کا دروازہ کھول کر جھٹ باہر آیا تو ایک لڑکے نے مجھ سے کہا:- "آپ نے کچھ سُنا؟"

مَیں نے گھبرا کر کہا "کیا؟"

"سہیل مر گیا"

میرے دماغ پر گویا بجلی گر گئی۔ مَیں کتابیں پھینک بے تحاشا اُس کے مکان کی طرف بھاگا۔ دیکھا کہ اُس کے والد بے جان بُت کی طرح ہاتھوں سے سر کو دبائے بیٹھے ہیں اور احاطے میں خلقت کا ایک بڑا ہجوم ہے۔ لوگ کہہ رہے تھے:- "بہن کی موت اُسے مار گئی۔ دونوں میں بہت محبّت تھی۔ اصل میں وہ غم سے مر گیا۔"

مَیں نے ایک بزرگ صورت انسان سے پوچھا۔ "کیوں صاحب، یہ حادثہ کیونکر ہوا۔"

اُنہوں نے جواب دیا۔ "بات یہ ہے۔ تھوڑا ہی عرصہ ہوا ان کی بہن کا انتقال ہو گیا تھا۔ اُنہوں نے بہت زیادہ غم کیا۔ ہر وقت مغموم و

پریشان رہتے تھے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ آج حرکت قلب کے یکلخت بند ہو جانے سے یہ بھی چل بسے۔"

"حرکتِ قلب بند ہو جانے سے۔" مَیں نے دو تین مرتبہ اس کو دل میں دُہرایا۔ کیا لوگوں کا بیان صحیح تھا۔ کیا سہیل واقعی طبعی موت مرا؟ میرے دل میں شکوک و شبہات موجزن ہونا شروع ہو گئے۔ میرے دماغ میں سہیل کی گفتگو نقش ہو چکی تھی۔ اُس کے الفاظ کہ "اگر زندگی کی تعریف ایک مصیبت ہے تو بہتر ہے کہ ہم جلد از جلد اس مصیبت کا خاتمہ کر دیں۔" میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ لوگوں کو کیا معلوم کہ وہ اپنی موت کا سامان پہلے سے مہیّا کر چکا تھا اور زندگی کا خاتمہ خود اُس نے اپنے ہاتھوں کیا۔

افسوس ہے کہ سہیل عملی دُنیا میں داخل ہونے سے پہلے ہی چل بسا۔ شروع سے آخر تک تصویر کا سیاہ رُخ اُس کے سامنے رہا۔ وہ دُنیا کو مصائب کا گہوارہ سمجھے ہوئے تھا اور اپنے تخیّل سے اُس نے زندگی کو اس قدر ہیبت ناک بنا لیا تھا کہ اُس سے چھٹکارا حاصل کر لینا ہی اُس کے لئے بہتر ثابت ہوا۔ اگر وہ کچھ دن اور اسی دماغی ابتلا میں گرفتار رہتا تو شاید بالکل دیوانہ ہو جاتا۔ وہ خیالِ جس کا پشتیبان عمل نہ ہو، انسانی زندگی کے لئے کبھی مفید ثابت نہیں ہوا۔ سہیل کے دل و دماغ

پر خیال ہی خیال مستولی تھا اور خیال بھی وہ جس نے اُس کی قوّتِ عمل بالکل سلب کر لی تھی۔ کاش وہ عمل کی طرف آتا اور اُسے معلوم ہوتا کہ حادثات کو صبر اور استقلال سے برداشت کرنے میں کیسی لذّت ہے۔ اپنے فرائض کو دیانتداری سے سرانجام دینے میں کیسی روحانی مسرّت ملتی ہے۔ دُکھ اور تکلیف کے بعد آرام حاصل کرنا رُوح کو کس طرح شاد کرتا ہے اور سب سے بڑھ کر اُمید پر زندگی گزارنا قوائے ذہنی و جسمانی کو کیونکر زندہ رکھتا ہے۔

ایک خط[ل]

پیارے سلامت! کتنے ہفتوں کی پیوستہ تنہائی، مسلسل عزلت اور متصل گوشہ نشینی کے بعد میں کل شام اپنے کلبۂ احزاں سے، جو ضیائے مسرت و ضیائے آفتاب دونوں سے محروم ہے، نکلا۔ میں نہیں کہہ سکتا میرے پیشِ نظر کوئی خاص مقام تھا یا نہیں بہرحال گذشتہ سولہ سال سے اسی خطے کی خاک چھان رہا ہوں اس لئے پاؤں خود بخود ایک راہ پر چلنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ میں اُس سڑک پر جا رہا تھا۔ جس کو ہم بیڈن روڈ کہا کرتے تھے۔ اور جسے اب میونسپل کمیٹی کے تصرفات نے دل محمد روڈ کا نام دے رکھا ہے۔ دماغ ہمیشہ کی طرح اُس

ل یہ خط ایک سراسر خانگی مکتوب کی حیثیت سے صدیقِ محترم سید سلامت اللہ بی اے کے نام لکھا گیا تھا لیکن سیّد صاحب نے اسے ہمایوں میں شائع کرا دیا۔ لہٰذا اب مطبوعہ مضامین کے سلسلہ میں اس کو بھی اس مجموعہ میں جگہ دی جا رہی ہے۔ "ع"

وقت بھی شگفتگی سے معرّا تھا۔ مَیں نے دیکھا کہ مزدوروں کا ایک جمِ غفیر کدالوں، بیلچوں اور پھاوڑوں سے مسلّح ایک مکان کو گرا رہا ہے۔ غور کیا تو معلوم ہوا کہ جو مکان گرایا جا رہا ہے وہ "یادش بخیر، النّجد" ہے۔ ع

سَلَامٌ عَلیٰ نَجْدٍ وَمَنْ حَلَّ بالنَّجْدِ

آہ، کچھ نہ پوچھو کہ اس منظر کو دیکھ کر دلِ حزیں کی کیا کیفیّت ہوئی۔ دل جو حوادثِ روزگار سے پہلے ہی چھلنی ہو چکا ہے۔ اس نظّارے کی تاب نہ لا سکا اور مَیں قدموں میں سرعت پیدا کر کے آگے نکل گیا۔ لیکن تمام راہ یاس و حرماں، کرب و اضطراب اور رنج و الم کے سیاہ بادل قلب و دماغ پر چھاتے رہے۔ اگرچہ عرصۂ دراز سے النّجد بیکانیری مزدوروں، چماروں اور دھوبیوں کا مسکن بن رہا تھا۔ لیکن اس کس مپرسی کے عالم میں بھی وہ اُن روایات کا حامل، اُن داستانوں کا مرکز اور اُن ہنگاموں کا خزینہ تھا جن کی یاد لاہور کی اہلِ دل آبادی کے ایک قابلِ قدر حصّے کا سرمایۂ نشاط و متاعِ حیات ہے۔ میرے دل کی بُجھی ہوئی چنگاریاں پھر چمک اُٹھی تھیں۔ ماضی کے بھولے بسرے خواب مجسّم صورت اختیار کر کے پھر میرے سامنے آ گئے تھے اور رُوح کے خوابیدہ نغمے پھر بیدار ہو گئے تھے۔ مَیں نے سوچا کہ سرمایہ داری اس مکان کو گرا کر اس کی بنیادوں پر ایک عظیم الشان و سربفلک عمارت تعمیر کرے گی۔ جس کے طفیل اُسے

ہر ماہ سیم وزر کا ایک انبار ملا کریگا۔ لاہور کی آنے والی نسلیں، نہیں نہیں موجودہ نسلیں بھی، کہ آج کون ایسا دیوانہ ہے جو تاج محل کو دیکھ کر ایک غریب کے جھونپڑے کو تصوّر میں لانا پسند کرے گا، بھول جائینگی کہ یہاں ایک ایسی چار دیواری بھی تھی جہاں اس زمانے میں، جبکہ تمدنِ جدید کی برکات پانی کی طرح عام ہو رہی ہیں، بجلی کی روشنی نہ تھی۔ جہاں چند دیوانے علی الرغم مصائبِ حیات اکٹھے ہو کر زندگی کی الجھنوں کو مسرت وشادمانی کے قہقہوں میں فنا کر ڈالتے تھے۔ جس کی کشش کا یہ عالم تھا کہ بٹالہ، سرگودھا، گوجرانوالہ، پسرور، شاہجہان پور اور خدا جانے کہاں کہاں کے افراد کھنچے چلے آتے تھے۔ جس کی مٹی کو یہ تاثیر میسّر تھی کہ خاک کو سونا بنا دیتی تھی۔

الغرض چشمِ ظاہر بیں کے لئے مٹ گیا۔ لیکن اب بھی ایک جماعت ایسی ہے جس کے لئے زمین کا یہ ٹکڑا ہمیشہ مقدس ومعزز رہے گا۔ یہ مقام مذہب عشق کے پیرووں کا کعبہ بنے گا جہاں سال کے کسی حصّے میں ہندوستان کے دُور دراز خطّوں سے "یارانِ طریقت" حصول خیر وسعادت کے لئے پہنچا کریں گے۔ یہ زیارت گاہِ عاشقاں وسجدہ گاہِ دلفروشاں ہے۔ یہ وہ مقام ہے جس کی فضا اب بھی سرمستیوں سے معمور اور نشاط افروزیوں سے مخمور ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جس کی ایک ایک

اینٹ میں عشق کا سوز اور محبت کی بیکسی رچی ہُوئی ہے یہ وہ عمارت ہے جس کے در و دیوار میں ہماری آنکھیں لگی ہُوئی ہیں۔ یہ وہ خطّہ ہے جس نے سوز و سازِ حیات کے ایسے عدیم النظیر منظر دیکھے ہیں کہ نادرِ گیتی ہزاروں کروٹیں بدل لینے پر بھی ان کی مثال پیدا نہیں کر سکتی۔ آہ یہ وہ مکان ہے جس کے ایک مختصر سے کمرے میں عاشقِ مجسم عجز و فتادگی بن کر رئیس المتغزلین حسرتؔ موہانی کے نغماتِ محبّت گایا کرتا تھا جس میں سلامت کبھی رندِ لااُبالی بن کر حافظ کی غزلیات پڑھتا اور کبھی صوفیِ پاکباز بن کر فرقانِ حمید کی مقدس آیات کی تلاوت کرتا تھا۔ آہ یہ وہ مقام ہے جہاں رشیدؔ نے نفس کو اور ساتھ ہی دُنیا کو فریب دینے کے لئے فلک شگاف قہقہے لگائے ہیں جہاں آغا عبدالرحیم نے "سلسلہ" کی دلچسپ رٹ لگا کر تمسخر و استہزاء کا سامان بہم پہنچایا ہے۔ جہاں رؤفؔ نے فلسفۂ حیات سے ناواقف ہونے کے باوجود حقائقِ حیات پر بصیرت افروز تقریریں کی ہیں۔ جہاں عظیمؔ جیسے محرمِ جذباتِ لطیفۂ انسانی نے قیس و فرہاد کی پیروی کے عہد باندھے ہیں۔ اور جہاں اُس طُرفہ تماشا شخص اقبالؔ نے اپنی عبوست و فرسودگی کے باوجود احباب کی بے پناہ یورش سے مجبور ہو کر ہنگامہ آرائی کی ہے۔ آہ یہ وہ مکان ہے جہاں ہر نشست میں مصائبِ حیات کا رونا رویا جاتا تھا۔ جہاں ہر مجلس میں

دادِ عشرت دینے کے باوجود زندگی کی تکالیف پر نوحہ خوانی کی جاتی تھی حقیقت یہ ہے کہ ؎

وہاں سے نکل کے پھر نہ فراغت ہوئی نصیب
آسودگی کی جان تری انجمن میں تھی

سعدی شیرازی نے انہدامِ بغداد پر مرثیہ لکھا۔ دولتِ غرناطہ کی تباہی پر ابنِ بدروں نے نوحہ خوانی کی۔ دہلی کے اُجڑ جانے پر داغ نے خون کے آنسو بہائے۔ اقبال نے دورانِ سفر میں سسلی کو دیکھ کر چیخیں ماریں۔ لیکن النجد، آہ النجد کی بربادی پر میرے مجروح و درماندہ قلم کو خونچکانی کرنی پڑی ؎

مرثیہ تیری تباہی کا مری قسمت میں تھا
یہ تڑپنا اور تڑپانا مری قسمت میں تھا

گذری ہوئی صحبتوں کی یاد تازہ کرنے کے لئے گوالمنڈی کا نمبر ۳۵ ابھی موجود ہے۔ یوننگ ہال کا کمرہ نمبر ۱۰ ابھی باقی ہے۔ مکلوڈ روڈ پر نیلام گھر کی عمارت بھی کھڑی ہے۔ گویا ع

عالم میں ٹکڑے ٹکڑے مری داستاں کے ہیں

مگر النجد کو جو خصوصیت حاصل تھی وہ اُسی کا حصہ تھی۔ کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ "یارانِ طریقت" کا انتشار و افتراق ختم ہو۔ کیا ابھی آسمان

کے ترکش میں کوئی تیر باقی ہے جس کی پذیرائی کے لئے ہمیں دل وجگر پیش کرنا پڑیں۔ کیا النجد کا انہدام ایسا واقعہ نہیں کہ "یارانِ طریقت" ایک مرتبہ ہی سہی، باہم مل کر دل کے پھپھولے پھوڑ لیں؟ اگر اس حادثہ فاجعہ سے بھی ہمارے سکوت بے جا میں کوئی تحرک پیدا نہ ہوا تو ہمیں آج ہی اپنی فاتحہ پڑھ لینی چاہیئے۔ کیونکہ دانا وہی ہے جو ہوا کا رُخ پہچانے۔

تبدیلِ نظریہ

حامد، عزیز، احسن، یوں تو سبھی نئی روشنی کے تعلیم یافتہ لطیف الخیال اور باذاق نوجوان تھے مگر اسحاق اپنے مزاج کی غیر معمولی شعریّت کے باعث احباب کے مجمع میں ایک نمایاں خصوصیّت کا مالک تھا۔ اُس کی زندگی کا جذباتی پہلو اس قدر روشن اور واضح تھا کہ دوسری تمام خصوصیات اُس میں مدغم ہو کر رہ گئی تھیں۔ اُس کی خوابگوں آنکھوں کی متصوّفانہ کیفیّت، اُس کے چہرے کی بشاشت اور اُس کے لبوں کا دائمی تبسّم اُس کے جذباتِ رقیق کے صحیح مظہر تھے۔ یُوں تو ہر حسین چیز کو دیکھ کر وہ پھڑک اُٹھتا تھا۔ مگر اُس کے خیالات کا سیلاب اور اُس کے ہیجان و اضطراب کا جوش اُس وقت قابلِ ملاحظہ ہوتا تھا جب اُس کا موضوعِ کلام نسائیت ہو۔ وہ کہتا تھا " حُسن جہاں بھی ہو اور جس رنگ میں ہو دلکش ہے۔"

اگر تاج محل کی حسین نقاشی اور رنگین سنگ تراشی اُسے بیخود

سرشار بنا دیتی تھی تو قطب الدین ایبک کے عبرت آموز مزار کی کس مپرسی و شکستہ حالی بھی اُس کے جذبات میں ایک طوفان بپا کر کے اُس کی آنکھوں کو پُر نم کر سکتی تھی۔ اب وہ یکسر سوز و گداز ہوتا اور بار بار کہتا۔ "یہاں حُسن سوگوار ہے اور وہاں محوِ آرائش"۔ وجدان اس کے نزدیک آرٹ یا پھر اُسی کے الفاظ میں حسن کی غایت تھی کیونکہ وہ آرٹ کو حسن سے کوئی علیحدہ چیز نہ سمجھتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ صنّاع کا کام حسن کی تخلیق ہے اور اس تعریف کے ماتحت وہ اپنے آپکو نصف صنّاع سمجھتا تھا۔ کیونکہ وہ حسن کا خالق نہ تھا صرف پرستار تھا۔ مَیں نہیں کہہ سکتا کہ یہ اُس کی طبیعت کا فطری رنگ تھا یا اکتسابی مگر کچھ بھی ہو اُس کا زاویۂ نگاہ ہم سے بالکل مختلف تھا۔ وہ صرف خوش رہنا چاہتا تھا اور حسن کا مشاہدہ اُس کے نزدیک حصول مسرت کا بہترین ذریعہ تھا۔ اُسے اپنے ارادے پر کامل اختیار تھا اور پیہم کوشش سے اب یہ بات اُس کے مزاج میں داخل ہو گئی تھی۔ کہ وہ ہمیشہ دُنیا کے روشن پہلو پر نظر رکھتا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا اور نہ جاننا چاہتا تھا کہ زندگی کا کوئی تاریک رُخ بھی ہے۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ میں اور وہ ریل کے سفر میں ہمراہ تھے۔ برسات کا موسم تھا اور وہ اپنے مخصوص انداز میں برسات کی دلفریبیوں، اور اُن اُمنگوں پر جو ایک حسّاس طبیعت کے اندر اس موسم میں پیدا ہوتی ہیں تقریر کر رہا تھا۔ جب وہ خاموش ہو گیا،

تو مَیں نے کہا۔ "تم کہتے تو بالکل درست ہو۔ جب کبھی کوئی حسین صورت دیکھنے میں آتی ہے تو دل و دماغ پر ایسا سرور طاری ہو جاتا ہے کہ کچھ عرصے کے لئے ہم محسوس کرتے ہیں گویا رُوح ایک بھاری بوجھ سے آزاد ہو گئی ہے۔"

اُس نے میری طرف گھورتے ہوئے جواب دیا۔ "یاد رکھو، یہ بھی ایک کمزوری ہے۔ کیوں نہیں تم اُس سرور کو دائمی اور رُوح کی اُس مسرّت کو غیر فانی بنا لیتے؟"

مَیں نے بیتابی سے پوچھا "کیونکر؟"

"کیونکر؟" اُس نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "یہ تو معمولی بات ہے۔ تمہارا یہ خیال تو صحیح ہے کہ حُسن کا مشاہدہ طبیعت میں مسرّت اور رُوح میں نزہت پیدا کرتا ہے اور اگر تم واقعی چاہتے ہو کہ وہ نزہت و مسرّت ہمیشہ برقرار رہے تو اُس کا بہترین طریق یہ ہے کہ ہر وقت حُسن کو اپنے پیشِ نظر رکھو۔"

مَیں نے کچھ مایوسانہ انداز میں جواب دیا۔ "بہت مشکل کسی حسین صورت سے دوچار ہونا تو اتفاق کی بات ہے۔ ورنہ تمام دن اندر کے اکھاڑے کی سیر کسے نصیب ہوتی ہے؟"

"آہ یہی تو مصیبت ہے کہ تم لوگ عمداً خوشی کو ضائع کر دیتے ہو۔

دُنیا ایک نگار خانہ ہے جس کا ہر نقش اپنے اندر کچھ نہ کچھ حُسن رکھتا ہے۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ دیدۂ دل وا کرے کوئی سطحی نگاہ رکھنے والے شخص کو چیزیں بدصورت اور ڈراؤنی بھی نظر آتی ہوں گی مگر کیسا خوش نصیب ہے وہ انسان جو ہر شے کو حسین دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اس میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ دُنیا میں ہر شخص واقعاتِ عالم اور اپنے گرد و پیش کی چیزوں کو ایک خاص عینک سے دیکھنے کا عادی ہے۔ بعض کے شیشے رنگ دار اور بعض کے شیشے سفید ہیں ہر چیز دیکھنے والے کی عینک کے رنگ میں رنگی جاتی ہے اور وہ نادان سمجھتا ہے کہ اُسے چیز اپنی اصلی صورت میں نظر آ رہی ہے۔ اگر حبشی آئینے میں اپنی بدزیب اور بھونڈی صورت دیکھ کر آئینے کو مطعون کرتا ہے تو اس میں آئینے کا کیا قصور؟ میری بات مانو۔ اگر واقعی خوش رہنا چاہتے ہو تو ہر چیز میں حُسن پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ آج سے کئی سال قبل اسی نکتہ کو ہندوستان کا فطرت شناس شاعر کس انداز سے بیان کر گیا ہے

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالبؔ
چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

دیکھو وہ گل و گلزار کی رعنائی کو بھی تمہارے ذوقِ تماشا کا

محتاج سمجھتا ہے۔ اور یہی مسرور و شادماں زندگی کا راز ہے۔"

اسحاق کا نقطہ نگاہ غلط تھا یا صحیح اس سے بحث نہیں۔ مگر یہ ضرور ہے کہ وہ خود اس پر عمل پیرا تھا۔ نظرِ اول میں تو یہ خیال مجذوب کی بڑ سے زیادہ معلوم نہیں ہوتا۔ مگر اسحاق کی ذات ایک بیّن ثبوت تھی اس بات کا کہ یہ ایک اصول ہے جس پر کاربند ہونا ممکن ہے۔

علم و ذہانت کے اعتبار سے بھی اسحاق ہماری بزم کا ممتاز فرد تھا۔ اگرچہ انکسار سے وہ اپنے آپ کو نصف صنّاع کہتا تھا۔ مگر میں جانتا ہوں کہ اس میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو کسی صنعت کو کامیاب بنانے میں معاون ہو سکتی ہیں۔ وہ ادیب تھا، شاعر تھا اور خوش گفتار تھا۔ اُس نے گفتگو کرنے کے فن میں نہایت محنت سے کمال حاصل کیا تھا۔ باتیں کرتے وقت وہ پُر شکوہ الفاظ اور شاندار اندازِ بیان سے بہت جلد مخاطب پر چھا جاتا تھا۔ ہماری بزم میں جب کسی مسئلہ کے تصفیہ میں آرا مختلف ہوتیں اور انفرادی رائے کی قربانی بھی گوارا نہ کی جا سکتی۔ تو اسحاق اپنی جادو بھری تقریر سے سب کو مبہوت کر کے اپنا مقصد حاصل کر لیتا تھا اور لطف یہ ہے کہ کسی کو شکایت کا موقع بھی نہ رہتا تھا۔

برسات کی بھیگی ہوئی ہوا اور ابر آلود فضا، بہار کی ولولہ انگیز

صبح اور خمار آفریں شام، خزاں کی حسرت ناک اور سنسان خاموشی، غرض قدرت کا ہر منظر اور فطرت کا ہر پہلو اسحاق کے لئے بے شمار دلآویز مرقع تھا۔ اُس کی آنکھیں ہر مقام پر حُسن وجمال کی تلاش میں مصروف ہوتی تھیں۔ دیہات کی سادہ اور چپ چاپ زندگی میں، ندی کی خاموش روانی کے دھیمے سروں کے ساتھ یا مکّی کے ہرے بھرے لہلہاتے کھیتوں کے درمیان اگر وہ فطرت کی معصومیت سے متاثّر ہو کر نہایت پاکیزہ نظمیں لکھ سکتا تھا۔ تو ریلوے اسٹیشن کے پُر شور ہجوم یا غروبِ آفتاب کے بعد انار کلی بازار کے دھکّم دھکّے میں وہ اکثر اپنے افسانوں کے کردار تلاش کرنے کے لئے نکل جاتا تھا۔ ملک کے ادبی رسائل میں آئے دن اُس کے مضامین شائع ہوتے رہتے تھے۔ مگر جیسا میں نے پہلے کہا ہے وہ اپنے الفاظ کا بہترین ذخیرہ اور زورِ قلم اُس وقت کے لئے اُٹھا رکھتا تھا۔ جب اُس کا موضوع نسائیت ہو۔ عورت اُس کے نزدیک حُسن کا ارتقائی مظہر تھی۔ اور وہ کہتا تھا کہ قدرت کی بہترین صنعت عورت ہی ہے۔ جس کی تخلیق کے بعد اب صانع خود اپنے فن کا اس سے خوبصورت نمونہ پیش نہیں کر سکتا۔

یوں تو کائنات کا ذرّہ ذرّہ اور زندگی کا ہر شعبہ اُسے بیتاب کرنے کے لئے اپنے اندر کچھ نہ کچھ حُسن رکھتا تھا۔ مگر اُس کے کلام کی

گُل افشانی اور اُس کے خیال کی نُدرت اُس وقت دیکھنے کے قابل ہوتی تھی جب وہ "نسائیات" پر گفتگو کر رہا ہو۔ معلوم ہوتا تھا کہ اُس کا سینہ تلاطمِ جذبات سے پھٹا جاتا ہے اور وہ اُن خیالات کو جو اُس کے اندر سما نہیں سکتے تھے۔ ہمارے سامنے بیک وقت نکال کر رکھ دینا چاہتا ہے۔ اپنے گردوپیش سے بے خبر، خدا جانے وہ کیا کچھ کہہ جاتا تھا۔ اس قسم کی جذبات سے مرصّع تقریروں سے ہمیں مرعوب و متاثر کر لینا تو اُس کے لئے آسان تھا مگر متاہل احباب اُس کی ان حرکات پر ہمیشہ ہنستے اور اُس کے تمام جوش وخروش کو جنون سے تعبیر کرتے تھے۔ ایک روز مسعود نے تنگ آکر ٹوک دیا۔ "اسحاق رہنے بھی دو اپنے اس فلسفے کو۔ ہم خوب سمجھتے ہیں۔ اگر تم پرستارِ نسائیت ہو تو تمہیں مبارک ہو۔ یہ پرستارانہ فداکاری یا فداکارانہ پرستاری اُسی وقت تک قائم ہے جب تک تم تجرد کی فارغ البالی سے لطف اندوز ہو۔ بیسویں صدی کا ہر نوجوان تمہاری طرح ایامِ شباب میں رنگا رنگ دلفریبیوں سے مسحور ہو کر عورت کو پھول، موسیقی اور خوشبو کا مرکب ہی سمجھا کرتا ہے۔ مگر صبر کرو۔ ہم دیکھیں گے کہ چند سال کے بعد تمہارا نظریہ کیسے قائم رہتا ہے۔ ہمارے محدود تمدن میں اتنی گنجائش تو ہے نہیں کہ ہماری شاعرانہ بلند پروازیاں حدِ تکمیل تک پہنچ سکیں یا ہماری جوانی

کے مجبوب و مرغوب خواب بر روئے کار آجائیں۔ اس لئے مجبوراً ہم اُس شعریت کو جو دراصل ہماری ہی طبائع کا جزو ہے جنس مقابل میں منعکس دیکھتے اور نادانی سے سمجھتے ہیں کہ عورت سراسر شعریت اور سراپا لطافت ہے۔"

یہ سُن کر اسحاق طیش میں آگیا اور کہنے لگا "اگر تمہاری کم نظری اور کوتاہ اندیشی نے ہمارا تمدن محدود اور ہماری معاشرت خراب کر دی ہے تو اس میں قصور کس کا ہے؟ اگر تمہاری بے حسی اور خود غرضی نے عورت کے حقوق ملیامیٹ کر کے اُسے معاشرت میں کوئی بلند مقام نہیں دیا۔ تو اس کے لئے تم قابلِ ملامت ہو نہ کہ وہ معصوم ہستی جو ہر بار تمہاری بہیمیت کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ ابتدا سے لے کر آج تک تم جیسے لوگوں کی جنہوں نے عورت کو ہمیشہ ذلیل و خوار کیا اور اُسے اپنا آلۂ کار بنائے رکھا کمی نہیں رہی۔ مگر یاد رہے کہ دنیا بدل چکی ہے۔ تمہارے خیال کے لوگوں کا دائرہ بہت تنگ ہو رہا ہے۔ عورت کے احسانات کے شکریے سے تم کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے اور یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو چکی ہے کہ دُنیا کا بہترین سرمایہ اور مرد کا نصف بہتر عورت ہے۔ اگر شادی کے بعد عورت کی شعریت اور عظمت تمہاری نظروں میں گر جاتی ہے تو اُس کا الزام تمہاری رسوم اور تمہارے اخلاق پر عائد

ہوتا ہے۔ اپنے آرام و مسرت کے لئے تو تم ساتویں آسمان تک پہنچ جاؤ مگر جہاں اُس ذات کا سوال آجائے جو تمہارے غم و الم میں شریک، تمہاری عزّت و ناموس کی محافظ، تمہاری بے دام غلام ہے تو تمہاری آنکھوں میں خون اُتر آتا ہے۔ وہ خوشنما پھول جو مہکی ہوئی ہوا میں، سُورج کی جاں بخش حرارت میں اور موسم کی تازگی میں پرورش پا کر ایک عالم کو معطر کر سکتا ہے تمہارے ہاتھوں سڑی ہوئی گلیوں کے اندر آہنی دیواروں کے پیچھے، شعاعِ آفتاب اور ہوا کے جھونکے سے محروم قبل از وقت مُرجھا جاتا ہے۔ یہ انسانیّت پر ظلم نہیں تو کیا ہے؟ یاد رکھو ردِّ عمل شروع ہونے کو ہے اور اس کا سب سے پہلا وار تم ایسے لوگوں پر ہوگا۔"

ایک روز اسحاق مجھ سے ملا۔ وہ کچھ کبیدہ خاطر سا نظر آرہا تھا مَیں نے افسردگی کا سبب پوچھا تو بڑی بددلی سے بولا۔ "ہم لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ ہندوستان میں رہ کر عورت کی فطرت کو سمجھنا ایک امرِ محال ہے مَیں حیران ہوں کہ اس کم فہمی کے باوجود ہم کیونکر دھڑلے سے نسائیات پر قلم اُٹھا لیتے ہیں۔ یہ ایک شدید غلطی ہے جس کا اعادہ ہم سے ہر روز آتا ہے۔"

مَیں نے اس خیال سے کہ دیکھوں اُس کی نئی تحقیقات جن کی بناء پر یہ فیصلہ صادر کیا جا رہا ہے کیا کہتی ہیں پوچھا۔

"تم نے یہ کیسے جانا؟"

ہمارے ہاں پردے کی غیر معمولی سختی اور رسم و رواج کی پابندی کی وجہ سے انتخاب زوج کا کوئی موزوں اور مستقل طریقہ قائم نہیں کیا جا سکتا اس لئے شادی سے پہلے عورت ہمارے لئے ایک معمّہ بنی رہتی ہے۔ مَیں سمجھتا تھا کہ متاہل ہونے کے بعد عورت کی رُوحیّت و معنویت اور اُسکے مزاج کی تمام کیفیّات سے واقف ہونا آسان ہو جاتا ہو گا۔ مگر تفضّل کی شادی نے یہ خیال بھی باطل کر دیا۔ تفضّل کی شادی اس لحاظ سے بہت اہم تھی۔ کہ اُس کی بیوی خود اُس کا انتخاب تھی۔ اور شادی سے قبل وہ ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف تھے۔ طبائع بالکل یکساں ہونے کے باعث اُنہیں یہ عام دقّت بھی پیش نہیں آتی جو شادی کے بعد ایک دوسرے کے خیالات سے ناواقف ہونے کی صورت میں پیدا ہوا کرتی ہے۔ مگر مجھے تعجب ہے کہ تفضّل گذشتہ ملاقات میں مجھ سے یہی شکایت کر رہا تھا جو آج مَیں تم سے کر رہا ہوں۔ وہ کہتا تھا کہ شادی کے بعد عورت کی زندگی کا صرف ازدواجی پہلو ہم پر واضح ہو سکتا ہے۔ اور اس حالت میں بھی وُہ ہم سے بے تکلّف نہیں ہوتی۔ کیونکہ ماحول و مراسم سے متاثر ہو کر وہ ہمیشہ اپنے آپ کو ہم سے کمتر سمجھتی ہے۔ اور جب تک اختلافِ مراتب کا یہ احساس قائم ہے۔ آپس میں گھُل مل کر ایک دوسرے کی فطرت سے

کما حقہٗ، آگاہ ہو جانا ممکن نہیں۔ دوستوں کے ساتھ ہمارے تعلقات ابتدا میں معمولی رفیق ہونے کی حیثیت سے رسمی علیک سلیک تک محدود ہوتے ہیں۔ پھر روزمرّہ کی ملاقات اور تبادلۂ خیالات سے وہ تعلقات غیر شعوری طور پر بڑھتے بڑھتے دوستی کی حد تک پہنچ جاتے ہیں اور بالآخر وہ دوستی رُوح کی ایک اشتہا بن جاتی ہے جس سے علیحدگی بعض اوقات ہماری زندگی تلخ کر دیتی ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ دوستی پیدا کرنے میں فریقین کی جانب سے کبھی کوشش نہیں ہوتی۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ جب کبھی اس معاملہ میں قصد و ارادہ سے کام لیا گیا ہے، حصولِ مقصد میں ہمیشہ ناکامی کا سامنا ہوا ہے۔ جب تک معاشرت میں عورت کے لئے موزوں مقام نہیں بنایا جاتا اور جب تک ہندوستان کی فضا میں یہ خوشگوار تبدیلی نہیں ہوتی کہ عورت سے جائز دوستی، جس کا نتیجہ مناکحت نہ ہو، قائم ہو سکے عورت کی فطرت کو سمجھنا محال کیا ناممکن ہے۔ اور ایسی حالت میں کیا تم سمجھتے ہو کہ ہمارے ہاں کبھی کوئی صحیح افسانہ یا اچھی نظم لکھی جا سکتی ہے؟ مثال کے طور پر اُن قوموں کو دیکھو جن کے تمدن میں، عام مجلسوں، نمائشوں اور تفریح گاہوں میں عورت کو ایسی ہی آزادی حاصل ہے جیسی مرد کو۔ وہاں آئے دن ادب و نفسیات کے نئے نئے انکشاف ہوتے ہیں۔ وہاں بہتر سے بہتر افسانے لکھے

اور فنونِ لطیفہ کے عمدہ سے عمدہ نمونے تیار کئے جاتے ہیں۔ یہ صرف اس لئے کہ عورت مردوں کے درمیان ملی جُلی ہمیشہ اُن کی بالیدگیِ خیال کا باعث ہوتی ہے۔ ہندوستان کا نسوانی تمدّن بہت پست ہے۔ اس کو بلند کرنا مَیں نے اپنا مقصدِ حیات مقرر کر لیا ہے اور اب میری کوششیں اسی کام کے لئے وقف ہیں۔"

حالات و واقعات تبدیل ہوتے گئے اور انقلاب کے عالمگیر اصول کے ماتحت ہمارا مجمع احباب بھی منتشر ہو گیا۔ اسحاق لاہور سے کہیں باہر چلا گیا اور مدّت تک بے پتہ رہا۔ اس کے مشاغل کے متعلق بھی مجھے کچھ معلوم نہ تھا۔ ایک روز سہ پہر کے قریب میں ہواخوری کے لئے باہر نکلا تو دیکھا کہ اسحاق صاحب بڑی تیز رفتاری سے سڑک پر چلے جا رہے ہیں۔ اُس کو پہچاننے میں مجھے کچھ دیر لگی کیونکہ اُس کی بالکل قلب ماہیت ہو چکی تھی۔ اسحاق، جو اس سے قبل انگریزی فیشن کا دلدادہ اور لباس کے بہترین نمونے میں بڑی آن بان سے دیکھا جاتا تھا، اب ایک بدزیب سی شیروانی اور پاؤں میں ایک گرد آلود بُوٹ جسے کئی ہفتوں سے پالش نصیب نہ ہوا تھا۔ پہنے کسی دُھن میں محو خدا جانے کہاں جا رہا تھا۔ اُس کی ہیئت کذائی سے معلوم ہوتا

تھا کہ شاید وہ کانگرس کا رضا کار ہو گیا ہے۔ مَیں نے آواز دی اور ملتے ہی پوچھا کہ "تم کب سے یہاں ہو؟"

"مَیں پرسوں آیا تھا۔"

"تو پھر ملے کیوں نہیں؟"

"یُونہی کچھ مصروفیّت رہی۔ وقت نہیں مل سکا۔"

وہ کچھ رسمی سا جواب دے کر ٹال دینا چاہتا تھا۔ مَیں نے پھر پوچھا۔ "اب کہاں جا رہے ہو؟"

"ذرا لارنس باغ کی طرف ٹہلنے نکلا تھا۔"

مَیں بھی ساتھ ہو لیا اور اِدھر اُدھر کی باتوں میں ہم باغ پہنچ گئے۔ بنچ پر بیٹھتے ہی مَیں نے پھر سلسلۂ سوالات شروع کر دیا۔

"تم اتنا عرصہ کہاں رہے؟ تم نے خط بھی کوئی نہیں لکھا۔"

اسحاق۔ "مَیں ایک جگہ نہیں ٹھیرا بلکہ بہت سے مقامات پر پھرتا رہا ہوں۔"

مَیں۔ "لیکن تم نے یہ حالت کیا بنا رکھی ہے۔ تم کچھ کھوئے کھوئے سے معلوم ہوتے ہو۔"

اسحاق۔ "ہاں صحیح ہے، لیکن یہ ایک لمبی واردات ہے جسے شاید تم سُننا پسند نہ کرو۔"

مَیں۔ ”نہیں، مَیں ہمہ تن اشتیاق ہوں۔ تم بیان کرو۔“

اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولنا شروع کیا۔ ”دُنیا میں عموماً واقعات خلافِ توقع پیش آتے رہتے ہیں ہم سمجھتے کچھ ہیں مگر پردۂ غیب سے کچھ اور ہی ظہور پذیر ہوتا ہے۔ ایسی مایوسیاں کچھ وقت کے لئے ہماری پریشانی کا باعث تو ضرور ہوتی ہیں۔ مگر اندازہ کرو اُس ناکامی کا جو ہمیں ایسی مہم میں پیش آتی ہے۔ جس کی تیاری پر ہم اپنا تمام سرمایۂ حیات خرچ کر چکے ہیں۔ جس کی کامیابی و ناکامی پر ہماری زندگی اور موت کا انحصار ہے۔“

اسحاق خاموش ہو گیا۔ مگر مَیں نے بے صبری سے کہا۔ ”ہاں آگے چلو۔“

اُس نے ایک دل شکستہ آواز میں کہا۔ ”بس ایسی ہی ایک ناکامی سے مَیں دوچار ہوا ہوں۔ اس سے زیادہ اور کیا سُننا چاہتے ہو؟“

مَیں نے پھر اصرار کیا۔ ”نہیں، مجھے تفصیل درکار ہے۔“

”اچھّا تفصیل ہی سہی۔ یوں تو ہر چیز، جس کا تعلق اِس سفلی طبقے سے ہے اپنی مقررہ میعادِ حیات کے بعد فنا ہو جاتی ہے حتیٰ کہ انسانی خیالات اور اصولوں کی زندگی کی بھی ابتدا و انتہا ہے مگر رُوح کی موت سب سے زیادہ عبرت ناک ہے۔ تمہیں یاد ہو گا

ایک مرتبہ میں نے اپنی زندگی کا یہ نصب العین قرار دیا تھا کہ ہندوستان کے نسوانی تمدّن کو بلند کیا جائے۔ یہ خیال جنون کی طرح مجھ پر قابو پا کر میری رُوح کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو گیا اور عرصے تک جگ ہنسائی کے باوجود میں انتہائی کوشش کے ساتھ اُس پر عمل بھی کرتا رہا۔ مگر افسوس یہ کچّے دھاگے سے زیادہ کمزور و ناپائدار ثابت ہوا۔ میں ایک سراب کے پیچھے بھاگ رہا تھا اور اب حواس باختہ، تشنہ کام، لق و دق صحرا کے قلب میں کھڑا ہوں مگر پانی کا کہیں بھی نام و نشان نہیں۔ تفضّل کی شادی کو ایک قابلِ تقلید نمونہ خیال کر کے میں ہمیشہ احباب میں اُس کا تذکرہ کیا کرتا تھا۔ طرزِ انتخاب کی دقّتوں کے باوجود اُس نے اپنی پسند کی بیوی تلاش کر لی تھی۔ شاید تمہیں معلوم نہ ہو مگر یہ بتانا میرا فرض ہے کہ تفضّل اب ہمیشہ کے لئے دُنیا سے رخصت ہو چکا ہے۔ اور اُس کی موت نے مجھے بھی نیم جاں کر دیا ہے۔"

اسحاق کے ان الفاظ سے میں سُن ہو گیا۔ مگر میری طرف التفات کئے بغیر اُس نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔

"یہ کہتے ہوئے میری زبان لکنت کرتی ہے معلوم ہوتا ہے میرے اعصاب میں آگ لگ رہی ہے مگر کیا کروں مجھے بہرصورت حقیقت کو بے نقاب کرنا ہے۔ تفضّل فیروزپور میں تھا کہ یکایک

تپِ محرقہ میں مبتلا ہو گیا۔ اکّیس دن وہ چارپائی پر پڑا رہا۔ علاج میں بہت کوشش کی گئی۔ اور جب وہ صحت یاب ہو کر اُٹھا تو صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ ایک ہفتہ تو خیر گذری مگر اس کے بعد پھر بخار ہو گیا۔ یہ تپِ محرقہ کا دوسرا حملہ تھا جس سے کوئی خوش قسمت ہی جانبر ہوتا ہے۔ سترہ روز تفضّل بستر پر بیہوش پڑا رہا اور آخر مر کر اس تکلیف سے نجات حاصل کی۔ جس مکان میں تفضّل بیمار تھا اس کے عین مقابل کسی ٹھیکیدار کا مکان تھا۔ وہ ٹھیکیدار، میں اس کا نام بھول گیا ہوں، بہت بنا ٹھنا، بانکی وضع کا جامہ زیب نوجوان تھا۔ تفضّل کی بیماری کے زمانہ میں میں نے اُڑتی ہوئی خبر سُنی کہ تفضّل کی بیوی اور اس ٹھیکیدار کے درمیان نامہ و پیام جاری ہے۔ لیکن میں اس بات کو باور نہ کر سکتا تھا اور نہ باور کرنا چاہتا تھا۔ مگر کچھ روز بعد بے شمار زبانوں سے یہ اطّلاع میرے کانوں تک پہنچی کہ اُن دونوں کے آپس میں مدّت سے تعلّقات قائم ہیں۔ یقین کرو۔ میں یہ خبر سُن کر پاگل ہو گیا۔ تفضّل کی چارپائی پر سر رکھ کر میں پہروں روتا۔ اس لئے نہیں کہ وہ بسترِ مرگ پر اپنی قیمتی زندگی کی آخری گھڑیاں پوری کر رہا تھا۔ بلکہ اس لئے کہ دُنیا کس قدر بے حیائی، بے انصافی اور بد اخلاقی سے لبریز ہے۔ تفضّل اپنے دوستوں کے لئے ایک

نعمت تھا۔ مگر اُس کی بیوی، جسے اُس نے کن کاوشوں سے حاصل کیا تھا، محبّت کے پردے میں کیسی خطرناک سازش کر رہی تھی میں اکثر سوچتا ہوں کہ یا اللہ اس نازک اور حسین جسم کے اندر جسے ہم عورت کہتے ہیں تُو نے کیسا بے رحم اور بے مروّت دل رکھا ہے۔ وہ اپنے مقصد تک پہنچنے کے لئے سنگدلی اور دیدہ دلیری سے راستے کی تمام رُکاوٹوں کو دُور کر دیتی ہے۔ اور مرد ہمیشہ اُس کے افسونِ چشم سے بیوقوف بن کر اُس کی انگلیوں پر ناچتا ہے۔ دُنیا میں کتنی خونریزیاں اور تباہیاں محض اس ہستی کی خاطر وقوع میں آئی ہیں۔ مرد ہمیشہ اپنی فطری سادہ لوحی کے باعث عورت کی ایک جنبشِ چشم اور خفیف سے تبسّم پر جس میں دھوکا، عیاری، فریب اور نفس پرستی کی آمیزش ہوتی ہے اپنی جانیں فروخت کر دیتے ہیں۔ عورت اُسی وقت تک عورت ہے جب تک زیورِ عصمت سے مزیّن ہے ورنہ ایک تباہ کن بلا ہے جس کی زد سے محفوظ رہنے میں سلامتی ہے۔ صداقت مجھ پر روشن ہو چکی ہے اگرچہ دیر میں ہوتی ہے۔ اور ساتھ ہی زندگی کی شاہراہ بھی بدل گئی ہے۔ میں تحریر و تقریر سے عورت کے مکر و فریب اور اُس کی سیاہ کاریوں کا پردہ چاک کر دُونگا۔ میں تاریخ کے اوراق پارینہ دُنیا کے سامنے کھول کر بتاؤنگا کہ عورت مرد کو ازل سے فریب دیتی رہی ہے،

اُس کی ترغیب و تحریص نے مرد کو ہمیشہ راہ راست سے بھٹکایا ہے۔ اور آج بھی وہ گم شدہ جنّت کی بازیافت میں مرد کے راستے میں سب سے بڑی رُکاوٹ ہے۔"

مَیں صبر سے اُس کی زہر چکاں تقریر سُنتا رہا۔ اور جب وہ خاموش ہو گیا تو مَیں نے کہا۔ "اس قدر غُصّے میں نہ آؤ۔ ہوش و حواس کو برقرار رکھو۔ تم تو ناروا سختی سے کام لے رہے ہو۔"

"نہیں، نہیں۔ انصاف یہی چاہتا ہے۔" یہ کہکر اپنی لکڑی کا سہارا لیتے ہوتے وہ میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"کیا سوچتے ہو؟ مَیں نے جو کچھ تم سے کہا ہے وہ واقعات ہیں۔ بے حد تلخ و ناگوار۔ عورت سے انتقام لینا ہی میری زندگی کا مقصدِ وحید ہے۔"

مجروح احساس

میرا مکان شاہراہ پر واقع ہے۔ مَیں دریچے میں بیٹھا کسی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا کہ نیچے سے نالہ و بکا کی دلدوز صدائیں آئیں۔ جھک کر دیکھا تو ایک چارپائی کو جس پر ایک جسدِ بے جان پڑا تھا لوگ کندھوں پر اُٹھائے لئے آ رہے تھے۔ پیچھے پیچھے ایک عورت بحالِ تباہ، گریباں چاک، بال نوچتی اور خاک چھانتی چلی آ رہی تھی۔ اُس کی درد و کرب میں ڈوبی ہوئی چیخیں سُننے والوں پر لرزہ طاری کئے دیتی تھیں۔ وہ ایسی دردناک آواز اور اس قدر پُرسوز الفاظ میں اپنا دکھڑا بیان کر رہی تھی کہ دُور دور سے لوگ کام چھوڑ کر اُس طرف آ گئے۔ مَیں اس عورت کو جانتا تھا۔ یہ ہمارے محلے کی ایک غریب بیوہ تھی۔ جوانی ہی میں اُس کا خاوند مر گیا تھا۔ مگر اُس کی زندگی ہمیشہ بے داغ اور آئینے کی طرح صاف رہی تھی۔ اُس کے شوہر کی یادگار، اُس کی اپنی زندگی کا حاصل اور زیست کا سہارا صرف ایک لڑکا تھا جسے وہ آج تک اپنے خونِ جگر سے پال رہی تھی۔ یہ لاشہ اُسی جان ہار کا تھا۔ میری

آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا اور دل اندر ہی اندر ڈوبنے لگا۔ مجھے یہاں آئے چند ہی روز ہوئے تھے۔ اس نوجوان کی بیماری کا حال معلوم نہ تھا کہ یوں خلافِ توقع یکایک اُس کے جنازے سے دوچار ہونا پڑا۔ معلوم ہوا مرحوم تپ کہنہ میں مبتلا تھا۔ غریب ماں جو تنگدستی کے باعث گھر پر مناسب دوا دارو کرنے سے معذور تھی اُسے سرکاری شفاخانے میں لے گئی کہ ڈاکٹر کی زیرِ نگرانی اچھا علاج ہو سکے۔ آج سہ پہر کو اُس نے وہیں دم توڑا۔

کیسا حسرتناک منظر تھا۔ ایک غم رسیدہ ماں کی عمر بھر کی کمائی لٹ گئی۔ اُس کے گھر کا دیا بجھ گیا۔ اُس کی آنکھوں کا تارا ڈوب گیا اور اُس کے جگر کا ٹکڑا موت نے ہمیشہ کے لئے چھین لیا۔ اور اب وہ خود اُسے پیوندِ خاک کرنے جا رہی تھی۔ بڑھیا نے جن جن مصیبتوں سے مرحوم کی پرورش کی تھی میں جانتا ہوں جاڑے کی لمبی راتیں اور گرمی کے پہاڑ سے دن اُس نے چکّی پیس پیس کر گزار دیئے۔ سردیوں میں برف باری ہوتی تھی۔ اور وہ پہر رات رہے اُٹھ کر آبِ تخ سے برتن دھوتی اور سُورج نکلنے سے پہلے پہلے مکان صاف کرتی تھی۔ اُس نے بیٹے کو اسکول میں داخل کرا دیا اور خود خواب و خور حرام کر کے محنت و مشقت میں جان کھپا کر اُس کے اخراجات کی کفیل بنی۔ مجھے یاد ہے جب وہ پہلی سے دوسری جماعت میں ہوا تو گویا بڑھیا کو کونین کی دولت مل گئی تھی۔ وہ تنہائی کے اوقات میں اپنے نونہال

کے مستقبل کے پُر کیف خواب دیکھا کرتی اور انہی مسرت آگیں خوابوں میں غرق ہو کر زندگی کی کلفتوں کو بھی بھول جاتی تھی۔ اُس نے گھڑیاں گن گن کر دن اور دن گن گن کر ماہ و سال گزارے۔ اور آہ اب کہ وہ طفلِ رعنا، وہ جوانِ نوخیز اپنی زندگی کے سترہ اور تعلیم کے دس برس پورے کر کے میٹرک کے امتحان میں شریک ہو کر اپنی غم نصیب ماں کے محبوب خوابوں کی تعبیر بننے اور اس کے تاریک مطلعِ حیات پر آفتاب بن کر چمکنے والا تھا اجل کے وقت ناشناس وار نے ہمیشہ کے لئے اُس کا خاتمہ کر دیا۔

علل معلول کے لاتناہی سلسلے میں اگر موت کو بھی طبعی حالات کا ایک لازمی نتیجہ تصوّر کر لیں تو چنداں وجہ شکایت نہیں رہتی۔ لیکن اگر موت و حیات کا مسئلہ انسانی تصرف سے بالاتر کلیتہً اُس ہستیِ مطلق کے ہاتھ میں ہے جو حکیم بھی ہے اور رحیم بھی تو یہ تمام کارخانہ سراسر ایک بے اصول اور ناقابلِ فہم مضحکہ بن جاتا ہے۔ اِنسان دُنیا میں کیوں بھیجا گیا ہے؟ میں اپنے گرد و پیش نگاہ ڈالتا ہوں تو غم و اندوہ کے رُوح فرسا مناظر، افلاس و علالت کی جاں گسل تصاویر اور یاس و حرماں کے دل گداز مجسموں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ کیا لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ کی یہی تفسیر ہے؟ سکوتِ شب میں فضا کی خاموشی کو چیرتی ہوئی کوئی چیز کانوں تک پہنچتی ہے تو بیوگی کی آہیں، یتیمی کے نالے

اور بیماری کی چیخیں۔ آفتاب نمودار ہو کر سیاہی کے پردوں کو پارہ پارہ کر کے دنیا کے اصلی رُخ کو سامنے لاتا ہے تو کیا دیکھتا ہوں کہ غریب، نادار، بیکس بڑھیا کا اکلوتا بیٹا جو دُنیا میں اُس کا آخری تنہا سہارا اور اُس کی معصوم اُمیدوں کے قصرِ رفیع الشّان کی بنیاد تھا خیراتی ہسپتال میں ناکافی علاج کے باعث دم توڑ رہا ہے۔ دوسری طرف ایک متموّل رئیس زادہ جس کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ اُس نے امیر کے گھر جنم لیا اپنی بد اعمالی و آوارہ منشی سے ایک نہایت گھناؤنے مرض میں گرفتار ہو جاتا ہے مگر روپیہ پانی کی طرح بہا کر، قابل ترین اطبّا کو مامور کر کے جلد صحت یاب ہو جاتا ہے تا کہ پھر سماج میں گناہ کے جراثیم زیادہ مستعدی سے پھیلا سکے۔ آہ، یہ کیسا انصاف ہے؟

اگر مظلوم و لاچار بیوہ کی متاعِ حیات اس بے دردی سے چھن جانے والی تھی تو اُس بدبخت کو اس نعمت سے بہرہ ور ہی کیوں کیا تھا۔ وہ اولاد سے محروم رہ کر فریبِ اُلفت میں نہ پھنستی تو اس صدمۂ جانکاہ سے بھی بچ جاتی۔ اُس مشہور روایتی جزیرے کی حسین لیکن خونخوار عورتوں کی طرح جو اپنے نغمۂ دلنواز و حُسنِ سحر آگیں کے زور سے گم کردہ راہ مسافروں کو اپنی محبت میں مبتلا کر کے اُن کے خون کا آخری قطرہ تک چوس لیتی ہیں۔ قدرت بھی انتہائی ستم ظریفی سے انسان کو سرابِ نعمت کے جادو میں

گرفتار کر کے اُس کی آرزوؤں کے نشو و نما کا جائزہ لیتی رہتی ہے اور جونہی کہ فریب خوردہ انسان نخلِ حیات کے ثمر کی طرف، جس کے سینچنے میں اُس نے خونِ جگر بہایا ہے، ہاتھ بڑھاتا ہے اُس کا ہاتھ قطع کر دیا جاتا ہے۔ یا درخت جڑ سے کاٹ دیا جاتا ہے۔

کیا تخلیق انسانی سے قدرت کو یہی مقصود تھا کہ تیس چالیس یا پچاس سال تک ایک کمزور انسان مسلسل ابتلاء و مصائب کا شکار ہوتا ہوا قبر میں پہنچ جائے؟

تھا ازل سے مری تقدیر میں انساں ہونا
یعنی اِک پیکرِ صد حسرت و ارماں ہونا

یہ خُون آشام کھیل جو ابتدائے آفرینش سے نسلِ انسانی کے ساتھ کھیلا جا رہا ہے اور نہیں معلوم کب تک کھیلا جائیگا کس کے جذبۂ خُونیں کی تشنگی کو بجھا رہا ہے؟ یہ دُنیا، مصروفِ آلامِ انسانوں کی دُنیا جو شرربار آہوں اور نارسا نالوں سے گُونج رہی ہے کس کے لئے جنّتِ نگاہ و فردوسِ گوش کا سامان بن رہی ہے؟ وہ ہیبتناک و عظیم الشان طاقت جو پس پردہ رہ کر ہماری اُمیدوں، تقدیروں اور ارادوں کو شیر خوار بچّے کے کھلونوں کی طرح چشمِ زدن میں توڑ مروڑ کر فنا کر دیتی ہے ہم سے کس چیز کی طلبگار ہے؟

واعظ چلّاتا ہے دُنیا حق و صداقت پر قائم ہے۔ آہ اس سے قاتل فریب شاید ہی کبھی دیا گیا ہو۔ کیا دُنیا عزّ و جاہ، نام و نمود، دولت و ثروت، شان و شوکت اور عیش و عشرت سے مراد نہیں؟ اور کیا ان لذّتوں، نہیں ان نعمتوں کے حاصل کرنے والے حق و صداقت پر قائم ہیں؟ کتنی نیکیاں ہیں جو دولت کی دریوزہ گری سے بے نیاز ہیں اور کتنے محاسن ہیں جو سیم و زر کی کشش سے مرعوب نہیں ہوتے؟

واعظ سے کہو کہ سینے پر ہاتھ رکھ کر ان حقائق کی تردید کر دے۔

دھمکی

لاہور میں نمائش تھی۔ میرے دوست افتخار حسین بیدلؔ ایم اے بھی یہیں تھے۔ ہم نے ارادہ کیا تھا کہ آج نمائش کی ایک ایک چیز دیکھینگے چنانچہ دوپہر سے ہم نمائش کا چپہ چپہ چھاننے میں مصروف تھے۔ منٹو پارک کا وسیع احاطہ اپنے طول و عرض کی وسعت کے باوجود تماشائیوں کی کثرت سے تنگ ثابت ہو رہا تھا۔ اتوار کا دن چھٹی کا روز۔ دفتر، کچہری کالج سب بند۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ لاہور کی تمام آبادی اسی طرف اُلٹ پڑی ہے۔

بیدلؔ صاحب میرے اُن چند دوستوں میں ہیں جن کے ساتھ سالہا سال کے مراسم کی وجہ سے حد درجہ بےتکلّفی پیدا ہو گئی ہے اور اس بےتکلّفی کا نتیجہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کے ذاتی و خانگی حالات سے ہمیشہ باخبر رہتے ہیں۔ کالج میں جملہ تعلیمی مراحل ہم دونوں نے پہلو بہ پہلو طے کئے۔ اس کے بعد کسبِ معاش کی وجہ سے مَیں نے لاہور ہی میں اقامت اختیار کر لی اور بیدلؔ صاحب چونکہ غمِ روزگار سے بالکل آزاد

تھے اس لئے وہ کبھی اپنے وطن چلے جاتے اور کبھی لاہور آجاتے۔

بیدلؔ کے والد ملتان کے چوٹی کے رؤسا میں شمار ہوتے تھے۔ اور بیدلؔ چونکہ اُن کا اکلوتا لڑکا تھا اس لئے تمام شفقتِ پدری کا مرکز ہونے کے علاوہ اُن کی ساری جائداد کا تنہا مالک بھی وہی تھا۔ بایں ہمہ بیدلؔ کے والد اولاد کی پرورش میں خاص اصولوں کے پابند تھے۔ وہ بچّوں کو صرف اتنا روپیہ دیتے تھے جو اُن کی جائز ضروریات کی کفالت کر سکے۔ یہی وجہ تھی کہ بیدلؔ لاکھوں کی جائداد کا مالک ہونے کے باوجود طالب علمی کے زمانے میں ہمیشہ کفایت شعاری سے زندگی بسر کرتا رہا۔ اور اب فارغ التحصیل ہونے کے بعد بھی اُس کے طرزِ بود و ماند میں اسراف کا شائبہ تک نہ تھا۔ لاہور میں بیدلؔ کے والد نے چند مکان اور بنگلے خرید رکھے تھے۔ اور انہی میں سے ایک مختصر سا لیکن اچھا خوش وضع مکان بیدلؔ کے لئے مخصوص تھا۔ وہ جب بھی لاہور آتا، خواہ ایک ہفتہ ٹھیرنا ہو یا مہینوں قیام منظور ہو، اسی مکان میں ٹھہرتا تھا۔ رہنے کے کمرے اُس نے اپنے مذاق کے مطابق خوب آراستہ کر رکھے تھے۔ اور اس کے قیامِ لاہور کے دوران میں مجلسِ احباب اکثر انہی کمروں میں گرم ہوتی تھی۔ والدین کا اکلوتا فرزند ہونے کی وجہ سے اُسے اپنے اوقات پر وہ بے رحمانہ اختیار حاصل

نہ تھا جس سے ہم مالا مال تھے۔ گھر سے باہر اگر اُسے ایک ہفتہ سے زیادہ مدّت گذر جاتی تو فوراً اُس کی طلبی کے خطوط آنا شروع ہو جاتے تھے۔ اُس کی ہمیشہ یہ خواہش رہتی تھی کہ مستقل طور پر لاہور میں بود و باش اختیار کر لے۔ لیکن اُدھر والدین کی محبت کا تقاضا تھا کہ اُن کا نورِ نظر گھڑی بھر کے لئے اُن کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہو۔ وہ کبھی کبھی ان مجبوریوں سے تنگ آکر کہہ اُٹھتا تھا کہ ماں باپ کا اکلوتا لڑکا ہونا بھی ایک مصیبت ہے۔ بہرحال جہاں تک مصلحت اور واقعات اجازت دے سکتے تھے وہ اپنے اوقات کا بیشتر حصّہ لاہور میں بسر کرنے کے عذر تراش لیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ بیدلؔ نے ڈرتے ڈرتے انگلستان جانے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ لیکن بیدلؔ کے والد اس تحریک کے شدید مخالف تھے۔ وہ پُرانی وضع کے بزرگ تھے۔ جن کا خیال تھا کہ جب گھر میں کھانے کو بہت ہے تو کیوں گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا جائے۔ علاوہ ازیں وہ سمجھتے تھے کہ ولایت جا کر ہندوستانی نوجوانوں کے اخلاق بگڑ جاتے ہیں جس سے قوم کی قوم میں بُرائی کے جراثیم سرایت کر جانے کا اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے۔

نمائش میں گھومتے گھومتے جب ہم اُس حصّے میں داخل ہوئے جو تفریحات کے لئے وقف تھا تو ہنگورے، جادو کے کھیل، ورزش کے

کرتب اور متعدد دیگر دلچسپ تماشے دیکھنے کے لئے خلقت کا ایک جمِ غفیر موجود تھا۔ کھوے سے کھوا چھلتا تھا اور ہجوم کے ریلے سے ایک جگہ پاؤں جمنے مشکل ہو گئے تھے۔ ایک طرف ہٹ کر، کچھ فاصلے پر خواتین کھڑی تھیں۔ شاندار ساڑھیوں، حسین و جمیل چہروں اور زرق برق ملبوسات کی چمک کے ساتھ خوشبو کی لپٹیں اور لوچدار قہقہے مل کر اس منظر کو ایک ایسی رومانی کیفیت بخش رہے تھے کہ اکثر و بیشتر تماشائیوں کی نظریں صرف اس جنّتِ نگاہ کے لئے وقف ہو چکی تھیں۔ بیدل بھی غالباً اُنہی میں سے تھا۔ کیونکہ یکایک اُس نے میرا بازو ہلایا اور کہا۔ "وہ دیکھو شمسہ کھڑی ہے۔"

مَیں نے آنکھیں پھرائیں تو اُس نے اشارے سے بتایا۔ عورتوں کے مجمع میں قدرے نمایاں جگہ پر مس شمسہ بدرالدین کھڑی تھیں۔ اس کے بعد جب تک ہجوم وہاں سے منتشر نہیں ہو گیا۔ بیدل کھیلوں کی طرف کم اور مس شمسہ کی طرف زیادہ متوجہ رہا۔ اور آخر نہ رہا گیا تو شکوہ آمیز لہجے میں کہنے لگا۔ "مَیں کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ مس شمسہ سے میرا بھی تعارف کرا دو لیکن تم اس معاملہ میں ہمیشہ سُنی اَن سُنی ایک کر دیتے ہو۔"

مَیں نے ہنس کر کہا۔ "لیکن تعارف پیدا کرنے کی اس قدر بیتابی کیوں ہے؟"

"بیتابی وبیتابی تو کسی کو نہیں۔ یونہی ایک تعلیم یافتہ مہذب خاتون کے ساتھ ملاقات کی خواہش ہر لکھے پڑھے آدمی کو ہوتی ہے۔ ہماری معاشرت میں چونکہ پردے کی قید شدّت سے رائج ہے اس لئے ابھی تک سماج میں اس قسم کی عورتوں کا وجود آٹے میں نمک کی حد تک بھی نہیں پہنچا۔"

"تو بھائی، مس شمسہ کے ساتھ واقفیّت پیدا کرنا کون سا جان جوکھوں کا کام ہے کہ آپ اس بارِ عظیم کو میری شرکت کے بغیر اُٹھا ہی نہیں سکتے۔"

اس پر بیدل کسی قدر جھلّا کر بولا۔ "یہ تو میں جانتا ہوں کہ تم اِس معاملہ میں سخت خود غرض واقع ہوئے ہو۔"

میں نے ہنس کر کہا۔ "اچھا طعن و تشنیع کو چھوڑو۔ لو آج ہی میں تمہیں اس سے متعارف کئے دیتا ہوں۔"

ہم نے دُور سے دیکھا کہ مس شمسہ نمائش کے ریسٹوران میں داخل ہو رہی ہیں۔ میں نے بیدل سے کہا کہ اب ذرا عجلت سے کام لو، تاکہ چائے پینے کے لئے ہم بھی عین موقع پر وہاں پہنچ جائیں۔ چنانچہ ہم ریسٹوران کے دروازے سے داخل ہوئے ہی تھے کہ مس شمسہ سامنے صوفے پر بیٹھی نظر آئیں ہمیں دیکھ کر پُرتپاک انداز میں کھڑی ہو گئیں اور

اور آگے بڑھ کر بڑی گرمجوشی سے اُنھوں نے مجھ سے مصافحہ کیا ہم بھی اُن کے قریب ہی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ نمائش کی چہل پہل اور سودیشی مصنوعات پر ایک مختصر سا تبصرہ ہوا۔ اتنے میں چائے آگئی اور گفتگو کا پہلو بدلنے کے لئے میں نے بیدلؔ کی طرف اشارہ کر کے مس شمسہ سے پوچھا۔

"میرے دوست بیدل صاحب سے تو شاید آپ کا تعارف نہیں ہے؟"

"جی نہیں ——— مجھے افسوس ہے۔"

"آپ میرے نہایت عزیز دوست افتخار حسین بیدلؔ ہیں۔ ہم دونوں کالج میں ایک ساتھ پڑھتے رہے ہیں۔ آپ تاریخ کے ایم اے اور پنجاب کے ایک ذہین و خوش فکر شاعر ہیں۔"

مس شمسہ اور بیدلؔ نے متبسّم ہو کر ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا اور شمسہ نے نہایت ملاطفت کے ساتھ پوچھا۔ "آپ لاہور ہی کے رہنے والے ہیں؟"

بیدلؔ نے جواب دیا "جی نہیں میرا اصلی وطن ملتان ہے۔"

"ملتان! گویا پنجاب کی سرحد کہئے نا؟"

اس پر ایک فرمائشی قہقہہ لگا۔ اور ہم چائے میں مصروف ہو گئے۔

چند منٹ کے بعد مس شمسہ پھر بیدلؔ سے مخاطب ہوئیں۔

"بیدل صاحب آپ کے مشاغل کیا ہیں؟"

بیدلؔ نے جواب میں قدرے توقف کیا تو میں دخل در معقولات کی پروا نہ کرتے ہوئے بول اُٹھا۔

بیدلؔ صاحب کے مشاغل نہ پوچھئے۔ جو شخص ملتان کے سب سے بڑے رئیس کا اکلوتا لڑکا اور لاکھوں کی جائداد کا واحد مالک ہو اُس کے مشاغل ہو ہی کیا سکتے ہیں۔ مولٰنا محمد حسین آزاد مرحوم کے الفاظ میں ایک رئیس زادے کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ دو وقت کا کھانا ہضم کرے۔"

مس شمسہ اس لطیفے سے بہت محظوظ ہوئیں اور بیدل کھسیانا سا ہو گیا۔ میں نے اس کی دلجوئی کے لئے کہا۔

"مس شمسہ! بیدل صاحب حد درجہ خوش قسمت انسان ہیں کہ اس کشمکش کے زمانے میں قدرت نے اُنہیں فکر معاش سے محفوظ رکھا ہے۔ خدا کا خاص احسان ہے کہ آج کل جب کہ روزگار کی پریشانیوں نے تمام دُنیا کے چھکے چھڑا دیئے ہیں یہ ہر پہلو سے مطمئن زندگی بسر کر رہے ہیں کبھی آپ کو ملتان جانے کا اتفاق ہو تو دیکھیئے گا کہ بیدلؔ صاحب کے خاندان کی دُنیاوی حیثیت ہمارے صوبے کے والیانِ ریاست سے کم نہیں ہے۔ پھر جب تموّل اور فارغ البالی کا یہ عالم ہو تو بیدلؔ صاحب کو کیا مصیبت پڑی ہے کہ ہماری طرح مزدوروں کی زندگی بسر کرتے پھریں۔"

مس شمسہ نے مرعوب ہو کر بیدل کی طرف غور سے دیکھا اور پھر ایک

خاص انداز میں کہنے لگیں :-

"کس قدر خوشی کی بات ہے کہ بیدلؔ صاحب نے ان حالات میں رہ کر اپنے آپ کو اعلےٰ تعلیم سے فیضیاب کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ ورنہ بالعموم آج کل کے رئیس زادے جنہیں گھر سے کھانے کو مل جائے پڑھنے لکھنے کا نام نہیں لیتے۔

مَیں نے آہستہ سے بیدلؔ کا شانہ دبایا اور پھر اُس کی مزید ہوا باندھنے کے لئے کہا :-

"آپ دیکھیں گی کہ بیدلؔ صاحب صرف درسی کتابیں رٹ کر کامیاب ہونے والے ایم اے ہی نہیں بلکہ بے حد پاکیزہ مذاق اور وسیع معلومات کے انسان ہیں۔ تہذیب و معاشرت اور ادب و سیاست کا کوئی پہلو نہیں جس پر بیدلؔ صاحب نے سیکڑوں کتابیں نہ پڑھ ڈالی ہوں۔ اعلیٰ مطالعہ اور فطری ذہانت نے ان کے دل و دماغ کو ایسی جِلا بخشی ہے کہ ان کا وجود تعلیم یافتہ طبقے کے لئے مغتنمات سے ہے۔"

بیدلؔ اپنی تعریف سُن سُن کر شاید گھبرا گیا تھا کیونکہ مَیں نے ابھی بات ختم نہیں کی تھی کہ وہ مُسکرا کر کہنے لگا۔ "ارے بھئی چھوڑو بھی اس قصّے کو۔ بس شمسہ! معاف فرمائیے گا۔ ان حضرت کی تو عادت ہے کہ دُنیا بھر کے تفنّن اور مذاق کا مرکز اپنے دوستوں کو بناتے ہیں۔ میں کیا اور

میری لیاقت کیا۔ آج کل تو گلی گلی کوچے میں چھوکرے گاتے پھرتے ہیں۔ ایم اے بنا کے کیوں مری مٹی خراب کی۔ پھر اگر میں نے ایم اے کر لیا تو کونسا سُرخاب کا پر مجھے لگ گیا۔ بہرحال اگر آپ کو میرے اندر کوئی چیز قابلِ تعریف نظر آتی ہے تو اُسے آپ جیسے (میری طرف اشارہ کر کے) فاضل دوستوں کی صحبت و ہم نشینی کا اثر کہیئے۔ ورنہ من آنم کہ من دانم۔"

مس شمسہ بدرالدین ایک عیسائی لڑکی تھی جس کی عمر کا اندازہ بیس اور پچیس سال کے درمیان کیا جا سکتا تھا۔ وہ کب سے لاہور میں تھی، اس کا صحیح علم کسی کو نہ تھا۔ خود اُس کی زبانی جو کچھ وقتاً فوقتاً معلوم ہو سکا اُس کا ملخص یہ تھا کہ وہ دراصل کانپور کی رہنے والی ہے۔ اس کا والد پہلے مسلمان تھا۔ لیکن مذہب عیسوی اختیار کرنے کے بعد اُس نے ایک عیسائی عورت سے شادی کر لی تھی اور شمسہ اس کے بطن سے تھی۔ شمسہ کے والد کے انتقال کے بعد اُس کی ماں چند در چند مصائب میں گرفتار ہو گئی۔ جس کی سب سے بڑی وجہ بدرالدین آنجہانی کے رشتہ داروں کی بدسلوکی تھی۔ چونکہ بدرالدین مرحوم اپنے پیچھے کافی روپیہ چھوڑ گئے تھے اس لئے شمسہ کی ماں نے یہی مناسب سمجھا کہ آئے دن کے جھنجھٹ سے نجات پانے کے لئے نقلِ مکان کر کے کسی اور شہر میں

سکونت اختیار کر لی جائے۔ چنانچہ ماں بیٹی لاہور آ گئیں۔ نکلسن روڈ پر اچھے متوسط درجے کے لوگوں کی آبادی میں انہوں نے ایک خوبصورت سا مکان کرائے پر لے رکھا تھا۔ مکان کے دروازے پر "مس شمسہ بدرالدین" کے نام کی ایک چھوٹی سی برنجی تختی آویزاں تھی جس سے بجز بیگم کے نام کے اُس کے دیگر حالات و مشاغل کے متعلق کوئی بات ظاہر نہ ہوتی تھی شمسہ کو اُردو انگریزی میں اتنی دسترس تھی کہ وہ دونوں زبانوں میں روانی سے تحریر و تقریر کا کام کر سکتی تھی مس شمسہ کی سب سے بڑی خوبی جس نے اُسے لاہور کے تعلیم یافتہ طبقہ میں مشہور کر رکھا تھا اُس کی آواز تھی۔ وُہ موسیقی سے خوب واقف تھی۔ لیکن مہارتِ فن کے علاوہ جس چیز نے اُسے ایک ساحرہ کا درجہ عطا کر دیا تھا اُس کی آواز تھی۔ مَیں نے اکثر عورتوں کو گاتے سُنا ہے لیکن جو جادو شمسہ کے گلے میں تھا اور کہیں نہیں دیکھا کسی مرغزار میں، آہستہ آہستہ بہنے والی ندّی کے کنارے، فضا کی خاموشی میں، بنسری کی حزیں و ملول لے بلند ہو کر رُوح میں جو رقّت پیدا کرتی ہے وہی سوز و گداز شمسہ کی آواز میں تھا۔ مَیں نے جب بھی اس کا گانا سُنا یہی محسوس ہوا کہ محبّت کی نامرادی اور عشق کی حرماں نصیبی موسیقی کی زبان میں بیان کی جا رہی ہے۔

رفاہِ عامہ کے کاموں میں روپیہ جمع کرنے کے لئے لاہور میں گاہے

گاہے ہنگامی جلسے منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ جن میں داخلہ ٹکٹ کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ اور اس طرح جتنا روپیہ اکٹھا ہو کسی کارِ خیر میں صرف کر دیا جاتا ہے۔ اس قسم کے جلسے بالعموم شہر کے علمی و ادبی یا اصلاحی تمدّنی اداروں کے زیرِ اہتمام ہوتے ہیں۔ اور عوام کی کشش کے لئے ان جلسوں میں دلچسپی کے مختلف سامان مہیّا کئے جاتے ہیں۔ موسیقی کا انتظام ہوتا ہے۔ کبھی کوئی ڈرامہ کھیلا جاتا ہے۔ بعض اوقات مسمریزم کے کرتب تاش کے کھیل اور جمناسٹک کے نمونے دکھائے جاتے ہیں غرضکہ لوگوں کی دلبستگی کے بہترین لوازم تہذیب و شائستگی کے ساتھ مجتمع کر کے روپیہ فراہم کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ ان مجامع کی ایک خاص صفت یہ ہے کہ موسیقی ڈرامہ یا کھیلوں میں حصّہ لینے والے لوگ عموماً پیشہ ور طبقے کے افراد نہیں ہوتے بلکہ زیادہ تر کالجوں کے طلبہ اور معلّم یا سرکاری و غیر سرکاری شعبوں کے معزز اراکین ہوتے ہیں جو ایسے موقعوں پر بلا معاوضہ رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کر دیتے ہیں شمسہ نے اوّل اوّل اسی قسم کے جلسوں میں شریک ہو کر سامعین کو مبہوت بنایا۔ اور جُوں جُوں اُس کی شہرت پھیلتی گئی لاہور کی مہذب آبادی میں اس "نووارد" کے متعلق چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ کچھ عرصہ گذرنے کے بعد لوگوں کا یہ تفحص و تجسّس بھی کم ہو گیا۔ اور شمسہ ایک "تسلیم شدہ حقیقت"

کی حیثیت سے لاہور کی ایک جانی پہچانی ہستی بن گئی۔ اُس نے اپنے مکان کے دروازے پر " زنانہ میوزک سکول " کے نام کی تختی آویزاں کرلی جس سے مراد تھی کہ اس جگہ خواتین کو موسیقی کی تعلیم دی جاتی ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود شمسہ بہت رکھ رکھاؤ کی عورت تھی۔ وہ بظاہر کسی سے بے تکلف ہونا نہ جانتی تھی۔ اور غالباً اس کے اس محتاط طرزِ عمل کا نتیجہ تھا کہ اُس کی سنجیدگی اور نیک چلنی کی شہرت لاہور میں قائم ہوگئی۔ شکل وصورت کے لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ بہت زیادہ حسین نہ تھی۔ تاہم اُس کے چہرے کا نقشہ عام عورتوں کا سا نہ تھا۔ اُس کی رنگت صاف تھی۔ ناک اور ہونٹ بے عیب تھے لیکن آنکھوں کے اندر ایک ایسی دلکشی تھی کہ جب وہ اپنی لمبی لمبی پلکیں اُٹھا کر مخاطب کو پوری توجہ سے دیکھتی تو ناپاک ضمیر بھی اس سحر کے سامنے کانپ کانپ جاتا تھا۔ ساڑھی کے اندر لپٹی ہوئی نگاہیں زمین پر جمائے، جب وہ تیزی کے ساتھ سامنے سے گذر جاتی تو اس کے قامت کی رعنائیاں اُس کے پہلوؤں کے دلآویز خم کے ساتھ مل کر دیکھنے والے کے دل میں ایک کھلبلی سی مچادیتی تھیں۔

بیدل نے شمسہ سے متعارف ہونے کے بعد ایسے طریقے سے میل ملاقات بڑھانا شروع کی کہ دُنیا پر یہی ظاہر ہو کہ سب کچھ گویا اتفاقیہ

ہو رہا ہے۔ علی الصّباح سیر کے لئے وہی سڑک اختیار کی جس طرف شمسہ جانے کی عادی تھی۔ شام کی تفریح کے لئے بظاہر بلا ارادہ لیکن فی الحقیقت بالارادہ وہی سینما منتخب کیا جس میں عام طور پر شمسہ جاتی تھی۔ اس طرح سر راہے گاہے ملاقات ہو جاتی تھی اور کبھی مصافحہ بھی۔ ایک روز اسی ہی رواروی کی ملاقات ہوئی تو بیدل نے شمسہ کو اپنے ہاں کھانے میں شرکت کی دعوت دے دی۔ شمسہ نے معذرت کی کہ اُسی شام خود اس کے ہاں چند مہمان آ رہے تھے۔ اور ساتھ ہی اس نے بیدل سے فرمائش کر دی کہ "آج شام آپ غریب خانہ پر ماحضر تناول فرمائیے۔ پھر فرصت کے کسی موقع پر میں حاضر ہو جاؤں گی۔"

بیدل نے بہ طیب خاطر دعوت قبول کر لی اور اس طرح پہلی مرتبہ وہ شمسہ کے مکان میں ایک مہمان یا ایک دوست کی حیثیت سے داخل ہُوا۔ اور شمسہ نے جس حُسن سلوک و مدارات کا مظاہرہ کیا اُس نے بیدل کو اس قدر جُرات دلا دی کہ اب اُس نے تقریباً روزانہ شمسہ کے ہاں جانا شروع کر دیا۔ چند ہی روز میں مراسم اس قدر بڑھ گئے کہ آج شمسہ بیدل کے ہاں مدعو ہے تو کل بیدل کو شمسہ کے ہاں سے دعوت آئی ہے۔ دونوں اکٹھے کبھی لاہور کے کسی بہترین ریسٹوران میں چائے پیتے کبھی کسی شاندار ہوٹل میں کھانا کھاتے اور ظاہر ہے کہ مصارف کا بوجھ

بیدلؔ ہی کو اُٹھانا پڑتا تھا۔ اس دوران میں بیدلؔ سے میری ملاقات بتدریج کم ہوتی گئی۔ کچہری کے دھندوں سے صرف اتوار کو فرصت ملتی تھی۔ اور فراغت کا یہ ایک دن بھی ہفتے بھر کے رُکے ہوئے کاموں کی نذر ہو جاتا تھا۔ بیدل میرے مکان پر بہت کم آتا تھا۔ اور مَیں قلّتِ فرصت کی وجہ سے اس کے ہاں بار بار جانے سے معذور تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیدلؔ کے متعلق بیشتر اطلاعیں مجھ تک چند دیگر اشخاص کی زبانی پہنچنے لگیں۔ ایک روز کچہری سے واپسی پر وہ مجھے راستے میں مل گیا۔ اور مَیں اُسے کشاں کشاں اپنے ہمراہ کھینچ لایا۔ علیک سلیک کے بعد جب ہم ایک دوسرے کی رسمی خیریت دریافت کر چکے تو مَیں نے پوچھا۔ "مس شمسہؔ بدرالدین تو اچھی ہیں؟"

بیدلؔ نے کسی قدر جھینپ کر جواب دیا۔ "ہاں، بالکل اچھی ہیں۔ کہو کوئی کام ہے اُن سے؟"

گفتگو آہستہ آہستہ فقرہ بازی پر اُتر آئی اور ہم نے مذاق کے رنگ میں ایک دوسرے سے خوب نوک جھونک کی۔

بیدلؔ نے شمسہؔ کی مدح و ستائش میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ اُسکے ذوقِ سلیم اور اُس کی سنجیدہ ظرافت کی تعریف کی۔ شرافت و اخلاق کے لحاظ سے اُسے نسائیت کا معیار قرار دیا۔ عادات و اطوار کے اعتبار

سے اُسے بے بتایا۔ غرضکہ انسانی سیرت وصورت کی کوئی خوبی نہ تھی۔ جس سے شمسہ محروم رہی ہو۔ اور آخر بیدل نے واضح الفاظ میں کہدیا کہ تمام ظاہری وباطنی محاسن جن سے ایک عورت متصف ہوسکتی ہے۔ شمسہ میں بدرجہ کمال موجود ہیں۔

کم وبیش ایک سال گذر گیا۔ بیدل شمسہ پر بے دریغ روپیہ خرچ کرتا رہا۔ اُس نے ہر ممکن کوشش کی کہ اپنی جملہ کارروائیوں کو پردۂ خفا میں رکھ سکے۔ اور وہ شاید مطمئن تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے دوسروں کی آنکھ سے اوجھل ہے۔ لیکن لاہور میں بے شمار لوگ ایسے بھی ہیں جو دیکھ بھال کر انجان بنے رہتے ہیں۔ بیدل نے بالا بالا اپنے والد کے کارندوں سے مل کر کسی بہانے سے ایک بہت بڑی رقم حاصل کرلی جو اُس کے روز افزوں اخراجات کی کفالت کرتی رہی۔ اب اس کے حالات میں کچھ تغیر سا آگیا تھا۔ وہ ملتان چلا گیا اور زیادہ وقت وہیں گذارنے لگا۔ کبھی لاہور آتا، دو چار روز ٹھہرتا اور واپس چلا جاتا تھا۔ مجھ سے عمداً کنارہ کشی کرنے لگا۔ اور مَیں بھی خواہ مخواہ بارِ خاطر بننے سے احتراز کرتا تھا۔ مَیں نے اُڑتی اُڑتی خبر سُنی کہ بیدل لاہور کے ایک مشہور ساہوکار سے بہت سا روپیہ قرض لے رہا ہے۔ یہ خبر میرے لئے یقیناً رنج دِہ تھی۔ کیونکہ بیدل کی حیثیت اور وجاہت کے انسان کا ان باتوں پر اُتر آنا اُس

کی اور اُس کے خاندان کی رُسوائی کا باعث تھا۔ میں نے اُسے ایک ضروری خط لکھ کر لاہور بُلایا۔ لیکن وہ یہاں آکر بھی مجھ سے ملنے سے پہلو تہی کرتا رہا۔ شاید اُس کے دل میں خیال ہوگا کہ میں اُس کے اور شمسہ کے تعلقات پر معترض ہونگا۔

ایک روز خلافِ توقع صبح ہی صبح بیدل میرے ہاں آگیا۔ وہ کچھ نادم، پریشان اور کھویا کھویا سا تھا۔ آتے ہی بغیر کسی تمہید کے اُس نے اپنے گذشتہ طرزِ عمل پر اظہارِ افسوس شروع کر دیا۔ کہنے لگا۔ "اگرچہ مَیں نے مملکتِ دوستی میں بظاہر کوئی غدّاری نہیں کی لیکن میں شرمسار ہوں کہ تم سے ملنے میں کوتاہی برتتا رہا ہوں۔ مجھے ندامت سے اپنی اس غلطی کا اعتراف کرنا ہے۔ لیکن ساتھ ہی مجھے امید ہے کہ تم ہمیشہ کی طرح اب بھی مجھے اپنی محبت و شفقت سے نوازنے میں بخل نہیں کرو گے"

مَیں نے کہا۔ "مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں اور تم اب بھی مجھے ویسے ہی عزیز ہو۔ لیکن اُن دیرینہ اور مخلصانہ مراسم کے پیشِ نظر جو ہمارے درمیان قائم ہیں یہ توہین برداشت نہیں کر سکتا کہ تم مجھے رازداری کے ناقابل خیال کر کے اپنے اہم معاملات میں بعض ادنے قماش کے لوگوں پر اعتماد کرتے پھرو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہارے متعلق جو افواہیں گشت لگا رہی ہیں میں اُن سے اب تک بے خبر ہوں؟"

بیدل نے گھبرا کر کہا۔ "کون سی افواہیں؟"

"کون سی افواہیں! یہی کہ تم نے والد سے چوری اپنے کارندوں سے پانچ ہزار کی رقم ایک اُڑائی اور پھر مولراج ساہوکار سے چھ ہزار کی رقم الگ لی۔ اور اس تمام روپے کو تم نے عیاشی میں خراب کیا۔ کیا ایک تعلیم یافتہ شریف زادے کے یہی لچھن ہونے چاہئیں؟"

بیدل نے اُٹھ کر میرے پاؤں پکڑ لئے اور نہایت لجاجت سے کہنے لگا۔ "خدا کے لئے اس علم کو اپنی ذات تک محدود رکھنا۔ تمہیں کیا معلوم کہ میں کس مخمصے میں گرفتار ہوں۔ اگر تم میری نادانیوں کی تفصیل سُنو تو مجھ سے ہمدردی کرنے لگو گے۔ میں اسی لئے یہاں آیا ہوں کہ تم سے کوئی نجات کی راہ دریافت کروں۔"

میں نے کہا۔ "بتاؤ وہ کونسی مصیبت ہے جس نے تمہیں اتنا پریشان کر رکھا ہے۔"

ذرا غور سے سُنتے جاؤ میں تمام واقعات اختصار سے بیان کئے دیتا ہوں۔ پہلی پانچ ہزار کی رقم سے جس کا تم نے ابھی ذکر کیا ہے۔ دو ہزار میں نے شروع میں شمسہ پر خرچ کئے۔ اُسے میں نے اپنی خاندانی جائداد اور آمدنی کے متعلق تمام حالات بتا دیئے تھے۔ تھوڑا ہی عرصہ گذرنے پایا تھا کہ ہمارے درمیان محبت آمیز خطوط کا

تبادلہ شروع ہو گیا اور مَیں نے اُس سے شادی کی فرمائش کر دی جسے اُس نے بخوشی قبول کر لیا۔ تم جانتے ہو ہمارے کنبے میں شادی بیاہ کے معاملات ابھی تک ذات پات کے دقیانوسی اصولوں کے ماتحت طے ہوتے ہیں۔ اور ہماری برادری کا کوئی شخص دوسری قوم کی لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا۔ مَیں نے اپنی اس تجویز کا والدہ سے ذکر کیا تو وہ اس قدر خوف زدہ ہوئیں کہ اُن کے آنسو نکل آئے۔ اُنہوں نے رو کر مجھ سے کہا کہ اگر تم نے ایسی حرکت کی تو ہمارے خاندان کی پشتوں کی عزّت خاک میں مل جائیگی۔ اور شرم وندامت کی وجہ سے ہمیں خانہ بدوش بن کر وطن چھوڑ دینا پڑے گا۔ ساتھ ہی اُنہوں نے یہ بھی کہا کہ اگرچہ تم اپنے والد کے اکلوتے لڑکے ہو لیکن یاد رکھو تمہارا باپ تمہاری موت کا صدمہ برداشت کر سکتا ہے۔ لیکن اس بات کی تاب نہیں لا سکتا کہ ایک بے ننگ و نام عیسائی لڑکی بہو بن کر اُس کے مکان میں داخل ہو۔ اُدھر شمسہ کا اصرار بڑھ رہا تھا کہ شادی کی رسوم جلد ادا ہونی چاہئیں جب لاچار ہو کر مَیں نے معذوری کا اظہار کیا تو وہ غصّے سے بھڑک اُٹھی اُس نے مجھے خط لکھا کہ وہ عنقریب عدالت میں میرے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنے والی ہے۔ میرے بہت سے خطوط اُس کے پاس موجود تھے جو مجھے مجرم بنانے کے لئے کافی تھے۔ مَیں فوراً لاہور پہنچا اور شمسہ کو تین ہزار روپیہ دے کر بمشکل راضی کیا کہ وہ سر دست عدالت میں جانے سے توقف کرے۔ زیادہ مدّت

گذرنے نہ پائی تھی کہ پھر اُسی قسم کے تہدید آمیز خطوط آنا شروع ہو گئے اور میں نے مجبور ہو کر اُسے تین ہزار کی رقم دے کر خاموش کیا۔ ابھی ایک مہینہ نہیں ہوا کہ پھر اُس کا مطالبہ شروع ہو گیا تھا اور میں دو ہزار پھر نذر کر کے آرہا ہوں۔ اب حالت یہ ہے کہ میرے پاس ایک کوڑی نہیں۔ مقروض حد سے زیادہ ہو چکا ہوں۔ صبح و شام کی پریشانی علیحدہ لاحق ہے اُدھر شمسہ کی طرف سے ہر گھڑی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اگر اُس نے دعوے کر کے مجھے عدالت میں بُلا لیا تو عمر بھر کی عزّت تباہ ہو جائیگی اور اگر دعوےٰ نہ کیا تو شاید مجھ سے اور روپے کا مطالبہ کرے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ اِن حالات میں مَیں کیا کروں؟"

اُس کی یہ داستان سُن کر مَیں نے جواب دیا۔ "تمہیں چاہیئے تھا کہ جونہی اُس نے تمہارے خلاف قانونی چارہ جوئی کا ارادہ ظاہر کیا تھا تم فوراً میرے پاس آتے اور معاملہ وہیں کا وہیں سنبھل جاتا۔ اس کے بعد سب سے بڑی غلطی تم نے یہ کی کہ اُسے روپیہ دے کر خاموش کرنا چاہا۔ ظاہر ہے کہ شمسہ کا ارادہ شروع ہی سے یہ تھا کہ وہ دھمکی دے کر تم سے روپیہ وصول کرے گی۔ ایک سیدھا سادا رئیس زادہ جب ایسی عورت کے ہتّے چڑھ جائے تو اُس نادان کا یہی حشر ہوتا ہے۔ بہرحال اگر تم وعدہ کرو کہ آئندہ شمسہ کے ساتھ تمام تعلقات منقطع کر لو گے تو میں اس ناگوار

قضیہ کو ختم کرنے کی کوشش پر آمادہ ہوں۔"

بیدلؔ نے بلند آواز سے کہا۔ "میں حتمی وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ اس سے کوئی واسطہ نہیں رکھوں گا۔"

میں جانتا تھا کہ شمسہ ایسی عورتوں میں مقدمہ بازی کی ہمت نہیں ہوتی۔ اور جہاں وہ دیکھتی ہیں کہ پانسہ پلٹ جانے کا احتمال ہو گیا ہے میدان چھوڑ کر بھاگ جاتی ہیں۔ چنانچہ میں نے اسی روز مس شمسہ بدرالدین کے نام ایک نوٹس بھجوا دیا کہ "آپ نے میرے دوست افتخار حسین بیدلؔ سے دغا و فریب اور تہدید و تخویف کے ذریعہ سے جو آٹھ ہزار روپیہ وصول کیا ہے وہ فوراً واپس کر دیجئے۔ ورنہ آپ کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا جائیگا۔ علاوہ ازیں اگر آپ کو بیدلؔ کے خلاف کوئی شکایت ہے تو بخوشی عدالت میں آکر قانون سے استمداد کیجئے۔"

اس دھمکی کا اثر عین میری خواہش اور توقع کے مطابق ہوا۔ تیسرے ہی دن مس شمسہ بدرالدین بھاگی بھاگی میرے مکان پر آئیں اور تاجرانہ رنگ میں سودا کرنے پر آمادہ ہو گئیں۔ ان کا اصرار تھا کہ اُن کے خلاف مقدمہ دائر کرنے سے احتراز کیا جائے اور اس رعایت کے معاوضہ میں وہ بیدلؔ کے تمام خطوط واپس کرنے پر تیار تھیں۔ بیدل نے یہ شرط منظور کر لی۔ اور یوں وہ عشق و محبت کی داستانوں سے لبریز خطوط بیدل صاحب

کی جیب میں واپس جا پہنچے جنہیں غالباً بعد میں اُنہوں نے نذرِ آتش کر دیا ہوگا۔ اس واقعہ کے بعد ایک مہینے کے اندر مس شمسہ لاہور سے غائب ہو گئیں اور لاہور کے زندہ دل لوگوں کے لئے اپنی دلچسپ شخصیّت کے متعلق سوائے قیاس آرائیوں کے کوئی یاد باقی نہ چھوڑ گئیں۔

حدیثِ آرزو

دردِ دل لکھوں کب تک ؟ جاؤں اُن کو دکھلا دوں
اُنگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا

وہ اپنے حجلۂ نور میں مقیم ہے۔ میری خوش بختی کی بھی کوئی حد ہے کہ میرا غربت کدہ اُس کے دریچے کے عین سامنے ہے۔ صبح و شام، سیکڑوں قدم چُپ چاپ اُس کی دیوار کے نیچے سے گذر جاتے ہیں۔ لوگ رشک آلود نگاہوں سے حیرت زدہ ہو ہو کر میری طرف دیکھتے اور تعجب کرتے ہیں۔ کہ ایک گدائے بے نوا ملکۂ حُسن کے قرب میں کیونکر رہ سکتا ہے۔ دُنیا کی بلند و بالا شخصیتیں، زر و جواہر کے عظیم الشان انباروں کے مالک اور دنیوی جاہ و حشمت کے اجارہ دار یہی خیال کرتے ہیں کہ حُسن کی دیوی کے حضور میں ہدایائے امارت ہی پیش کئے جانے کے قابل ہیں مفلس کا دل اُن کے نزدیک کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ اور وہ شاید سمجھتے ہیں کہ عشق کی دُنیا میں ناداری ایک ایسا گناہ ہے جس کا کفارہ عمر بھر کی محرومی ہے لیکن

مَیں اور عشق ؟ کیا مَیں اپنے جذبات کی توہین تو نہیں کر رہا؟ آج جبکہ ہر بوالہوس عاشق کہلائے جانے کا مدعی ہے۔ جب کثرت اور عمومیّت نے عشق کو ذلیل حُسن پرستی کا مترادف بنا دیا ہے میرا ادعائے عشق حُسن کی شان میں گستاخی نہیں تو کیا ہے؟

کیا یہ کم معراج ہے کہ علی الصّباح جب وہ اپنی حسین عریاں گردن اور بلّوریں شانوں کو ذرا سا دلفریب خم دے کر اور اپنی غزالیں آنکھوں کو پھرا کر اِدھر اُدھر دیکھتی ہے تو مجھے بھی اُن پر فدا ہونے کا موقع مل جاتا ہے۔

آہ وہ آنکھ جو ہر سمت رہی صاعقہ پاش

وہ جو مجھ سے کسی عنوان ملائی نہ گئی !

کتنی بار ایسا ہوا کہ جھٹپٹے کے وقت وہ اپنے کوٹھے پر ایک معصومانہ انداز میں، ایک بے خبری کے عالم میں ٹہل رہی ہے۔ ہوا کی خفیف سی لرزش اور کچھ اپنی بے پروائی سے دوپٹے کا آنچل ڈھلک کر کاندھے پر گر گیا ہے اور خمدار کاکلیں پھول سے گالوں پر منتشر ہو گئی ہیں۔ اُس وقت سیاہ بالوں میں اُس کا خوبصورت چہرہ آسمان پر کالی بدلی میں چمکنے والے چاند سے کہیں زیادہ روشن و دلفریب معلوم ہوتا ہے مَیں اس جنّت نگاہ کی سیر کرتا ہوں اور دم بخود رہ جاتا ہوں۔ اگر اُس کی بے پناہ نظریں جن میں شباب نے بلا کا سحر اور قیامت کی تڑپ بھر دی ہے کہیں مجھ سے چار ہو گئیں! اس

خیال کے ساتھ ہی بدن میں کپکپی سی پیدا ہو جاتی ہے اور میں اپنے اعصاب میں ایک ارتعاشِ خفی محسوس کرنے لگتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اُسکی ایک نگاہِ غلط انداز مجھ سے وہی سلوک کریگی جو سورج کی شعاع قطرۂ شبنم سے کرتی ہے۔

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

میں یہ تو نہیں کہتا کہ وہ اپنے شباب کی رعنائیوں سے بالکل باخبر نہیں لیکن وہ رعنائیاں اُس کی حدِّ ادراک سے بہت باہر ہیں۔ آئینے کے سامنے اپنے لمبے لمبے بالوں میں شانہ کرتے وقت اُسے یہ فخر آمیز یقین تو ضرور ہوتا ہوگا کہ وہ حسین ہے مگر اُسے کیا معلوم کہ اُس کا ملاحتِ فریب حُسن دُنیا کے صبر و شکیب کی کس قدر شدید آزمائش ہے۔ اپنے زرنگار ملبوس کی تیاری کے اہتمام میں اُسے یہ خیال بھی ضرور گذرتا ہوگا کہ وہ قد لمبا رکھتی ہے۔ مگر اُس نے یہ جاننے کی کبھی کوشش نہیں کی کہ اُس کے قامت کی درازی اور چال کے الھڑپن سے کتنے فتنے بیدار ہو ہو کر نظامِ عالم کو تہ و بالا اور دیکھنے والوں کے سکون کو درہم برہم کر رہے ہیں جب وہ آزادی سے اپنی سہیلیوں کے ساتھ گفتگو میں محو ہوتی ہے تو پُر ترنم قہقہے لگاتے ہوئے اتنا ضرور سمجھتی ہوگی کہ اُس کی آواز میں لوچ ہے اور آہ جب وہ لعل و زمرد کا جڑاؤ ہار پہنتے وقت اپنی سیمیں گردن کی نظر فریب عریانی کو اور زیادہ

واضح کہ کے دل ہی دل میں ایک مسرّت آمیز حیرت سے کہتی ہوگی کہ "میری گردن کس قدر لانبی ہے۔" تو اُسے کیا معلوم کہ اُس کی نغمہ پرداز آواز ہزار گانوں سے زیادہ دلکش اور اُس کی سپید براّق گردن دیکھنے والوں کے لئے پیامِ فنا ہے۔

اے حسینہ، تیری اُن سیاہ مے گسار آنکھوں کی قسم، جن کی ہوشربا کیفیّت میرے حواس کو بیکار کئے دیتی ہے، حُسن کی انتہائی دلآویزیاں تجھ پر ختم ہوگئیں۔ تیرے حضور میں پہنچنا تو کجا تجھے دُور سے ایک ایسی نظر دیکھ لینا کہ قلب کی دھڑکن تیز نہ ہو، ہاتھ پاؤں اپنی جگہ شل ہو کر نہ رہ جائیں جسم کی ساری قوّت کھنچ کر آنکھوں میں نہ آجائے اور مَیں کسی پتھر سے تراشے ہوئے بُت کی مانند منجمد و ساکن نہ ہو جاؤں میرے لئے ناممکن ہے، میری رُوح کا اضطراب جو تیری ہی عطا کی ہوئی نعمت ہے ہمیشہ تجھ سے پوشیدہ رہے گا۔ اُس التہاب کا سینک بھی جس کی غضب ناک شُعلہ آشامیوں نے اندر ہی اندر میرے دل و جگر کو جلا رکھا ہے تجھ تک نہ پہنچنے دُونگا۔ ایسا نہ ہو کہ اظہارِ تمنّا تجھے خود بین و خود آرا کردے۔ تیری اس بے خبری کے عالم کی ایک ایک نگاہ کی ایک ایک جنبش میرے لئے سامانِ حیات ہے، اور پھر تو مَیں اس سے بھی محروم ہوجاؤں گا۔

قدرت کا انتقام

یوں تو مہینوں بختیار شکل نہیں دکھاتا۔ لیکن جب آتا ہے تو اس مستقل مزاجی سے کہ جب تک میرے آٹھ، دس گھنٹوں کا خون نہ کرلے اُٹھنے کا نام نہیں لیتا۔ یہ نہ سمجھئے کہ اُس کا آنا مجھے ناگوار گذرتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ مَیں تو چاہتا ہوں کہ وہ آئے اور آرام سے بیٹھ کر مجھ سے باتیں کرے۔ لیکن وہ ہے کہ کمرے کی دہلیز سے چند قدم باہر ہی ہوتا ہے تو چلّانا شروع کر دیتا ہے۔ "تم ابھی تیار نہیں ہوئے اُٹھو جلد کپڑے پہنو، ایک ضروری کام ہے"

اُس کے ضروری کاموں کی حقیقت سے مَیں خوب واقف ہو گیا ہوں۔ سوائے اس کے کہ اپنا بے مصرف وقت اِدھر اُدھر سڑکوں پر چکر لگانے میں ضائع کرے اور اُسے خدا کا کام بھی نہیں ہوتا۔ خصوصاً جب سے اُس نے لینڈو کی سواری ترک کر کے موٹر کار خریدی ہے۔ اُس کا یہ آوارہ گردی کا شوق اور زیادہ ہو گیا ہے۔ میرے متعلق وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ

ایک مصروف شخص ہے جسے ایسے بے معنی سیر سپاٹے کے لئے فرصت نصیب نہیں۔ لیکن اس علم کے باوجود جب وہ ایک تیقّن آمیز اور پُر وثوق لہجے میں، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہاں کے سوا کسی اور جواب کی توقع ہی نہیں رکھتا، مجھے دعوتِ شرکت دیتا ہے تو مَیں اُس کا ساتھ دینے پر مجبور ہو جاتا ہوں، صرف اس لئے کہ کہیں میرا انکار اُس کے پندارِ دوستی کو مجروح کر کے اُسے کھسیانا نہ کر دے۔ اس کے علاوہ بختیار ہے بھی مزے کا آدمی۔ بالکل آزاد منش، تفکّراتِ دنیا سے بے بہرہ، ہمیشہ خوش باش، اُس کی صحبت تھکے ہوئے دماغوں کے لئے اچھی خاصی تفریح ہے۔

آج تعطیل کا دن تھا اور مَیں کل ہی سے اس فرصت کے وقت میں چند ضروری امور سرانجام دینے کے ارادے باندھ رہا تھا۔ کالج کا کئی روز کا کام یونہی رکھا تھا، چند خطوط بھی لکھنا تھے۔ چنانچہ ناشتے سے فارغ ہوتے ہی مَیں مطالعہ کی میز پر جا بیٹھا۔ لیکن میری قسمت کہ بیٹھتے ہی بختیار صاحب مرگِ ناگہاں کی طرح آنازل ہوتے۔ پہلے تو مَیں سخت گھبرایا کہ سب ارادے خاک میں مل گئے۔ لیکن آج بختیار کا طرزِ عمل قدرے سُدھرا ہوا تھا۔ معمولی علیک سلیک کے بعد وہ خلافِ معمول کُرسی پر بیٹھ گیا۔ "کہو بھائی کیسے ہو؟ مدّت سے تمہیں ملنے کا ارادہ کر رہا تھا۔"

مَیں نے بات ختم کرنے کے لئے جلدی سے جواب دیا۔ "اچھا ہوں"

آج مجھے بہت سا کام کرنا ہے۔"

"بس تم ہمیشہ کام ہی کا رونا روتے رہتے ہو۔ اُٹھو ذرا باہر چلیں۔ دیکھو تو کیسا اچھا دن ہے۔ ایسے وقت میں کام کرنا قدرت کی تحقیر کرنا ہے۔"

مَیں نے سٹ پٹا کر کہا۔" جہاں تمہارا جی چاہے جاؤ۔ لیکن خدا کے لئے مجھے ہمراہ نہ کھینچو۔ میرا بہت حرج ہوگا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ تمہاری ہمرکابی کرسکوں۔"

"سبحان اللہ، اپنی تفریح کو میری ہمرکابی کہتے ہو؟ اچھا یہ بات ہے تو مَیں یہاں سے نہیں ٹلنے کا۔"

اب تو حضرت پھسل پڑے۔

"اتنی دُور سے چل کر تمہارا دل بہلانے آتے ہیں پھر بھی تم سیدھے مُنہ بات نہیں کرتے۔ لو مَیں یہاں بیٹھا ہوں۔ دیکھوں تو کس طرح کام کرتے ہو۔"

مَیں بے اختیار ہنس پڑا۔"بختیار تم غضب کے بے پروا آدمی ہو"

"کچھ بھی ہو مَیں تمہیں ساتھ لئے بغیر نہ ہلوں گا۔"

الغرض آدھ گھنٹے کی ردّ و کد کے بعد میرا کمرہ مقفّل تھا اور مَیں اور بختیار موٹر میں بیٹھے چلے جا رہے تھے۔ کدھر کو؟ اس کا ہم دونوں میں سے کسی کو علم نہ تھا۔

لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے اور انہیں دیکھ دیکھ کر ہر لمحہ مجھے یہ تکلیف دہ احساس ہو رہا تھا کہ میں وقت ضائع کر رہا ہوں میں نے گھبرا کر کہا۔ "شہر سے باہر نکل چلو۔"

اُس نے موٹر کا رُخ بدل لیا۔ منٹو پارک کی نمائش ہم پہلے بھی دیکھ چکے تھے۔ اب پھر وہیں جا ٹھیرے۔ ایک گھنٹہ اِدھر اُدھر گھومنے میں گذارا۔ بختیار نے چند اشیاء بھی خریدیں۔ پھر قلعہ کے پاس سے ہوتے ہوئے راوی پر پہنچے اور وہاں سے شاہدرے۔ شاہدرے میں خاصی رونق تھی۔ ہماری طرح بہت سے کام چور وہاں جمع ہو رہے تھے۔ دعوتِ بصر و سماع کا سامان بافراط موجود تھا۔ سہ پہر کے آخر تک ہم اوقات کُشی میں مصروف رہے اور جب سُورج کی کرنیں ہلکی ہونے لگیں تو میں نے بختیار سے کہا کہ اب چلو۔ اُس نے واپسی پر پہلے سے بھی لمبا راستہ اختیار کیا اور خدا خُدا کر کے چھ گھنٹے کی لاحاصل آوارہ گردی کے بعد مجھے میری قیام گاہ پر چھوڑ کر اور اپنے اندازِ خاص میں مسکرا کر ہاتھ سے سلام کا اشارہ کرتے ہوئے وہ میری نظروں سے غائب ہو گیا۔

میں مضمحل و پریشان لیکن اطمینان کا سانس لے کر اپنے کمرے میں آرام کُرسی پر لیٹا ہوا تھا۔ آنکھیں کچھ بند تھیں کچھ کُھلی۔ سو تو نہیں رہا تھا۔ البتہ تمام دن کی کوفت دُور کرنے کے لئے زبردستی اپنے اُوپر غنودگی طاری

کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میرے کمرے کی بالائی منزل کے داہنی جانب سے ایک دھماکے کی آواز آئی جیسے بندوق چلنے سے پیدا ہوتی ہے۔ مَیں نے چنداں توجہ نہ کی لیکن کچھ عرصہ بعد بہت سی ملی جُلی آوازوں کا شور اور قدموں کے زور زور سے پڑنے کی چاپ سُنائی دی۔ مَیں سمجھا بلیرڈ یا کوئی اور کھیل کھیلا جا رہا ہے کیونکہ ہوٹل والوں نے بلیرڈ وغیرہ کا انتظام عین میرے کمرے کی سقف پر کر رکھا تھا۔ جس کی وجہ سے اکثر وہاں کا شور میرے سکوتِ تنہائی میں مخل ہوتا رہتا تھا۔ لیکن چند منٹ بعد وہ غل غپاڑہ اور زیادہ ہو گیا۔ لوگ ایک طرف سے دوسری طرف بھاگے جا رہے تھے۔ اب مَیں خاموش نہ رہ سکا۔ دل ہی دل میں کل ہوٹل والوں کو ہزاروں صلواتیں سناتے ہوئے مَیں نے بادل ناخواستہ گھنٹی بجائی۔ ملازم ہانپتا ہوا حاضر ہوا۔ اُس کی سانس پھُولی ہُوئی تھی اور چہرے کا رنگ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ مَیں نے کہا۔ "کیا بات ہے؟ یہ کیسا شور ہے؟"

"حضور . . . . . . باون نمبر میں . . . . "

"کیا ہوا باون نمبر میں؟"

"حضور ڈاکٹر سہیل کے کمرے میں سے گولی چلنے کی آواز آئی ہے۔ کمرہ اندر سے بند ہے اور کسی شخص کے کراہنے کی آواز آ رہی ہے۔"

"ڈاکٹر سہیل؟" مَیں تمام تکان بھُول گیا اور بے اختیار اُٹھ کر کمرے

سے بھاگا۔ زینے پر سے ہوتا ہوا باون نمبر کے سامنے جا پہنچا۔ لوگ واقعی جمع ہو رہے تھے اور کمرہ اندر سے غالباً مقفّل تھا۔ دروازہ توڑنے کی کوشش بے سود ثابت ہو چکی تھی۔ ہوٹل کا مینجر جسے گھبراہٹ اور تشویش کی شدّت سے پسینہ آ رہا تھا۔ کمرے کے عقب کی کھڑکی کا شیشہ کاٹ کر ہاتھ سے اندر کی چٹخنی کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اُس نے اشارے سے بُلایا۔ کہنے لگا۔ "معاملہ نازک معلوم ہوتا ہے۔ آپ ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ چلے جائیں اور کسی کو پولیس میں اطلاع کے لئے بھی بھیج دیجئے۔"

مَیں نے دو چار شخصوں کے سوا سب کو منتشر کر دیا۔ اور ہوٹل کے ملازم کو کوتوالی روانہ کیا۔ چٹخنی کھُلی اور ہم آہستگی سے کمرے کے اندر داخل ہو گئے .. .. میری نگاہوں نے جو منظرِ خونیں دیکھا اُس کی لرزہ انگیز یاد نقش فی الحجر کی طرح میرے دماغ میں ثبت ہو چکی ہے اور اب بھی یہ سطور لکھتے وقت اُس کے ہیبت ناک تصوّر سے میرے بدن میں سنسنی سی پیدا ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر سہیل فرش پر پڑا تھا۔ اس کا حسین و توانا جسم اور قیمتی ملبوس خاک و خوں میں لتھڑا ہوا تھا۔ اس کی کنپٹی سے فوّارہ خون جاری تھا۔ اور پستول جس سے رشتۂ جان منقطع کیا گیا تھا قریب ہی گرا پڑا تھا۔ جونہی میری نظر اُس پر پڑی مجھ پر ایک خوفناک کپکپی طاری ہو گئی۔ مَیں نے گھبرا کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ اُن کے چہرے زرد ہو رہے

تھے اور حلق سے آواز نہ نکلتی تھی۔ ہم آہستہ آہستہ آگے بڑھے ڈاکٹر کے جسم کو چھوا تو وہ سرد ہو چکا تھا۔ آثار سے ظاہر تھا کہ موت خودکشی سے واقع ہوئی ہے۔ بڑا آئینہ جس کے سامنے کھڑے ہو کر غالباً اُس نے ٹھیک مقام کا نشانہ باندھا ہو گا۔ میز پر رکھا تھا۔ کمرے کی سپید دیواریں، بستر کی چادر اور تمام فرش خون سے رنگین ہو رہا تھا۔ چھینٹے اُڑ اُڑ کر چھت تک پہنچ گئے تھے۔

ڈاکٹر سہیل تقریباً دو ہفتے سے اس ہوٹل میں مقیم تھا۔ یہ ایک نوجوان شخص تھا۔ دن کا بیشتر حصہ اپنے کمرے میں گذارتا تھا اور کبھی کبھی شام کو ٹہلنے یا سینما دیکھنے باہر جاتا تھا۔ لوگوں سے بہت کم ملتا تھا۔ مجھ سے دو، ایک مرتبہ گفتگو ہوئی تھی۔ بہت سنجیدہ آدمی معلوم ہوتا تھا۔ کہتا تھا صحت کی خرابی کے باعث تبدیل آب و ہوا کی غرض سے یہاں آیا ہوں۔

کمرے کی مہیب خاموشی کو جو ہمارے دلوں میں بے معنی سا خوف پیدا کر رہی تھی آخر منیجر کی آواز نے توڑا" میرا خیال ہے ڈاکٹر سہیل نے خودکشی کی ہے۔"

دوسرا ساتھی جو اسی ہوٹل کا مکین تھا کہنے لگا۔" حالات سے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن خودکشی کی کچھ وجہ ضرور ہو گی۔"

میں، کہ اب تک ایک خاص خیال کے ماتحت میز اور کمرے کی دیگر اشیاء کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا، بولا" ممکن ہے ڈاکٹر سہیل کوئی تحریر چھوڑ گئے ہوں۔ کیونکہ ایسے حادثے میں اکثر مرنے والا کچھ نہ کچھ لکھ کر چھوڑ جاتا ہے۔"

میرے اس خیال سے سب نے اتفاق کیا اور ہم میز پر چند بکھرے ہوئے کاغذوں کو اُٹھا اُٹھا کر پڑھنے لگے۔ لیکن اُن میں مختلف اخبارات کے پرچوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ اس کے بعد ہم ڈاکٹر سہیل کی جیبیں ٹٹولنے لگے۔ اور آخر اُس کے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک تہ کیا ہوا کاغذ نکلا یہ ایک لمبی تحریر تھی۔ جسے اُس نے زندگی کے آخری چند گھنٹوں میں سپردِ قلم کیا تھا۔ خواہ اُسے دستاویزِ محبّت کہہ لیجئے یا اعترافِ گناہ، اس کا ایک ایک لفظ درد و حسرت کی تصویر اور طوفانِ جذبات کا مرقع تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا اُسے پڑھنے کے بعد میرے دل و دماغ کی کیا کیفیت ہوئی بے ثباتیِ حیات اور سیلابِ جذبات کا، جس کی کوہ شکن روانی میں ہم تنکے کی طرح بہے چلے جا رہے ہیں۔ خیال کر کے میرا جی زندگی سے کھٹّا ہو گیا۔ میں نے بڑی دقّت سے اس مسودے کی نقل حاصل کی۔ جسے صراحتِ واقعات کی غرض سے من و عن ذیل میں درج کرتا ہوں۔

"سورج کچھ کچھ نمودار ہو چکا ہے۔ اُس کی نرم اور روپہلی کرنیں کمرے کی نیم وا کھڑکی سے اندر داخل ہو ہو کر مجھے بیداریِ سحر کا پیغام دے رہی ہیں۔ ہوٹل کے باقی حصّے میں ابھی تک نصف شب کا سا سکون طاری ہے غالباً لوگ اپنے اپنے بستروں میں مزے کی نیند سو رہے ہوں گے۔ آہ کتنا طویل عرصہ میں بھی ایسی پُرامن راتوں کے انتظار میں بسر کر چکا ہوں۔ مدّت

گذر گئی ہے۔ میرا دماغ آرام اور دل اطمینان کے مفہوم سے نا آشنا ہو گیا ہے
میرے پیشِ نظر کل کائنات پر اس وقت امن کی حکومت ہے۔ ہر جاندار اور
بے جان چیز فطرت کی نشہ آور لوریوں کے سحر سے خواب میں مدہوش ہے۔
لیکن اس وسیع و بسیط دنیا میں صرف میں ہی غم نصیب ہوں جس کی رُوح
قدرت کی فیاضیوں کے باوجود تشنہ کام ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ قدرت
کی دریا دلی میرے لئے بخل میں تبدیل ہو گئی ہے۔ میں اگرچہ راندۂ درگاہ ہوں
مگر کفرانِ نعمت کیوں کروں۔ فطرت نے اپنے انمول موتی میرے سامنے
بکھیرنے میں دریغ نہیں کیا۔ اُس نے دہن بستہ خزانوں کے مُنہ میرے
واسطے کھول دیئے۔ مگر میں نے آنکھ اُٹھا کر بھی اُن کی طرف نہ دیکھا۔ ان تمام
نعمتوں کو لتاڑتا ہوا مستقبل کی تاریکیوں سے بے نیاز ہو کر میں ذلّت و نکبت
کے اندھے کوئیں کی طرف بھاگتا گیا۔ ہر شے کی قدر اُسے کھو کر معلوم ہوتی
ہے۔ میرے پاس کیا نہیں تھا؟ قابلِ رشک صحت، دنیوی وجاہت،
دلوں میں گھر کرنے والے اخلاق، معصومیت اور سب سے بڑھ کر
اطمینانِ قلب۔ یہی چیزیں ہیں جو کمزور سے کمزور تیراک کو ساحلِ مراد
سے ہمکنار کر دیتی ہیں۔ لیکن ایک میں ہوں کہ جس نے آنکھیں بند کر کے
قدرت کے پاکیزہ عطیّوں کو نفس کی خواہشات کی عارضی سیرابی پر قربان
کر دیا۔ اب میں قلّاش ہوں، نہیں اس سے بھی بدتر، ایک مجرم ہوں جو گناہ

کے مسموم جراثیم کے باعث سماج کے لئے کسی متعدی مرض سے کم نہیں۔ حکومت اپنی غیر محدود قوتوں کے ساتھ سماج کو اس مرض سے پاک کرنے کے درپے ہو چکی ہے۔ اگر کسی ان دیکھی مصیبت یا کسی غیر متوقع واقعہ نے میرے ارادے میں تزلزل پیدا نہ کر دیا تو مجھے یقین ہے کہ آج میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔ شام کے وقت لارنس باغ کی بجائے میری رُوح اُس نامعلوم پُراسرار سرزمین کی سیر میں مصروف ہوگی جہاں ہم سب کو ایک نہ ایک دن پہنچنا ہے۔ اگرچہ ہر ایسے موقع کو جو ہمیں وہاں پُہنچانے کا کفیل ہو ہم بڑے شد و مد سے ٹالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

کسی اتفاقی حادثے کے متعلق عوام میں بہت کچھ مختلف افواہیں کھیل جاتی ہیں۔ جن سے حقیقت کو کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ میری موت یقیناً عوام میں ہزاروں وسوسوں اور بدگمانیوں کی محرک ہوگی۔ میں چاہتا ہوں کہ قبل اس کے کہ میرے ہاتھوں کی جنبش اور آنکھوں کی بصارت سلب ہو۔ چند سطور میں مجمل طور پر میں اپنی حیثیت حتی الامکان واضح کر دوں۔

"آج سے نو سال پہلے کا ذکر ہے۔ بعض دفعہ تو یوں معلوم ہوتا ہے۔ گویا کل کی بات ہے اور بعض اوقات میرا حافظہ ماضی کے دھندلے پردوں کو چیر کر اُس واقعہ کو خواب کی سی مبہم کیفیت میں لپٹا ہوا پاتا ہے۔ دُنیا کے عظیم الشان دریا پہاڑوں سے نکلتے وقت پانی کی معمولی باریک دھار سے

زیادہ نہیں ہوتے۔ وہاں اُن کی روانی کو مسدود کر دینا آسان ہے۔ لیکن میدان میں اُس کے وسیع پاٹ اور کف آلود فلک بوس لہروں کو دیکھ کر یہ خیال کرنا کہ اب بھی ہم اُسی سہولت سے اُنہیں روک سکتے ہیں حماقت ہے۔ انسانی زندگی کے اہم ترین اور مستقبل کو تہ و بالا کر دینے والے واقعات بھی ابتدا میں پانی کی باریک دھار سے زیادہ کمزور ہوتے ہیں لیکن مُدّت گزرنے نہیں پاتی کہ وہی دھار ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر بن جاتا ہے جس کی آغوش میں بڑے بڑے غواص موت کے گھاٹ اُتر جاتے ہیں۔ کون جانتا ہے کہ آج جس شغل کو ایک شخص محض تفریح اور چند لمحوں کی مسرت کے واسطے اختیار کر رہا ہے کل وہی اپنے ہیبت ناک اثرات سے اُس کی زندگی کا پانسہ بدل دیگا۔

ہاں میں کیا لکھ رہا تھا۔ اُف آج سے نو سال قبل کا قصّہ۔ عمر کا وہ حصّہ جب فطرت پہلے پہل انگڑائیاں لے کر بیدار ہوتی ہے۔ جب بہارِ زیست آرزوؤں کے شگوفوں سے لبریز ہوتی ہے۔ جب شجرِ حیات جذبات کی آبیاری سے ثمر دار ہوتا ہے اور جب زندگی کی ہر ناکامی کامیابی کا لباس پہن کر ایک وسیع سراب کا منظر پیشِ نظر کر دیتی ہے۔ ایسے آتشیں ایّام مجھ پر بھی گذر چکے ہیں۔ میں کیا کہوں میری سوئی ہوئی قسمت جاگ اُٹھی تھی یا میرا بختِ بیدار سو گیا تھا۔ دُنیا میری نگاہوں میں قوسِ قزح سے حسین اور

دامنِ کوہ سے زیادہ شاداب تھی۔ فضا مشکبار ہواؤں سے لدی ہوئی اور زمین گلہائے رنگارنگ سے لالہ زار بنی ہوئی تھی۔ یہ سب کچھ اُس تجلّی کا پرتو تھا۔ جس سے میرا سینہ فروزاں ہو رہا تھا۔ میرے قلب کی پُرسکون سطح کے اندر خاموش نغموں کا اِک جہان آباد تھا۔ اور میری روح غیر معلوم طور پر کسی مضراب کی تلاش میں آوارہ تھی جو اس ساز کو چھیڑ کر خوابیدہ نغموں میں ہلچل پیدا کر دے۔ آہ کیسے عجیب دن تھے۔ جو چشم زدن میں چھلاوے کی طرح غائب ہو گئے اور زہر سے زیادہ تلخ یاد میرے لئے چھوڑ گئے۔

"میں اُن دنوں طالب علم تھا اور کالج کی تعلیم میں میرا آخری سال تھا۔ اُسی سال مجھے موسمِ گرما مسوری میں بسر کرنے کا اتفاق ہوا۔ دشت نجد میں جس شرارے نے قیس عامری کی عقل و خرد کو دم بھر میں بھسم کیا، جس برقِ جمال نے ایران کی سرزمین میں فرہاد کی متاع صبر و شکیب کو جلا کر خاک کر دیا وہی شعلہ میری جانِ ناتواں کے لئے مسوری پہاڑ پر نمودار ہوا۔ میرا جسم اور میری رُوح دونوں اس غیر ذمہ دارانہ حالت میں تھے کہ ادنےٰ سی دعوتِ ہلاکت پر لبیک کہنے کو ہر وقت تیار ہو سکتے تھے۔ اس عالمِ کیف میں میرا زہرہ سے ملنا اور سنبھلے رہنا ایسا ہی تھا جیسے تنکے کو آگ میں رکھ کر جلنے سے روکنے کی بے سود کوشش کرنا۔ زہرہ میرے افقِ حیات پر ستارۂ صبح کی طرح نمودار ہوئی جس نے میرے حسیاتِ خفتہ میں تحرک

کی لہر دوڑا دی۔ یکایک مجھے یوں معلوم ہونے لگا کہ زہرہ گویا ایک پیکرِ مرمریں تھی جسے میرے ہاتھوں نے اپنے جذبات کی پذیرائی کے لئے پرستیدۂ خیال بنا کر تراشا تھا۔ اُس میں وہ تمام رعنائیاں جلوہ ریز تھیں، جن سے آج تک میرے خیال کی دُنیا منوّر رہی تھی۔ عورت جب عالمِ شباب میں قدم رکھتی ہے تو کائنات کی تمام رنگینیاں اُس کو اپنا مسکن بنا لیتی ہیں۔ اگر حُسن کے منتشر اجزا کو یکجا دیکھنے کے متمنّی ہو تو ایک جوان عورت تلاش کر و۔ پھُول کی نکہت، موسیقی کا ترنّم، شراب کا نشہ، شاعر کا تخیّل، کیا ہے جو اس میں نہیں ہوتا۔ عورت اور اُس پر شباب! شراب دو آتشہ ہے جس کی حرارت مینا کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ ایک سمندر ہے، جس کی طغیانی کا کوئی کنارہ نہیں۔ لیکن میں کہوں گا کہ حسن و لطافت کی کی ان تمام رعنائیوں کے ساتھ وہ ایسی ابتلا ہے جس کی تحریصِ ہلاکت کا دُنیا میں کوئی حریف نہیں ہو سکتا۔ کون ہے جو یہ کہہ سکے کہ وہ عورت کی محبّت میں انسان سے فرشتہ بن گیا؟ ہاں ہزاروں نہیں لاکھوں ایسے ہیں جن کے لئے ارتکابِ گناہ کی سب سے بڑی محرک عورت ہی ہوتی ہے انسانی جنگ و جدل کی تاریخ کی ورق گردانی کرو تو دیکھو گے کہ زمین پر نصف سے زیادہ خون عورت کی وجہ سے بہایا گیا ہے۔ کسی کافر حسینہ کا اپنی جادو بھری نگاہوں سے تمہیں دیکھ کر نمناک آنکھوں سے دعوتِ محبّت

دینا کیا نہیں ریزہ ریزہ کر دینے کے لئے کافی نہیں؟ اگر تم پتھر کی طرح جامد و ساکن نہیں تو یقیناً ان نگاہوں کی خاطر جان پر کھیل جانا معمولی بات سمجھو گے۔ قدرت نے اس بظاہر نحیف و زار ہستی میں وہ مقناطیسی قوّت بھر دی ہے کہ بسا اوقات اس کے ابرو کے اشارے اور لبوں کے تبسّم پر ہم اپنی جانیں کھو دیتے ہیں۔ اُس کی سحر کار محبّت کے زیرِ اثر ہم ہپناٹزم کے ادنےٰ معمول کی طرح اندھا دھند ایسے خوفناک کاموں میں کود پڑتے ہیں جن کا تصوّر حالتِ طبعی میں اعصاب میں تھرتھری پیدا کر دیتا ہے۔ دنیا اس جنون یا جذبے کو محبت کے نام سے پکارتی ہے۔ بعض کہتے ہیں محبت سلگتی ہوئی آگ ہے جو انسان کے اندر داخل ہو کر تپ دق کی طرح اُس کی ہڈیوں کو پگھلا دیتی ہے۔ ممکن ہے وہ اپنے خیال میں صحیح ہوں۔ مگر میرا عقیدہ ہے کہ محبّت سلگتی ہوئی آگ نہیں بھڑکتا ہوا شعلہ ہے جس کی زندگی اگرچہ مختصر مگر ہلاکت آفریں ہوتی ہے۔

"جب اوّل اوّل زہرہ مجھ سے مسوری میں ملی تو وہ موسمِ گرما کی رخصتیں گذارنے والدین کے ہمراہ آئی تھی۔ اُس کی عمر بمشکل سترہ سال ہوگی اور ابھی الہ آباد کے زنانہ اسکول میں پڑھتی تھی۔ میری اِس سے ملاقات ایک دوست کے مکان پر ہوئی جہاں وہ اور اس کے متعلقین دعوت میں شرکت کے لئے آئے تھے۔ میں اب بھی کہوں گا کہ زہرہ

حُسن وجمال کے لحاظ سے ہزاروں میں ایک تھی۔ دعوت سے قبل میرا اُس کے خاندان کے کل افراد سے تعارف کرایا گیا اور یوں میری اس کے گھر تک رسائی ہوگئی۔ ہم دونوں نوجوان تھے، طالب علم تھے، اس لئے چند دنوں میں بے تکلف ہو جانا کوئی عجیب بات نہ تھی۔ یہ بیان کرنا لاحاصل ہے کہ میں نے اس کے بعد ایک مہینہ اس کی صحبت میں کس سرور و انبساط کے ساتھ گذارا۔ میں نے پہلی مرتبہ محبّت کی اور اس قلیل مدت میں محبّت کی رنگینیوں سے خوب بہرہ اندوز ہوا۔ میں حتی الامکان اُس کے والدین کی دُوررس نگاہوں سے بچ کر ہی اُس سے ملا کرتا تھا۔ آہ وہ چوری چھپے کی ملاقاتیں شاید میں مرنے کے بعد بھی نہ بھول سکوں گا۔ مسوری میں ہمارا قیام عارضی تھا اور میں جانتا تھا کہ چند روز میں یہ لطف و مسرت کی صحبتیں مجھ سے چھن جائیں گی۔ ان لذّتوں سے کسی حرماں نصیب کی طرح یوں ہاتھ کھینچ لینا بھی مجھے گوارا نہ تھا۔ میں نے زہرہ سے مشورہ کر کے اُس کے والدین تک یہ پیغام پہنچایا کہ اگر وہ مجھے اپنی غلامی میں قبول کر لیں تو اس سے بڑھ کر میرے لئے اور کوئی فخر نہیں ہو سکتا۔ زہرہ کے ہمّت دلانے سے مجھے اپنی کامیابی کی اُمید ہو چلی تھی۔ مگر اُس کے والد کے جواب نے اُمید کو بہت حد تک یاس میں تبدیل کر دیا۔ اُن کا جواب نہ اقرار تھا اور نہ صاف انکار ہی تھا۔ اُنہوں نے کہا کہ زہرہ کو ابھی پڑھنا

ہے اور اس کی عمر بھی کچھ زیادہ نہیں اس لئے اس معاملہ میں چنداں عجلت کی ضرورت نہیں۔

ہر چند کہ یہ جواب قطعی مایوس کن نہ تھا مگر حقیقت حال سے مَیں جلد ہی آگاہ ہو گیا۔ دراصل زہرہ کے لئے کسی بہت بڑے رئیس کا پیغام آچکا تھا اور زہرہ کے والدین وعدہ بھی کر چکے تھے۔ مَیں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ زہرہ کو اس اندرونی نامہ وپیام کا علم تھا یا نہیں مگر جب پہلی مرتبہ مَیں نے اُس سے کہا کہ تمہارے والدین نے سیم و زر کی خیرہ کن چمک سے مرعوب ہو کر تمہیں کسی لکھ پتی کے محل کی زینت بنانے کا ارادہ کر لیا ہے اور مجھ نادار کی محبت کو ٹھکرا دیا گیا ہے۔ تو وہ اپنی حسین کشادہ آنکھوں کو نمناک بنا کر، جو خدا جانے نمِ محبت سے آلودہ تھیں یا نمِ مسرت سے بولی۔ مَیں تمہیں سچے دل سے پیار کرتی ہوں۔ میرے ماں باپ کو میرے دل پر کوئی اختیار نہیں۔ وہ میرے جسم کو زبردستی دوسرے کے حوالے کر سکتے ہیں، مگر جبتک مَیں زندہ ہوں، یہ دل ہمیشہ تمہارا رہے گا۔

اللہ اللہ کیسے پیارے اور کیسے امید افزا الفاظ تھے۔ جب زہرہ کے دل میں میرا خیال اس شدت سے جاگزیں ہو چکا تھا تو اس عارضی مفارقت کا مجھے کوئی غم نہ ہونا چاہئے تھا۔ کیا ان افسوس ناک واقعات کا جو بعد میں خود بخود پیدا ہوتے چلے گئے خفیف سے خفیف دھندلا سا

خاک بھی میرے ذہن میں اس وقت موجود تھا؟ کیا اس کام کا جس کی تکمیل ستم ظریف قدرت نے میرے ہاتھوں کرائی ادنےٰ سا خیال بھی میرے دل میں موجود تھا؟ میں ان سوالات کا جواب یقیناً نفی میں دونگا۔ جس سے مجھے اپنی برأت نہیں بلکہ اظہارِ حقیقت منظور ہے۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ عموماً وہ زبردست گناہ اور خوفناک جرائم جو اپنے نتائج کے لحاظ سے انسانی زندگی کو بالکل دو حصّوں میں کاٹ کر ماضی و حال کو ایک دوسرے سے قطعاً بے تعلق کر دیتے ہیں۔ اور جن کے مہلک اثرات ہماری زندگی کو ایک جدید شاہراہ پر ڈال دیتے ہیں سابقہ غور و فکر کا نتیجہ نہیں ہوتے۔ ایسے کایا پلٹ کر دینے والے خون آشام لمحات قدرت کے گوناگوں پُر اسرار حالات کے ماتحت اپنی بے پناہ قوّتِ تحریص کے ساتھ یک لخت اس تندی سے رونما ہوتے ہیں کہ ہماری قوّتِ مدافعت فوراً ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ ایسا ہی ایک جانگداز لمحہ مجھے بھی اپنے سفرِ حیات میں پیش آیا۔ اور صد افسوس کہ نفس کے ہاتھوں مغلوب ہو کر میں نے جلد ہی شکست خوردہ فریق کی حیثیت اختیار کر لی۔

تعطیلات کے اختتام پر زہرہ واپس الہ آباد چلی گئی اور میں بمبئی آگیا۔ مگر دل کا زخم جو محبّت کی اوّلیں ناکامی نے پیدا کیا بہت گہرا تھا۔ ابتدائی زندگی کے نقوش خواہ مسرت کے ہوں یا ملال کے ہمیشہ

گہرے ہوتے ہیں۔ اگر مَیں چاہتا تو زہرہ کے والد کے ان الفاظ پر جو اُنہوں نے میری التجا کے جواب میں کہے تھے اپنے آپ کو فریبِ نفس میں مبتلا کئے رکھتا۔ مگر اس کے بین السّطور معانی مجھ پر بخوبی روشن ہو گئے تھے۔ آس بھی تو صرف زہرہ پر کہ شاید اُسے رحم آجائے اور وہ اپنے عہدِ مودّت کو نبھائے۔ مگر جب میرے پے در پے خطوط کا اُس نے جواب تک نہ دیا تو یہ آس بھی ٹوٹ گئی۔ وقت کی روانی ہر شے کو اپنے ساتھ بہائے جاتی ہے۔ غم و شادی کے جذبات بھی جو وقت کی زنجیر کے ساتھ ناقابلِ انفکاک طریق سے وابستہ ہیں وقت گذرنے پر فنا ہو جاتے ہیں۔ میرے شوق کی آگ آہستہ آہستہ مدھم ہونے لگی۔ جذبۂ عشق میں پہلی سی جدّت باقی نہ رہی۔ حتےٰ کہ مَیں فارغ التحصیل ہو کر دنیوی کاروبار میں پھنس گیا۔

”اس واقعہ کو آٹھ سال گذر جاتے ہیں۔ مَیں کسبِ معاش کی اُلجھنوں میں مصروف ہو کر سب کچھ فراموش کر بیٹھا تھا کہ اچانک مجھے روزگار کے سلسلہ میں کراچی جانے کا اتفاق ہوا۔ کراچی پہنچے مجھے ایک ہفتہ ہوا تھا شام کو یونہی گھومنے کے لئے مَیں بازار کی طرف نکلا۔ راستے میں کچھ خریدنے کا خیال آگیا۔ مَیں ایک دُکان کے اندر داخل ہوا ہی تھا کہ سب سے زیادہ جاذبِ توجہ چیز جو سامنے آئی وہ ایک خاتون تھی جو دُکاندار سے باتوں میں

مصروف تھی۔ پاؤں کی آہٹ سُن کر دُکاندار میری طرف متوجہ ہوا اور ساتھ ہی اُس خاتون نے مُنہ پھیرا۔ میں نے دیکھا کہ بیش قیمت ملبوس اور نفیس ترین زیور میں آراستہ زہرہ کھڑی تھی۔ وہی چکاچوند کر دینے والا حُسن، وہی قیامت نما شباب، وہی ہوشربا کشیدہ قامتی، غرضکہ وہی مسوری والی زہرہ تھی۔ جس طرح سورج کی اولین کرنیں سوتی دُنیا میں کھلبلی مچا کر جاندار و بے جان اشیاء میں حیاتِ تازہ کی لہر دوڑا دیتی ہیں بالکل اسی طرح زہرہ کی اس اتفاقیہ ملاقات نے میرے جذبات و احساسات کو جنہیں مَیں خوابیدہ نہیں مردہ سمجھ چکا تھا، اپنی معجز نمائی سے پھر زندہ کر دیا۔ ایک لمحہ کے اندر مَیں پھر اسی دُنیا میں پہنچ گیا۔ میرا سینہ اُن ہی آرزوؤں اُن ہی بے تابیوں کا محشرستان بن گیا۔ جوہری کی دکان میں تو زہرہ سے چند منٹ ہی گفتگو ہو سکی جس سے اُس کی جائے سکونت کا پتہ ملنے کے علاوہ صرف اتنا معلوم ہوا کہ وہ اب ازدواجی زندگی بسر کر رہی ہے۔ اگلے روز مَیں اس کے مکان پر پہنچا۔ مکان کا محل وقوع اور شاندار عمارت ظاہر کر رہے تھے کہ اس کے مکین امیرانہ زندگی کے مالک ہیں۔ مَیں نے پہلی مرتبہ وہاں اس خوش نصیب شخص کو دیکھا جس کو قسمت نے زہرہ ایسی نایاب نعمت بخشی تھی! کامران، یہی اُس شخص کا نام تھا، ایک بلند قامت خوب رُو ہنس مکھ نوجوان تھا۔ زہرہ نے بہت تپاک سے مجھے پیش کرتے ہوئے سنجیدہ الفاظ میں تعارف کرایا جس

پر اُس نے بہت مسرت کا اظہار کیا۔ آہ بدنصیب کامران! اُسے اپنی کامرانی کی بہت زیادہ قیمت ادا کرنی پڑی۔

"قوانینِ اخلاق سے کون واقف نہیں مگر ابتلا کا مقابلہ کرنے کے لئے اخلاقیات کا علم ہی کافی نہیں۔ وہاں تو فولاد کے اعصاب کی ضرورت ہے۔ زہرہ سے مل کر مَیں ایک خطرناک مخمصہ میں پھنس گیا۔ کیا ایک متاہل عورت سے محبت کرنا جائز ہے؟ میرے ضمیر نے جس میں ابھی تک قوتِ مدافعت موجود تھی لعنت کی آواز بلند کی۔ وہ کہتا تھا بس ان حدود سے تجاوز کرنا خدا اور بندوں کے نزدیک بُرا ہے۔ ایک ہفتہ میرے اندر نیکی اور بدی کی خوفناک کشمکش جاری رہی۔ مَیں نے رضا و رغبت کے خلاف سخت جدّ و جہد کی۔ مَیں اپنے آپ کو آزمائش سے بچاتا رہا۔ مَیں نے فرصت کے اوقات کو مختلف کاموں سے پُر کر دیا کہ مبادا فارغ بیکار رہ کر گناہ کی دلفریب و دلکش ترغیب کا شکار ہو جاؤں۔ لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ کسی چیز کو یاد رکھنے کا سب سے آسان طریقہ یہی ہے کہ اُسے بھول جانے کی کوشش کی جائے۔ میری مصنوعی و غیر مصنوعی مصروفیت کے کل اوقات میں زہرہ کا خیال میری روح کی عمیق ترین گہرائیوں سے شعلے کی طرح اُٹھ اُٹھ کر صبر و اجتناب کی تمام کوششوں کو جلا رہا تھا۔ آخر میری بودی کوششیں سیلاب خوردہ دیوار کی طرح جذبات کے اس تیز و تند طوفان کے سامنے مسمار ہو کر رہ گئیں۔

اب مَیں نے اپنے آپ کو دھوکا دینا شروع کیا۔ مَیں نے سوچا کہ اگر چند گھڑی کے لیے زہرہ سے مل آؤں تو اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ وہاں کوئی جال تو بچھا ہی نہیں رکھا کہ مَیں پہنچتے ہی گرفتار ہو جاؤں گا۔ مجھے اپنا مزاج مضبوط کرنا چاہیئے۔ کہ ایسی ادنےٰ ادنےٰ باتوں پر قابو پا سکوں۔ علاوہ ازیں اب وہ ایک غیر شخص کی بیوی ہونے کی حیثیت سے بہت سی اہم ذمہ داریوں کی مالک بھی ہے۔ مجھے اپنی گفتگو اور دیگر حرکات میں سخت محتاط رہنا چاہیئے۔ ایسے ہی اور بہت سے خیالات سوچ کر اور لمبی چوڑی تاویلیں کر کے مَیں اُس کے ہاں پہنچ ہی گیا۔ سمجھ لو کہ اب میری داستان کا خونیں باب شروع ہو گیا۔ کاش کوئی غیبی طاقت اُس وقت میری آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹا کر مجھے اصلیت کا چہرہ دکھا دیتی۔ کوئی ندا میرے کانوں میں آتی اور حقیقت سے آگاہ کر جاتی۔ میں گرتا گرتا سنبھل جاتا اور اے کاش موت کا آخری وار ہی اُس وقت میرا خاتمہ کر دیتا۔

"عورت میں استقلال کا مادہ بہت زیادہ ہے۔ وہ چاہے تو مجسّم نیکی بن کر ہر آزمائش کا مضبوطی سے مقابلہ کر سکتی ہے وہ اپنے آپ کو کُل آفات سے محفوظ رکھ سکتی ہے لیکن اپنی زندگی کی اوّلیں محبّت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ اگر اُس کی پُر امن زندگی میں اُس کا سب سے پہلا چاہنے والا، جس سے وہ کبھی اظہارِ محبت کر چکی ہے، پھر نمودار ہو جائے تو یقین جانو وہ

سب بندشوں سے آزاد ہو کر اُس کی تابشِ نگاہ کے سامنے پھر قطرۂ شبنم کی طرح پگھل جائیگی۔ زہرہ کی زندگی ہر لحاظ سے مکمل تھی۔ میں اس میں دیمک بن کر داخل ہوا اور زیادہ وقت نہ گذرنے پایا تھا کہ تکمیلِ حیات کا وہی خولصورت نمونہ کرم خوردہ ہو گیا۔ میں اس زمانے کی تفصیلات میں نہ جاؤنگا۔ میں نہایت سُرعت سے انجام کی طرف آرہا ہوں۔ زہرہ سے ملنا تھا کہ میرے جذبات لہریں لینے لگے۔ دبی ہوئی چنگاریاں شعلے بن بن کر بھڑکنے لگیں۔ زہرہ سے میں نے دیوانہ وار محبت شروع کی جس کا جواب اُس نے بھی دیوانگی سے دیا۔ بس پھر کیا تھا کامران میری آنکھ میں خار بن کر کھٹکنے لگا۔ میں اسے غاصب سمجھتا تھا۔ منزلِ کامرانی تک پہنچنے کے لئے اس سنگِ راہ کا ہٹا دینا ضروری تھا۔ محبت اور جنگ میں سب طریقے مستحسن ہیں۔ میں اُس کا فیصلہ کرنے پر تُل گیا۔ زہرہ پر تو گویا میں نے جادو کر رکھا تھا۔ وہ ایک معمول کی طرح میری ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور تھی۔ انسان سے شیطان بنتے دیر نہیں لگتی۔ جب میں نے اُس پر اپنا ارادہ ظاہر کیا تو پہلے تو وہ عملِ جراحی کے مریض کی طرح جو کلوروفارم کی تیز بُو کی تاب نہ لا کر شروع شروع میں سخت بےچینی کا اظہار کرتا ہے، بہت گھبرائی۔ مگر نشہ قوی ہو جانے پر کلیتہً میرے اختیار میں تھی محبت انسان کو اندھا اور بہرہ بنا دیتی ہے۔ نہ وہ کچھ دیکھتا ہے۔ اور نہ سُنتا ہے۔ آخر کئی روز کی چھان بین کے بعد میں نے وہ چیز حاصل

کر ہی لی جس کی مجھے مدّت سے تلاش تھی۔ یہ ایک مہلک زہر تھا جو نہایت خفیف مقدار میں انسانی زندگی کا خاتمہ کر سکتا تھا لیکن مسموم شخص پر زہر خوری کا گمان نہیں ہو سکتا تھا۔ ہماری باہمی سازش سے کامراں کو زہر دیا گیا اور چند گھڑی کے اندر وہ مر گیا۔

کامراں کی ناگہانی موت نے شہر میں ہیجان پیدا کر دیا مگر ہم نے یہ کہہ کر کہ حرکتِ قلب کے یکایک بند ہو جانے سے ایسا حادثہ پیش آیا ہے اپنے نزدیک گویا سب کی تسلّی کر دی۔ اب زہرہ آزاد تھی اور میں کھلے بندوں اس سے مل سکتا تھا لیکن جب دشمن درمیان سے اُٹھ گیا تو خود میرے ہی اندر اُس کا ایک دوست پیدا ہو گیا۔ میرا اک ایسا دشمن جس سے مجھے کہیں پناہ نہ ملتی تھی۔ میری حالت عجیب ہو گئی۔ مَیں نے چاروں طرف دیکھا۔ دُنیا ایک سیاہ سایہ کی طرح لپٹی ہوئی نظر آتی تھی اور عجیب الخلقت کالی کالی منحوس صورتیں اپنے لمبے لمبے دانت اور خُونی آنکھیں نکال نکال کر اور ہاتھ بڑھا بڑھا کر میرا گوشت نوچ لینا چاہتی تھیں۔ آتشِ جہنّم کے لال لال شعلے دس دس گز بلند ہو کر ہوا کے جھونکوں سے میری طرف بڑھ رہے تھے کہ مجھے جلا کر خاک سیاہ کر دیں۔ مَیں تابِ برداشت نہ لا کر اس ہیبت ناک نظارے سے تھرّا گیا۔ میرا کیا حشر ہو گا؟ میری زندگی کیونکر کٹے گی؟ مَیں نے اپنی خوشی کے لئے دوسرے کی خوشیوں کا خون کیا تھا۔ وہ خُون اب میری گردن پر

تھا۔ مجھے نجات کی کوئی اُمید نہ رہی۔ ہمدردی کی کہیں سے بھی توقع نہ تھی۔ اس بے چارگی کے عالم میں چند ضروریات ہمراہ لے کر ایک رات میں چپکے سے کراچی سے بھاگ گیا اُس وقت سے لے کر آج تک میں خانہ بدوش ہوں۔ آج کہیں اور کل کہیں۔ لیکن میرے کان ہمیشہ کراچی کی جانب لگے رہے۔ زہرہ میرے لئے رُسوا ہوئی۔ ارتکابِ گناہ میں میرے ساتھ شریک ہوئی لیکن میں نے اُسے شکوک و شبہات کا ہدف بنا کر تنہا چھوڑ دیا۔ عورت جب محبت کرتی ہے تو اپنے چاہنے والے کے سامنے جان و دل قربان کر کے رکھ دیتی ہے۔ لیکن اُس کی محبّت ذرا ٹھکرا دو پھر دیکھو وہ کیونکر بھوکی شیرنی اور بپھری ہوئی ناگن کی طرح خوفناک ہو جاتی ہے۔ اِسے محبّت کا انتقام کہتے ہیں۔

زہرہ نے جب دیکھا کہ میں نے اُسے خراب کر کے، عرش سے فرش پر پھینک کر، دُنیا کے سامنے عُریاں ہدفِ ملامت بنا کر تنہا چھوڑ دیا تو وہ بھڑک اُٹھی، ایک ایسے انتشارِ قلب کے ساتھ جس میں اپنے خراب کرنے والے کی تباہی کا عزم پنہاں تھا۔ اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ پولیس کے سامنے جا کر کامران کے قتل کا اعتراف کر لیا اُس کے اس طرزِ عمل سے چاروں طرف سنسنی پھیل گئی۔ اخبارات میں طوفان بپا ہو گیا۔ اُس کے بیان کو پڑھ کر جو شروع سے اخیر تک

تمام شرمناک واقعات پر مشتمل تھا لوگ انصاف انصاف پکارنے لگے۔ اور ساتھ ہی حیرت واستعجاب سے اُس عورت کو دیکھتے تھے جو اپنے نادرالوجود حُسن و جمال کی رعنائیوں کے باوجود شیطان کی خالہ ثابت ہوئی تھی حکومت نے میری گرفتاری کا انعام مقرر کر رکھا ہے۔ پولیس شکاری کُتّوں کی طرح میرا کھوج نکالنے میں مصروف ہے۔ پہلے تو مَیں نے چاہا کہ خود بخود جا کر اپنے آپ کو اُن کے حوالے کر دوں۔ مَیں موت سے نہیں ڈرتا مگر موت کے انتظار میں ایڑیاں کون رگڑے؟ عدالت کے سامنے ایک جمّ غفیر کے رُوبرو اپنے جُرم کا اعتراف کرنا اگرچہ میرے نفس کے رہے سہے غرور کو تو ضرور فنا کر دے گا مگر پھانسی پر لٹک کر مرنا مجھے پسند نہیں۔ مَیں ابھی کیوں نہ اپنا خاتمہ کر لوں؟"

مَیں یہ المناک بیان پڑھ چکا تو خوف و تاسّف کی شدّت سے بدن لرزنے لگا۔ کاغذ سرک کر میرے ہاتھ سے زمین پر گر گیا اور وہ خوفناک الفاظ جنہیں میں ہمیشہ بھول جانے کی کوشش کرتا ہوں لیکن جو بار بار یاد آ کر مجھے ایک غیر فانی صداقت سے آگاہ کر جاتے ہیں میرے کانوں میں گونجنے لگے۔

گناہ کی مزدوری موت ہے۔

حیاتِ تازہ

"تم بار بار کہتے ہو کہ خارجی دُنیا میرے لئے ختم ہو چکی ہے۔ آخر اس کا مطلب کیا ہے؟"

"اس کا مطلب؟ نہایت صاف، واضح اور بیّن۔"

"یعنی؟"

"یعنی یہ کہ خارجی زندگی کے مظاہر اپنے اندر میرے لئے کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتے۔ سالہا سال کی تیز و تُند کشمکشِ حیات نے میرے دل و دماغ کو وہ کیفیّت بخش دی ہے کہ بیرونی دُنیا کا مدّ و جزر اُس پر قطعاً اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ اور میں جو کسی زمانے میں زندگی کے ہر نشیب و فراز سے لرزہ بر اندام ہو جاتا تھا۔ اب ایک ایسے مطمئن قلب کا مالک ہوں کہ زمین کی بُنیادوں کو ہلا دینے والے زلزلے بھی اس میں رخنہ نہیں ڈال سکتے۔"

"سکونِ یاس اسی کیفیّت کا نام ہے۔"

"تم اسے سکونِ یاس کہتے ہو؟ حالانکہ امید و رجا کے ولولہ انگیز

جوشِ مسرّت کا احساس ہی مجھے آج ہوا ہے۔"

"تو کیا تم اشیاء کی خارجی حقیقت سے انکار کرتے ہو؟"

"میں اشیاء کی خارجی حقیقت سے کیونکر انکار کر سکتا ہوں لیکن اُن کی عظمت و اہمیّت کا معیار سراسر مختلف ہے۔ تم خارجی دُنیا اور اُس کے مختلف مظاہر کو رنج و اندوہ اور عیش و مسرت کا سبب سمجھ کر اپنے آپ کو اُن مظاہر کا غلام اور اپنے نفس کو اُن کا تابع کر لیتے ہو حالانکہ میرے نزدیک زندگی کی اوّلین شعاع نفس سے پھُوٹتی ہے اور خارجی دُنیا اُسی شعاع سے حرارتِ حیات حاصل کرتی ہے تم سمجھتے ہو کہ ہماری زندگی کی طاقت اور قوّت کا مرکز وہ چیزیں ہیں جنہیں ہم مس کر سکتے ہیں، دیکھ سکتے ہیں، چکھ سکتے ہیں، یا سُن سکتے ہیں حالانکہ میں حواس کی طاقتوں کو اس عظیم الشان طاقت کا جو نفسِ انسانی کو میسّر ہے ایک ادنےٰ کرشمہ سمجھتا ہوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ زندگی کی رو اندر سے باہر کی طرف جاتی ہے باہر سے اندر کی طرف نہیں آتی۔ خارجی زندگی باطنی زندگی کا عکس ہے اور ہماری خارجی زندگی کے مظاہر محض اضافی قیمت رکھتے ہیں۔"

شہید اپنے دُبلے پتلے جسم اور ذہین و شگفتہ چہرے کے ساتھ، میرے سامنے آرام کرسی پر دراز، اپنے مخصوص انداز میں ایک ہاتھ کو

دوسرے ہاتھ سے دبا دبا کر، اور اپنی سُرمگیں آنکھوں کو جنہوں نے اُس کے چہرے کے دیگر نقوش کے ساتھ مل کر سحر آسا جاذبیّت پیدا کر دی تھی، میری آنکھوں میں گاڑ گاڑ کر اپنے دلفریب طرزِ تکلّم میں گفتگو کر رہا تھا۔ اُس کا پُورا نام امجد حسین شہیدؔ تھا اور میرے اس کے دوستانہ مراسم اُس وقت سے قائم تھے جب ہم حصولِ تعلیم کے لئے نئے نئے لاہور میں وارد ہوئے تھے اور کالج کے ہوسٹل میں اقامت اختیار کی تھی اتفاق سے مَیں اور وہ ایک ہی روز کالج میں داخل ہوئے اور حاضری کے رجسٹر میں بھی اُس کا نام متأ میرے بعد درج کیا گیا۔ مَیں وسطی اور وہ مشرقی پنجاب کا باشندہ تھا۔ وہ کسی مالدار آدمی کا بیٹا نہ تھا۔ اگرچہ اس کے والد مرفہ الحال طبقے کے بزرگ ضرور تھے۔ اور خود شہیدؔ ایسے عادات و اطوار کا انسان تھا کہ اُس کی طرزِ زندگی سے ہر شخص یہی اندازہ لگانے پر مجبور ہوتا کہ وہ کسی بہت بڑے رئیس کا لڑکا ہے۔ اُس کی خودداری جو بعض اوقات تکبّر کی حد تک پہنچ جاتی تھی اُس کے مزاج کا ایک ایسا نمایاں پہلو تھا کہ اُس سے مختصر سی شناسائی رکھنے والے لوگ بھی اُس کے اس رنگِ طبیعت سے بخوبی واقف تھے۔ وہ اکثر ہنس کر کہا کرتا تھا کہ "میں ایک گدائے متکبّر ہوں جو خدا کے سامنے بھی سوال کی نیّت سے جانا گوارا نہیں کرتا۔"

کبھی ایسا نہ ہوا تھا کہ اُس نے دوستوں کے حقوق ادا کرنے میں بخل یا تساہل سے کام لیا ہو۔ لیکن بسا اوقات ایسا ہوا کہ اُس کے مفاد دوسروں کی بے اعتنائی اور بے توجہی سے تلف ہو گئے۔ مگر اُس کی زبان پر حرفِ شکایت نہ آیا۔ کالج میں کئی طلبہ ایسے تھے جنہوں نے اپنے اخراجات بہت وسیع کر رکھے تھے اور اُنہیں ہر ماہ گھر سے کافی رقم منگانا پڑتی تھی۔ شہید کے ذرائع بہت محدود تھے، مگر وہ اس خوش اسلوبی سے خرچ کرنے کا عادی تھا کہ بظاہر لوگوں کو یہی معلوم ہوتا کہ وہ حد درجہ امیرانہ زندگی بسر کر رہا ہے۔ وہ سربلند و گردن کشاں رہنے کا خوگر تھا اور میں نے اُس زمانے میں اکثر لوگوں کو کہتے سُنا کہ شہید رعونت کا مجسمہ ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُس کی سرد مہری، رعونت نما خودداری اور بے نیاز و مستغنی طبیعت ایک ظاہری لباس تھا جس کے اندر وہ رقیق و گداز قلب، متبسم و شگفتہ دماغ اور محبوب و محبت پاش روح چھپائے ہوئے تھا۔ وہ دوست نواز ہی نہیں بلکہ دوست پرست انسان تھا۔ دوستوں کے خطوط کو حرزِ جاں بنانے کا عادی تو نہ تھا۔ لیکن اُنہیں کھولنے سے پہلے چُوم ضرور لیا کرتا تھا۔ اُس کے نام کے ساتھ تخلص ابتدا سے موجود تھا لیکن شعر بہت کم کہتا تھا۔ کالج کے چہار سالہ زمانۂ تعلیم میں اُس نے

بمشکل آٹھ دس مرتبہ نظم لکھی ہوگی۔ اُس کا ذوقِ ادب نہایت پاکیزہ اور مذاقِ شعر بہت بلند تھا۔ اصنافِ سخن میں وہ صرف تغزل کا شیدا تھا، اور اُس کا خیال تھا کہ جس حُسن و خوبی سے ہم اپنے جذباتِ محبّت کو غزل میں ظاہر کر سکتے ہیں شعر کی کسی دیگر صنف میں ممکن نہیں اور عشق ہی چونکہ کائنات کی روح و رواں اور جذباتِ انسانی میں سب سے قوی، سب سے عمیق اور سب سے رنگین جذبہ ہے اس لئے وہی شاعری کا صحیح و موزوں موضوع بننے کے قابل ہے۔

شہید کی ایک اور خصوصیت بھی تھی اُسے جس قدر نفرت مرگِ انبوہ میں شریک ہونے سے تھی شاید ہی کسی انسان کو رہی ہو۔ اس کا دائرہ عمل بہت محدود تھا۔ کالج اور ہوسٹل کے حدود سے باہر جو وسیع ہنگامۂ زندگی برپا تھا اُس سے کسی طالب علم کو دلچسپی نہ تھی۔ ہماری دوستیاں اور دشمنیاں، ہماری عداوتیں اور رقابتیں، ہماری حریفانہ چپقلشیں اور دوستانہ مروّتیں غرضکہ ہمارا مرنا جینا کالج اور ہوسٹل کی دیواروں کے اندر ہی اندر تھا۔ لیکن اس مختصر اور محدود زندگی میں بھی شہید نے اپنے لئے ایک الگ روش اختیار کر رکھی تھی۔ جسے عامیانہ و سوقیانہ مذاق سے اتنا ہی بُعد تھا جتنا اُس کی زبان کو غلیظ و غیر مہذب الفاظ سے۔ لباس ہو یا طرزِ کلام، کمرے کی آرائش کا سوال ہو یا انداز نشست و

بہرحال وہ عام رنگ میں رنگ جانے کو ہمیشہ اخلاقی کمزوری سے تعبیر کرتا تھا۔ وہ تعجب و تاسف سے اُن لوگوں کو دیکھتا تھا جو کانِ نمک میں جاکر خود بھی نمک بن جاتے ہیں۔ اُس کا خیال تھا کہ ہر شخص علیحدہ انفرادیّت کا مالک ہے اور نئے تجربات کے ساتھ ساتھ اُس انفرادیّت کی تربیت و تکمیل ہر شخص کا مقدس فرض ہے۔ دوسرے کی شخصیت میں اپنی شخصیّت کو مدغم کر دینا، دوسرے کی آواز میں اپنی آواز کو گم کر دینا یا دوسرے کی تقلید میں اپنی راہ کو ترک کر دینا عشق کی دُنیا میں جائز ہو تو ہو لیکن روزمرّہ زندگی میں اُسے یہ طرزِ عمل کسی صورت گوارا نہ تھا۔

وہ دوستوں سے ہمیشہ اُردو میں خط و کتابت کرتا تھا۔ اگرچہ انگریزی تحریر و تقریر میں اُسے قابلِ رشک ملکہ حاصل تھا۔ اُردو میں گفتگو کرتے وقت اُس کی زبان سے انگریزی لفظ نکلنا ناممکن تھا۔ اور انگریزی میں ہم کلام ہوتے وقت عام ہندوستانیوں کی طرح اُردو اور انگریزی کی ملی جلی کھچڑی پکانا وہ لغویت خیال کرتا تھا۔ اس کے کمرے کے در و دیوار تصاویر کی زیب و زینت سے معرّا تھے۔ اور اس محرومی کی وجہ حسرت یہ تھی کہ کمروں کو تصویروں سے آراستہ کرنے کا شوق دارالاقامہ میں جنون کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ اور اکثر طلبہ سگرٹ کی ڈبیوں میں سے تصویریں نکال نکال کر دیواروں پر آویزاں کرنے سے گریز نہ کرتے تھے

اُس کا معمول تھا کہ شام کو پانچ سات میل پیدل سیر کو جانا اور باہر جاتے وقت ہمیشہ لکڑی ہاتھ میں لے کر نکلتا تھا کچھ عرصہ بعد اُس کی سُرخ ٹوپی اور لکڑی اُس کی شخصیت کے ایسے ضروری اور ناقابلِ انفکاک لوازم بن گئے تھے کہ میں نے بعض لوگوں کو کہتے سُنا کہ شہید کو تصوّر میں لانا درحالیکہ اُس کے سر پر سُرخ ٹوپی اور ہاتھ میں لکڑی نہ ہو ناممکن ہے۔ بال بنا کر ننگے سر کسی شارع عام پر نکلنے سے اُسے سخت نفرت تھی اور وہ اُن طلبہ کو تکلیف دہ حیرت سے دیکھتا تھا جو گھنٹوں کی عرق ریزی کے بعد بالوں کو حد درجہ احتیاط سے آراستہ کر کے بازاروں اور کوچوں میں ننگے سر مارے مارے پھرا کرتے تھے۔ اُس کا قول تھا کہ "ہندوستان میں جہاں چاقو پر بھی سرکاری لائسنس عائد ہے آزاد ممالک کی مردانہ صفات کا پیدا ہونا محال ہے۔ لیکن یہ کیا قیامت ہے کہ ہم روغن و عطر سے بالوں کو معطر کر کے اور اُنہیں خاص دلآویز انداز میں سنوار کر اک شانِ نسائیت پیدا کر کے نمائش حسن کرتے پھریں۔"

ایک روز ہم دونوں انارکلی بازار میں سے گذر رہے تھے کہ ہم نے چند نوجوانوں کو ایک فوٹوگرافر کی دکان پر جمع دیکھا۔ ہم بھی ٹھہر گئے۔ فوٹوگرافر نے دکان کے باہر چند چوکھٹوں میں چھوٹی چھوٹی تصویریں جن کی تعداد بیس چالیس کے قریب تھی، چسپاں کر رکھی تھیں۔ ہم نے ان تصویروں میں اپنے بہت سے ہم سبق و ہم مکتب

دوستوں کو بھی پہچانا۔ بات یہ تھی کہ فوٹوگرافر نے اشتہار دے رکھا تھا کہ وہ صرف آٹھ آنے میں چار مختلف انداز کی تصویریں اُتار دیتا ہے اور اس اشتہاری دعوت کو لبیک کہنے کے لئے صبح سے شام تک بیسیوں طلبہ وہاں موجود رہتے تھے جب ہم دُکان سے کچھ دُور نکل آئے تو شہید نے زہر خند ہو کر کہا "میں حیران ہوں ان لوگوں کو کب عقل آئیگی۔ فرسٹ ایر کے طلبہ کا تو خیر کیا ذکر ہے۔ اُن بچاروں کے لئے لاہور بجائے خود ایک میلہ ہے اور وہ اس میلے کی ہر چیز سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں لیکن تم نے دیکھا اس چوکھٹے میں ظہیر اور مہوش کی تصویریں بھی موجود تھیں۔ یہ دونوں ایم اے کے طالب علم اور کالج میگزین کے ایڈیٹر ہیں۔ اگر یونیورسٹی کی بہترین تعلیم پانے اور تہذیب و شائستگی سے متمتع ہونے کے باوجود یہ لوگ آٹھ آٹھ آنے میں چار تصویریں اُترواتے اور انار کلی ایسے بازار میں دکانوں کے تختوں پر چسپاں کراتے پھریں تو نوعمر لڑکوں کا خدا ہی حافظ ہے۔"

ان تمام صفات کے باوجود جن کی یک جائی ایک انسان کے اخلاق کو قابلِ رشک بلندی پر پہنچا دینے کی ضامن ہے۔ شہید کے مزاج میں چند خامیاں بھی تھیں۔ اگرچہ اُن خامیوں کا تلخ اثر صرف اس کی ذات تک محدود تھا۔ وہ ذکی الحس اور زود رنج شخص تھا۔ وہ دُنیا سے اسی حُسنِ سلوک کی توقع رکھتا تھا جو وہ خود لوگوں سے کرتا تھا۔ وہ دوسروں کے

معاملات میں دخل نہ دیتا تھا اور نہ لوگوں کے عیب و ثواب پر نکتہ چینی کرنے کا عادی تھا۔ اور اس کی شدید خواہش تھی کہ لوگ بھی اُس کے ذاتی امور میں مخل انداز نہ ہوں اور نہ اس کی ذات کو بے سود معرضِ بحث ہی میں لائیں۔ لوگوں کے خانگی حالات یا اُن کے ماضی کو بلا وجہ کرید کرید کر معلوم کرتے پھرنا اُس کے نزدیک کمینگی کی مکروہ ترین صورت تھی۔ وہ کہتا تھا کہ "اگر زید بکر کو دوست بنانا چاہتا ہے تو اُسے چاہیے کہ بکر کو صرف اس کی موجودہ حالت میں، خواہ وہ حالت قابلِ تعریف ہو یا لائقِ مذمّت، قبول کر لے۔ بکر کا ماضی، اُس کے خاندانی حالات، اُس کے والد کی حیثیت، یہ سب چیزیں بہ شرفِ دوستی بخشتے وقت غیر ضروری اور ناقابلِ التفات بن جاتی ہیں"۔

وہ اپنے پہلو میں ایک محبّت کرنے والا، جذباتِ عشق سے معمور اور زندگی کی رنگینیوں سے مسحور دل رکھتا تھا۔ وہ دوستوں کا دوست بلکہ جاں نثار دوست تھا۔ لیکن اپنی ذات کے متعلق کوئی نازیبا لفظ، کوئی اتہام یا کوئی غیر مناسب فقرہ سُننا اُس کی تابِ برداشت سے باہر تھا۔ ایسی اشتعال انگیز حالت میں وہ الزامی جواب دینے یا دوسرے کا گریباں گیر ہونے کے بجائے خاموشی سے خون کا گھونٹ پی کر چپ ہو رہتا۔ اسے بحث سے نفرت تھی جب بھی وہ دیکھتا کہ گفتگو بحث کا رنگ اختیار کر رہی ہے وہ فوراً موضوعِ سخن بدل دیتا۔ وہ کہتا تھا کہ میں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی کو

عمداً نقصان نہیں پہنچایا۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ مجھے بھی کسی سے رنج پہنچے
اپنے منتخب حلقۂ احباب میں اُس کا برجستہ مذاق، اُس کے ترشے ترشلے
فقرے، اس کی ادبی چاشنی سے لبریز ظرافت، اُس کی رندانہ نوک جھونک اور
سب سے بڑھ کر اُس کے بلند بانگ وفلک شگاف قہقہے اپنی نظیر آپ
تھے۔ اُس کے تمام دوست معترف تھے کہ شہیدؔ کی عدم موجودگی سے صحبتِ
احباب بہت بے کیف ہونے کے باعث جلد منتشر ہو جاتی ہے۔

وہ بالعموم سچ بولنے کا عادی تھا لیکن دوسروں کی دروغ گوئی سے،
جب تک کہ وہ براہ راست اُس کے مفاد پر اثر انداز نہ ہو، اُسے چنداں رنج
نہ پہنچتا تھا۔ وہ قولاً و فعلاً اپنے آپ کو لوگوں کی عزت کرنے کا پابند خیال
کرتا تھا اور دوسروں سے بھی ویسے ہی احترام آمیز سلوک کی توقع رکھتا
تھا۔ متعدد تقریبوں میں میں نے اُسے اُن اشخاص کے ساتھ انتہائی ادب و
احترام سے پیش آتے دیکھا ہے جن سے خلوت میں اُس کی بے تکلفی
جوتی پیزار کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ وہ منظر عام میں کسی ایسی حرکت کا مرتکب
ہونا جس سے چھچھورپن یا بازاریت مترشح ہو ہرگز گوارا نہ کرتا تھا۔ ایک روز
تمام دن بارش ہوتی رہی اور شام کو مطلع صاف ہوا تو ہم سیر کو نکلے۔ سڑکوں پر سخت
کیچڑ ہو رہی تھی اور ہم بچ بچ کر چل رہے تھے۔ میں نے ازراہ تمسخر کہا کہ "بڑا مزہ
ہو اگر میں تمہیں دھکا دے کر اس کیچڑ میں گرا دوں۔"

اُس کا چہرہ فوراً زرد پڑ گیا اور سخت انتشار کے عالم میں کہنے لگا۔ "خدارا کچھ عقل سے کام لو۔ اس گذرگاہِ عام میں سیکڑوں انسانوں کے اندر، ایسی حرکت کا ارتکاب؟ توبہ توبہ! مجھے اس خیال ہی سے پسینہ آ گیا ہے۔"

بہت سی باتیں جنہیں اوسط درجہ کی ذہنیت کے آدمی محسوس بھی نہیں کرتے شہید کے لئے بہت اہم تھیں، اُس کی وجہ اُس کی ذکاوتِ حس اور اُس کا غیر معمولی جذبۂ خودداری تھا۔ ایک روز ہم کالج کے ریسٹوران میں چائے پینے گئے، وہاں چند طلبہ اور بھی بیٹھے تھے۔ اُن میں سے بعض نے شہید کے سلام کا جواب نہ دیا۔ شاید اس لئے کہ وہ اکل و شرب میں مصروف تھے یا یہ کہ وہ اس طرف متوجہ ہی نہ تھے۔ اس واقعہ کے بعد شہید نے کبھی اُن سے علیک سلیک میں پیش قدمی نہیں کی۔ ایک دفعہ وہ اپنے والد کے حکم کی تعمیل میں لاہور کے ایک مشہور رئیس سے جس کے ساتھ اُس کے والد کے دیرینہ مراسم تھے ملنے گیا۔ اس نے اپنی آمد کی اطلاع کرائی تو اندر سے جواب آیا کہ پوچھو کوئی خاص کام ہے یا آپ یونہی ملنا چاہتے ہیں۔ اس جواب کے بعد وہ ایک لمحہ وہاں نہ ٹھیر سکا اور فوراً لوٹ آیا۔ آتے ہی اُس نے والد کو خط دیا کہ آئندہ وہ اُس شخص کے ہاں جانے سے قطعی معذور ہے۔

یہ تھا مختصر سا خاکہ شہید کی افتادِ طبیعت کا۔ اُس کی رنگین مزاجی کی داستان بھی اُس کی زندگی کا ایک دلچسپ باب ہے۔ لیکن میں اُس سے بوجوہ چند قطع نظر کرتا ہوں۔ اُسے لاہور کی زندگی سے اس قدر اُنس ہو گیا تھا کہ موسمِ گرما کی سہ ماہی تعطیلات بھی یہیں پڑا پڑا گزار دیتا تھا۔ جون جولائی کے مہینوں میں لاہور کی آتش ریزہ و شرر بار گرمی سے بچنے کے لئے صاحب استطاعت لوگ پہاڑوں پر چلے جاتے تھے لیکن یہ شخص لاہور کے مغربی گوشے میں بیٹھا خزاں رسیدہ لاہور کو دیکھ دیکھ کر عشرتِ خیال کی گہرائیوں میں غرق ہو ہو جاتا تھا۔ اُسے لاہور میں صرف ایک تکلیف کا سامنا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ "یہاں رہ کر مملکتِ دل کو غنیم کے حملوں سے بچائے رکھنا ایک ایسا کام ہے کہ شاید ہی اولادِ آدم کا کوئی فرد اس میں کامیاب ہو سکے اور پھر غنیم بھی ایک ہو تو مضائقہ نہیں۔ قدم قدم پر تیروں کی بارش اور جگہ جگہ خنجروں کے وار۔ تیر بھی وہ جس کے متعلق غالب کہہ گیا ہے۔

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

بہرحال شہید جب تک اس ماحول میں رہا اُس نے بھی سرِ دعوتِ ہلاکت کو لبیک کہنے اور دل و جگر کو خون کرنے میں اپنی طرف سے کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تھی۔ اور جب وہ یہاں سے نکلا ہے تو خون کا آخری قطرہ اس سرزمین

کی نذر کر چکا تھا۔

میرا کالج میں آخری سال تھا۔ گرمی کی رخصتوں کے بعد میں اکتوبر کے اوائل میں لاہور آیا۔ تو شہید کو حسبِ معمول پہلے سے موجود پایا۔ وہ عادت اور ضرورت سے زیادہ بشاش نظر آتا تھا۔ اس دوران میں اس نے بہاول مزنگ کے ایک خاندان سے راہ و رسم کر لی تھی اور اب شام کے چند فارغ گھنٹے سیر کی بجائے وہ اُن لوگوں میں بسر کرتا تھا۔ اُس کی وہی سُرخ ٹوپی اور لکڑی موجود تھی، جسم پر وہی کبھی سُوٹ اور کبھی شیروانی، وہی جامہ زیبی وہی خم سے نامانوس گردن اور وہی طلاقت لسانی۔ غرضکہ شہید اپنی خصوصیات کے لحاظ سے وہی انسان تھا جس سے مَیں چند ماہ قبل جُدا ہو کر گھر گیا تھا البتہ اب اُس میں شعریت اور خود فراموشی قدرے زیادہ پیدا ہو گئی تھی۔ جب تک کوئی ایسی ہی بات نہ ہو جائے وہ شام کو مزنگ جانے میں ناغہ نہ کرتا تھا۔ شام کا وقت ہی دوستوں سے میل ملاقات کا بہترین موقع تھا اور یہی وقت وہ ہم سے علیحدہ بسر کرنے لگ گیا تھا۔ اس لئے مجلسِ احباب اُس کی شرکت سے یکسر محروم ہو گئی۔ اور ہم سب نے اُنکی عدم موجودگی کو شدّت سے محسوس کیا۔ ایک روز مَیں اس کے ہمراہ مزنگ چلا گیا اور یوں اُس کے نئے دوستوں سے تعارف کا فخر حاصل کیا۔ مزنگ کے اس حصّہ میں جہاں مغربی اور مشرقی طرزِ تعمیر کے مخلوط نمونے نظر آتے ہیں ایک عالیشان

مکان اور پائیں باغ تھا۔ ہمارے داخل ہوتے ہی جس گرمجوشی سے ہماری پذیرائی کی گئی۔ اُس سے میں نے شہید کی عظمت اور اُس کے وقار کا اندازہ لگا لیا اور محسوس کیا کہ شہید کی شخصیت کا جادو کالج کے کمروں سے نکل کر محلوں کے رہنے والوں پر بھی چل گیا ہے۔ چند منٹ کے بعد ہم صاحب خانہ کے سامنے موجود تھے۔ اور مجھے شہید نے اپنے عزیز ترین دوست کی حیثیت سے اُن کی خدمت میں پیش کیا۔ میں نے وہاں شہید کو کافی بے تکلف پایا۔ وہ نہایت آزادی سے باتیں کرتا تھا اور اُس کے سقف شگاف قہقہے، جو ہر اجنبی مقام پر دبی ہوئی ہنسی میں تبدیل ہو جانے پر مجبور ہو جاتے تھے، یہاں فضا کو پوری طاقت سے متاثر کر رہے تھے۔ صاحب خانہ کا سن پچاس کے لگ بھگ ہوگا مگر وہ اپنی عمر کے مقابلہ میں بہت جوان نظر آتے تھے۔ فربہ جسم اور سُرخ رنگت کے انسان تھے۔ طرزِ بود و ماند، مکان کی آرائش، خدّام کی کثرت، اور دیگر طور طریقوں سے تموّل کا اظہار ہو رہا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ آپ ایک عہدۂ جلیلہ پر فائز تھے لیکن چند مجبوریوں کے باعث قبل از وقت ملازمت سے سبکدوش ہو کر واپس وطن تشریف لے آئے ہیں اور اب نہایت آسائش اور بے فکری سے اپنے بچّوں میں بسر اوقات کر رہے ہیں۔ مجھے آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ شہید کیونکر اُس خاندان سے متعارف ہوا اور وہ کیا اسباب تھے جنہوں نے

اس قلیل عرصہ میں اُسے ان لوگوں سے بے تکلّف کردیا تھا لیکن ایک حیرت انگیز بات جو میں نے اُس شام دیکھی اُس نے اس تمام کارروائی کو اور زیادہ پُراسرار بنا دیا۔ صاحبِ خانہ ہمیں گول کمرے میں بٹھا کر خود کسی غرض سے باہر چلے گئے۔ اُن کے جاتے ہی برابر والے کمرے کا پردہ اٹھا اور ایک بیس اکیس سال کی حسین و جمیل لڑکی بیش قیمت لیکن جذبات میں ہیجان بپا کرنے والا لباس پہنے پردے سے باہر آئی۔ اور بمشکل چند لمحے ہمارے سامنے ٹھہر کر مُسکراتی ہوئی فوراً غائب ہو گئی۔ شہید نے آرام کرسی پر لیٹے لیٹے بلند آواز میں یہ شعر پڑھا ؎

کس کے جلوے کو دیکھتا ہوں میں
مجھ کو میری نظر نہ ہو جائے

دس ایک منٹ کے بعد صاحبِ خانہ بھی تشریف لے آئے اور پھر اِدھر اُدھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔ شہید سے شعر سُنانے کی فرمائش ہُوئی اور اُس نے اپنی ایک پُرانی غزل ترنّم سے پڑھ کر سُنائی۔ اس سارے ٹھاٹھ باٹھ، اس امیرانہ شان و شوکت اور اس پُرتکلّف ساز و سامان کے باوجود مجھے صاحبِ خانہ کی شخصیّت سے کوئی رغبت پیدا نہ ہوئی تھی۔ اُن کی آنکھوں سے ایک ایسی کیفیّت کا اظہار ہو رہا تھا جس سے عالی خیال اور بلند فطرت لوگوں کی آنکھیں عموماً معرّا ہوتی ہیں۔ چھچھورپن نہ سہی لیکن

عامیانہ پن کی بو ان کی باتوں سے ضرور آتی تھی۔ وہ بار بار اپنی زندگی کے دورِ رفتہ کی طرف اشارہ کر کر کے اپنے سرکاری عہدہ کی عظمت، ہم عصروں میں اپنے وقار اور رعایا پر اپنے رعب، داب کا ذکر کرتے ہوئے دبی زبان میں اپنی رنگینیوں کا قصّہ بھی سُنا جاتے تھے۔ مَیں حیران تھا کہ شہید سا مردم شناس اور ذوقِ سلیم رکھنے والا انسان کیونکر اِن باتوں کا متحمّل ہو سکتا ہے۔ لیکن میں دیکھتا تھا کہ وہ نہایت بشاشت سے سب کچھ سُن رہا ہے اور کبھی کبھی زیبِ داستان کے طور پر اپنی طرف سے بھی کچھ بڑھا دیتا ہے۔ شام کا دھندلکا جب رات کی تاریکی میں تبدیل ہونے لگا تو مَیں نے چاہا کہ اب اجازت لیں۔ شہید بھی یہ دیکھ کر کہ مَیں واپس چلنے پر مُصر ہوں اپنی جگہ سے اُٹھا اور ہم نے صاحبِ خانہ سے سمع خراشی کی معذرت چاہی۔ واپسی پر ہم مختلف موضوعوں پر گفتگو کرتے آئے۔ جب ہم مال پر سے گزر کر ڈاک خانے کے قریب پہنچے تو اُس نے خود ہی کہا۔

"مَیں نے شاید تمہیں صاحبِ خانہ کا نام نہیں بتایا؟"

مَیں نے جواب دیا۔ "نہیں"

"آپ کا نام احتشام الحق ہے۔"

مَیں نے بے پروائی کا اظہار کیا۔ گویا مجھے اُس کے نام سے کوئی

دلچسپی نہیں۔ شہید میرے اطوار دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ اب میرے لئے بات کرنے کا موقع تھا۔ میں نے کہا۔

"وہ لڑکی کون تھی جسے دیکھ کر تم نے شعر پڑھا تھا؟"

شہید نے اضطراب مجسم کی شکل اختیار کر کے کہنا شروع کیا۔ "وہ لڑکی؟ ہمارے میزبان کی صاحبزادی تھی۔ بس یہی ایک چیز ہے جس کی کشش ہر شام مجھے یہاں کھینچ لاتی ہے۔ خدا کی قسم زندگی بالکل بے کیف گذر رہی تھی۔ قدرت نے خود ہی میری رہبری کی اور مجھے یہاں لے آئی۔ عجب دلفریب جگہ اور دلفریب لوگ ہیں۔ میں نہیں جانتا اس تپش ناتمام کا انجام کیا ہو گا لیکن یہ حقیقت ہے کہ جان و دل اس کی نذر ہو چکے ہیں۔"

شہید کا معمول جاری رہا اور اُس کی ہر شام کو بدستور آفتاب طلوع ہوتا رہا۔ میں نے اُس کے معاملات میں غیر ضروری دخل دینا پسند نہ کیا اور یوں بھی یہ معیوب سی بات تھی کہ میں خواہ مخواہ تفحص و تجسس کی غرض سے اُس کے پیچھے لگا رہتا۔ لیکن اس عرصے میں اُس کے نئے دوستوں کے متعلق عجیب عجیب باتیں میرے کانوں تک پہنچیں۔ میں نے سُنا کہ شہید کے ممدوح احتشام الحق کی بیوی عادات اور چال چلن کے لحاظ سے نہایت پست درجہ کی عورت ہے اور اُسی کے ہاتھوں ایک مرتبہ صورتِ حالات اس قدر نازک ہو گئی تھی کہ احتشام کو وقتِ معینہ سے قبل ہی ملازمت

سے سبکدوش ہونا پڑا۔ پھر بھی مَیں نے سُنا کہ ایسی ماں کی زیرِ تربیت رہنے والی لڑکیاں ماں سے بھی چند قدم آگے ہیں۔ مجھے معلوم ہوا کہ احتشام کی دو لڑکیاں ہیں اور دونوں کی شہرت رُسوائی کی حد تک پہنچ چکی ہے اور اُن کا تذکرہ لاہور کے خوش مزاج نوجوانوں کی صحبتوں کا محبوب موضوع رہتا ہے۔ مَیں حیران تھا کہ شہید کیونکر ایسے بدنام گھرانے سے اپنے آپ کو وابستہ کر کے اپنی ذات کو انگشت نمائی کا مرکز اور اپنی شخصیّت کو لوگوں کے شکوک و شبہات کا شکار بنانا گوارا کر رہا ہے۔ یہ حقیقت تھی کہ احتشام الحق کو اپنے متعلقین کی ہر بات کا علم تھا لیکن وہ ایک بے حمیّت آدمی کی طرح، جس نے اپنا زمانۂ تعیش دوسروں کے ہاں تباہ کیا ہو درحالیکہ خود اُس کے گھر میں آگ لگ رہی ہو، اب بحالتِ شیب سب رسوائیاں اور تمام ذلّتیں انتہائی بے حسی سے برداشت کرنے پر مجبور تھے۔

ہم دونوں نے ایک ساتھ بی اے کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ میرا ارادہ نہ ملازمت کا تھا اور نہ آئندہ تعلیم جاری رکھنے کا۔ میرے ایک عزیز دہلی میں بہت وسیع پیمانے پر تجارت کرتے تھے۔ اور گھر والوں کی یہی مرضی تھی کہ مَیں اُن کے کاروبار میں شریک ہو جاؤں۔ چنانچہ امتحان سے فارغ ہوتے ہی مَیں دہلی چلا گیا۔ شہید کے متعلق مَیں نے سُنا کہ وہ

لا۔ کالج میں داخل ہو گیا ہے۔ اور ہوسٹل کے بجائے اُس نے مزنگ میں اقامت اختیار کی ہے۔ شہید شاذو نادر ہی خط کا جواب دیا کرتا تھا۔ لیکن دیگر ذرائع سے مجھے معلوم ہوا کہ اُس نے احتشام الحق کے مکان کے عین قرب میں اپنے رہنے کا بندوبست کیا ہے۔ ان خبروں سے مجھے تشویش سی ہوئی کہ شہید کا اس طرح ہاتھ دھو کر اور عوام کی راز جُونگاہوں سے بے پردا ہو کر ایک بات کے پیچھے پڑ جانا اُس کی شہرت کو نقصان پہنچانے کے علاوہ اُس کے مستقبل کو بھی متاثر کئے بغیر نہ چھوڑے گا تین ماہ کے بعد مَیں نے سُن لیا کہ شہید نے احتشام الحق کی لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ مجھے اس اطلاع سے نہ خوشی ہوئی اور نہ افسوس۔ حیرت ضرور ہوئی۔ مَیں نے شہید کو خط لکھا۔ لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ چند اور دوستوں کے خطوط سے مجھے معلوم ہوا کہ شہید احتشام الحق کے مکان پر چلا گیا ہے۔ بعد میں مَیں نے یہ بھی سُنا کہ شہید کے والد نے اس شادی پر سخت غیظ و غضب کا اظہار کیا ہے اور غم و غُصّہ کی حالت میں شہید سے تمام تعلّقات منقطع کر لئے ہیں۔ یہاں تک کہ اب اُنھوں نے اُس کے تعلیمی مصارف ادا کرنے سے بھی انکار کر دیا ہے۔

میرا جی چاہتا تھا کہ لاہور جا کر اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھوں۔ لیکن مجھے ابھی جنگ در پیش تھی اور کاروبار کی بے لذّت مصروفیتوں سے

فرصت قطعی ناپید تھی کبھی کبھی کسی دوست کا خط آجاتا یا کبھی کبھار لاہور کا کوئی واقف مل جاتا تو اڑتی اڑتی خبریں موصول ہو جاتی تھیں۔ بعد کی حیرت انگیز اطلاعات سے مجھے معلوم ہوا کہ شہید اب اُداس اور دل گرفتہ سا نظر آتا ہے۔ پریشان اور کھویا کھویا سا پھرتا ہے۔ کالج بہت بیقاعدگی سے جاتا ہے۔ مکان پر بہت کم وقت گذارتا ہے۔ اکثر باہر گھومتا رہتا یا لائبریری میں بے دلی سے کتابوں کی اوراق گردانی میں مصروف رہتا ہے شادی کے چار مہینے بعد یکایک میں نے سُنا کہ شہید نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے۔ ساتھ ہی لاہور سے ایک دوست کا خط موصول ہوا جس میں تفصیلی حالات درج تھے۔ لکھا تھا کہ شہید کی بیوی شادی سے پہلے بھی چال چلن کے لحاظ سے سخت بدنام تھی۔ لوگ متعجب تھے کہ شہید ایسے انسان نے واقعات و کوائف سے آنکھیں بند کر کے کیونکر اُس سے عقد کر لیا۔ شادی کے معاً بعد شہید کو اس تلخ حقیقت کا احساس ہو گیا کہ اُس نے ایک عصمت باختہ عورت سے نکاح کیا ہے جو اُس کی بیوی بننے سے قبل ہی متاعِ عفّت و عصمت لُٹا چکی تھی۔ اور اب اپنی بداعمالیوں کے خوفناک نتائج اُس کے سر تھوپنے کے لئے اُس کے ہاں آگئی تھی۔ عرصہ تک شہید ایک خطرناک کشمکش میں مبتلا رہا۔ اُسے کیا کرنا چاہیئے؟ کیا وہ ایسی عورت کو بدستور اپنی بیوی بنائے رکھے اور دُنیا کے رُوبرو بے حمیتی اور بے غیرتی

کا مکروہ نمونہ پیش کرتا ہے؛ فطرت تو بڑی بے رحم ہے وہ کسی انسان کی رعایت کرنا نہیں جانتی۔ چند دنوں میں جب گناہ کا انتقام ایک جیتی جاگتی ہستی میں نمودار ہوا تو وہ دُنیا کو کیا مُنہ دکھائیگا؛ وہ جو ہمیشہ گردن بلند رکھنے اور سینہ اُبھار کر چلنے کا عادی تھا اب ہم چشموں میں کیونکر آنکھیں اُٹھا سکے گا؛ آخر اُس نے وہی کیا جو اُسے کرنا چاہیے تھا یعنی اُس نے اپنی بیوی کو علیحدہ کر دیا۔"

اس خط میں ضمنی طور پر شہید کے مصائب کا بھی ذکر تھا۔ وہ لوگ جو ہمیشہ اُس سے خدا واسطے کا بغض رکھتے تھے اب کھُلم کھُلا اُس پر برس پڑے تھے۔ روپیہ پیسہ اُس کے پاس بالکل ختم ہو چکا تھا اور تنگدستی کا انتہائی عالم طاری تھا۔ لوگوں کے طعنہ ہائے دلخراش اس کے سریع الاحساس قلب کو چھلنی کرنے کے لیے الگ موجود تھے اور دوسری طرف اس کے والد نے دستِ اعانت کھینچ کر اُسے اس جنگ میں بالکل یکہ و تنہا چھوڑ دیا تھا۔ مَیں نے یہ سب کچھ پڑھا تو میرے جگر میں ایک ٹیس سی اُٹھی۔ شہید ایک دیرینہ مخلص اور محسن دوست تھا۔ مَیں اُس کے جذبات و احساسات کی نزاکت سے خوب واقف تھا۔ اس لئے مَیں نے سیکڑوں میل کے فاصلہ پر بیٹھے بیٹھے اچھی طرح محسوس کر لیا کہ اُس کی موجودہ تکلیف اُس کے لیے کس درجہ قاتل اور تباہ کن ثابت ہوگی۔ اب مَیں نے لاہور پہنچنے میں مزید

تعویق نہ کی بلکہ اُسی روز شام کی گاڑی سے روانہ ہو کر علی الصّباح لاہور پہنچ گیا۔ مزنگ جانا میں نے بے سود خیال کیا کیونکہ احتشام کے مکان پر شہید کا ملنا ناممکنات سے تھا۔ اُس کی جدید قیامگاہ کا پتہ معلوم کرنا بھی آسان نہ تھا۔ کیونکہ فرداً فرداً میں تمام احباب سے دریافت کر چکا تھا اور کوئی نہ بتا سکا کہ شہید آج کل کہاں رہتا ہے۔ کسی نے گوالمنڈی کا پتہ دیا۔ کسی نے کہا وہ راوی روڈ پر چلا گیا ہے۔ غرضکہ شام تک میں نے لاہور کے بے شمار گلی کوچے اور محلّے چھان مارے۔ لیکن شہید بے پتہ ہی رہا۔ مجھے شک ہوا کہیں وہ لاہور سے چلا نہ گیا ہو لیکن اس بارے میں لوگوں نے میرا اطمینان کر دیا۔ کہ وہ باہر کہیں نہیں گیا۔ کیونکہ اکثر یہیں بائیسکل پر گھومتا نظر آتا ہے۔ ہمارا ایک دوست شفیق بھی تھا جس نے ہمارے ساتھ ہی بی اے کیا تھا اور وہ بھی اب لاء کالج میں داخل تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اُسے شہید کی نقل و حرکت کا صحیح علم ہو گا۔ چنانچہ دوسرے روز میں اُس سے کالج میں جا کر ملا اور اُس نے رازدارانہ طریق سے بتایا کہ شہید میانمیر چھاؤنی میں رہتا ہے۔ وہاں اُس کے ایک ہم وطن دوست ٹھیکیدار ہیں اور انہی کے مکان پر اُس کا قیام ہے۔

شہید کا میانمیر چلے جانا اس بات کا زبردست ثبوت تھا کہ لاہور میں اُس کی پذیرائی کے لئے تمام دروازے بند ہو چکے تھے۔ اور یہاں رہ کر

عزت مندانہ زندگی بسر کرنے کی تمام راہیں اس پر مسدود ہو چکی تھیں۔ سہ پہر کے قریب میں چھاؤنی پہنچا اور بڑی دقّت سے مکان تلاش کیا۔ شہید سے ملاقات ہوئی۔ میری خلافِ توقع آمد پر وہ حیران سا ہو گیا۔ اُس کا چہرہ اُترا ہوا تھا اور جسم بھی پہلے کی بہ نسبت لاغر نظر آتا تھا۔ میں نے ہنسی مذاق کی باتوں سے گفتگو شروع کی۔ لیکن مجھے فوراً محسوس ہو گیا کہ شہید کے دریائے تکلّم کی شہرۂ آفاق روانی ختم ہو چکی تھی۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر گفتگو کرتا تھا اور بات ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اُس کے دہن سے نکلتی تھی۔ بایں ہمہ وہ یہ ظاہر کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ کہ وہ ہمیشہ کی طرح اب بھی مسرور و شاد کام ہے۔ ہائے اُس کا غرور۔ وہ شدّتِ مصائب میں بھی اپنے قلب و جگر کی جراحتوں کو دوسروں پر آشکار کرنا نہ چاہتا تھا۔ اور نہ حالاتِ نامساعد کی یورش میں سرنگوں ہونا اُسے گوارا تھا۔

میں نے کہا " میں نے تمہارے متعلق بہت سی رنجدہ باتیں سُنی ہیں۔ ہمارے درمیان جو تعلق خاطر قائم ہے وہ مجھے کشاں کشاں دہلی سے کھینچ لایا ہے۔ بے سود رازداری سے کام نہ لو اور خدارا بتاؤ کہ اصل حقیقت کیا ہے؟"

اُس نے کہا " جو کچھ تم نے سُنا ہے صحیح ہے اور آئندہ بھی جو کچھ سنو گے درست ہو گا۔ میرا نام جس کی عزت و حرمت میرا ایمان اور جس کا ادب و احترام میرا مذہب تھا آج ادنٰے، کم ظرف اور گندہ دہن لوگوں کی زبانوں پر چڑھ گیا

اپنا وقار کھو بیٹھا ہے۔ میرے خلاف اس وسعت و سرعت سے اتہام تراشی کی گئی ہے کہ وہ لوگ بھی جو مجھ سے براہِ راست واقف نہیں ہیں میرا نام لے لے کر تمسخر و استہزاء کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ آج لاہور کی تعلیم یافتہ آبادی کے ایک حصّہ میں میرا ذکر اس رنگ میں کیا جاتا ہے گویا میں اور ذلت ایک ہی روز پیدا ہوئے تھے۔ تعلیمِ جدید کس دن ہمارے اخلاق سنوارنے کے قابل ہوئی تھی کہ آج میں تعلیم یافتہ طبقے سے کسی بہتر طرزِ عمل کی توقع رکھتا؟ بہت سے لوگ جو رنج و مسرت اور اندوہ و طرب میں تمیز کئے بغیر ہر واقعہ کو تماشائی کی حیثیت سے دیکھ کر اپنی حِس تماشا کو تسکین بخش کر محض خوش ہونا جانتے ہیں مجھے دیکھ دیکھ کر اشارے کرتے ہیں۔ اکثر لوگ ایسے ہیں جو مدّت سے میرے خلاف بغض للّٰہی کا شکار ہوئے بیٹھے تھے، جنہیں میری خود مختار، قائم بالذّات اور خوددار شخصیّت ایک لمحہ کے لئے بھی پسند نہ تھی۔ تمہیں معلوم ہے خوشامد اور سخن سازی میری عادات میں داخل نہیں۔ یہ لوگ جو خودستائی اور خوشامد کے خوگر اور دوسروں پر اپنا تفوق قائم رکھنے کے عادی ہیں ایسی ہستی کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے جو اُن کے اندر رہ کر اپنے شانوں کو سیدھا اور اپنی گردن کو بلند رکھ سکے۔ تم میری گذشتہ زندگی کے شریک و سہیم رہ چکے ہو اور جانتے ہو کہ میں دوستوں کا خادم ہونے کے باوجود کیونکر دُنیا کے سامنے ہمیشہ اپنے آپ کو ایک گدائے متکبّر ظاہر کرتا

رہا ہوں۔ میرا یہ رویّہ لوگوں کے لئے ناقابلِ فہم ہونے کے ساتھ ہی ناقابلِ برداشت بھی تھا۔ چنانچہ جھوٹ یا سچ مجھے بدنام کرنے کا جو بھی پہلا موقعہ ہاتھ آیا لوگوں نے اُس سے فائدہ اُٹھانے میں کمی نہیں کی۔ بیشک میں نے ایک غلطی کی۔ لیکن دُنیا میں کون ہے جو غلطیوں سے پاک ہے۔ اور کیا غلطی کا احساس اور اُس کی اصلاح بھی کوئی ناقابلِ عفو جرم ہے؟ کیا میرا صرف اتنا ہی قصور نہیں کہ مَیں نے جذبات سے مغلوب ہو کر ٹھوکر کھائی اور پھر فوراً قدم پیچھے ہٹا لیا؟ ہزاروں نوجوان اس قسم کی لغزشوں کا شکار ہو چکے ہیں لیکن جس طرح مجھ پر عرصۂ حیات تنگ کیا جا رہا ہے اُس کی مثال میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ اوّل تو ہمارے ہاں سوسائٹی سرے سے مفقود ہے۔ لیکن آبادی کے جس بہیمانہ عنصر اور تماشائیوں کے جس غیر تربیت یافتہ گروہ کو تم سوسائٹی کہتے ہو اُس کے خلاف بھی تو مَیں نے کوئی جرم نہیں کیا کہ یوں تحت الثّریٰ کی خبیث رُوحیں مجھ پر پنجے جھاڑ کر پل پڑتیں میری نادانی اور ناتجربہ کاری کے نتائج کا تعلق صرف میری ذات سے ہے۔ اور مَیں اُنہیں طوعاً و کرہاً برداشت کروں گا۔ لیکن عوام کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ بےوجہ بے مصرف میری ذات کو ہدفِ طعن بنا رہے ہیں۔ مَیں نے احتشام کی لڑکی سے شادی کر کے اپنے والد کو ناراض کر لیا اور اُس ناراضی کا خمیازہ بھگت رہا ہوں۔ یہ میری شدید غلطی تھی۔ لیکن شادی کے بعد جس خوفناک

حقیقت کا انکشاف مجھ پر ہوا اُس کے بعد خاموش رہنا اس سے بھی شدید تر غلطی تھی۔ وہ لوگ جو آج ہر نا کردنی فعل اور ہر ناگفتنی بات مجھ سے منسوب کر کر کے اپنے نزدیک گویا بہت بڑی معاشرتی خدمت انجام دے رہے ہیں کیا اُس وقت خاموش رہتے، جب شادی کے پانچ ماہ بعد ایک نامعلوم الولد بچّے کا باپ بن جاتا؟ یقین مانو اُس وقت بھی لوگ آگے بڑھتے اور مجھ پر زندگی وبال کر دیتے۔ ان خون کے پیاسے بھیڑیوں کو آشتی سے مطمئن کرنا ممکن نہیں جب تک اپنے جسم کا سارا خون اُن کی نذر نہ کر دو گے اُن کی چیخ پکار جاری رہے گی۔ احتشام تو سخت بے غیرت انسان ہے۔ وہی بات جو ایک غیرتمند باپ کو موت کے گھاٹ اُتار دینے کے لئے کافی تھی احتشام کے لئے وجہ تفاخر نہیں تو کم ازکم وجہ سرخروئی ضرور بن چکی ہے۔ کوئی اور انسان ہوتا تو اپنی بیٹی کے کرتوت دیکھ کر خودکشی کر لیتا۔ لیکن وہ ہے کہ ہر کہہ و مہ کے پاس جا جا کر مجھے مطعون کر رہا ہے اور یوں بالواسطہ اپنی ذلّت و بے حمیّتی کا اشتہار دے رہا ہے قلیل عرصہ میں اُس نے میرے خلاف غلط فہمیوں کا ایک انبار کھڑا کر دیا اور مَیں نے محسوس کیا کہ ہر طرف سے مجھ پر تہمتوں اور طعنوں کی بارش شروع ہو گئی ہے۔ مَیں خاموش رہا۔ مَیں چاہتا تو احتشام کے مقابل، اُس کے پہلو بہ پہلو، اور اُس کے خلاف خود ایک وسیع مہم شروع کر سکتا تھا۔ لیکن مَیں سمجھتا تھا کہ معاملہ اس قدر روشن و بیّن اور

میری حیثیت شک و شبہ سے اس قدر پاک و صاف ہے کہ دنیا کسی مغالطہ میں نہیں آسکتی۔ اس کے علاوہ لوگوں کے پاس جا جا کر اپنی صداقت و برائت کے ثبوت پیش کرنا بھی میں کمینگی خیال کرتا تھا۔ میری دُنیا میرے دوست تھے جن کے خلوص و رفاقت پر مجھے اعتماد تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ دُنیا جس کی محبت اور جس کی عداوت میرے لیے لاشے محض ہے اگر میرے متعلق شدید سُوءِ ظن میں مبتلا بھی ہو جائے تو مجھے کیا پروا ہے درحالیکہ میرے دوست جن کی محبّت میری متاعِ عزیز ہے میرے ساتھ ہیں۔ احتشام نے اب فرداً فرداً میرے دوستوں کے پاس پہنچنا شروع کیا۔ ظفر کو تم جانتے ہو کتنا پُرانا اور کیسا عزیز دوست تھا۔ سالہا سال کی یکجائی سے ہم بھائیوں کی طرح آپس میں گھُل مل گئے تھے۔ ایک روز وہ مجھ سے ملا اور چھُوٹتے ہی کہنے لگا۔ "تم نے ایسی قبیح حرکت کی ہے کہ تہذیب و شرافت شاید ہی تمہیں کبھی معاف کرے۔ میرا تو خیال نہیں تھا کہ تم ایسے بے رحم اور سنگدل شخص ہو۔"

مَیں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اپنی رائے پر قائم رہا۔ میں نے عاجز آکر اُس سے کہہ دیا کہ "اگر برسوں کی دوستی کے بعد بھی تم میری سنگدلی اور بدباطنی نہ پہچان سکے۔ بلکہ ہمیشہ میری وسیع النظری اور بلند اخلاقی کے مداح رہے اور آج احتشام کے کہنے سے مجھے سنگدل اور بداخلاق بنا رہے ہو تو میں بھی تم ایسے کور نظر، کُند ذہن، غبی اور تنگ خیال شخص

کو اپنا دوست بنانا اپنے لئے کسرِ شان سمجھتا ہوں۔"

وہ دن اور یہ دن، میں اور ظفر ایک مرتبہ بھی کھل کر نہیں ملے عنایت سے بھی تم واقف ہو اور جانتے ہو کہ میرے اُس کے مراسم کتنے گہرے تھے۔ جب میں احتشام کے مکان سے نکل آیا تو مجھے سر چھپانے کے لئے لاہور میں کسی کونے کی تلاش تھی۔ مالی حالت اس قدر خراب ہو چکی تھی کہ کرایہ کا مکان لینے کی استطاعت نہ رہی تھی۔ کچھ عرصہ بعد خیال آیا کہ عنایت کے ہاں کیوں نہ جا رہوں۔ امیر آدمی کا اکلوتا بیٹا ہے، خود بھی جائداد کا مالک ہے، ایک دو کمرے آسانی سے میرے لئے الگ کر دیگا۔ یہی سوچ رہا تھا کہ ایک روز عنایت اپنے تانگہ پر سوار سڑک پر مجھے مِلا۔ دُور سے اُس نے مجھے دیکھا اور دیکھتے ہی مُنہ پھیر لیا اور چپکے سے گذر گیا۔ اس ہتک آمیز بے التفاتی کے بعد دوستوں سے امداد کا طالب ہونا میرے لئے نہ صرف کمینگی بلکہ دیوانگی کا مترادف تھا۔ چنانچہ اس واقعہ کے بعد میں چھاؤنی چلا آیا اور اب تک یہیں ہوں۔"

میں خاموشی سے شہید کی داستانِ غم سُنتا رہا اور جب اُس نے ایک لمبی سانس کے ساتھ یہ قصہ ختم کیا تو میں نے پوچھا۔

"تم نے کالج جانا ترک کر دیا ہے؟"

"نہیں۔ جاتا ہوں۔ لیکن پہلی سی باقاعدگی نہیں رہی۔ ہفتہ بھر میں

کئی ناغے ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ دو ماہ کی فیس بھی ادا نہیں کی سخت پریشانی لاحق ہے۔ دو کشتیوں میں بیک وقت پاؤں نہیں رکھے جا سکتے حیران ہوں کہ کیا کروں۔ عسرت اور تنگدستی کا یہ عالم ہے کہ آج تک ایسی کیفیت نہ دیکھی تھی۔ والد بے حد ناراض ہیں۔ مدّت سے اُنہوں نے ایک پیسہ نہیں بھیجا۔ مَیں کس مُنہ سے اُن کے پاس جاؤں۔ اور جاؤں تو مَیں اُن کی طبیعت سے واقف ہوں۔ وہ ان حالات میں مجھے کبھی معاف نہیں کریں گے۔ اب تو غیرت کا تقاضا ہے کہ اپنی جنگ خود اپنے ہاتھ سے لڑوں۔ خواہ اس میں مارا جاؤں یا زندہ بچ رہوں، دستِ سوال کسی کے آگے دراز نہیں کرونگا۔"

مَیں نے کہا۔ "بات اتنی اہم نہیں جتنی تمہارے تخیّل نے بنا رکھی ہے۔ اس قسم کے سیکڑوں واقعات روزمرّہ پیش آتے رہتے ہیں۔ تمہارا معاملہ کوئی دُنیا جہان سے نرالا نہیں کہ خواہ مخواہ اپنے آپ کو ہلاک کرنا شروع کردو۔ مصیبت یہ ہے کہ تم سخت ذکی الحس ہو اور ہر تکلیف کو ضرورت سے زیادہ محسوس کرتے ہو۔ تمہاری زندگی اب تک آرام و راحت سے گزر رہی تھی اور تمہیں واقعاتِ مخالف سے دوچار ہونے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ تم نے اپنے قلب و دماغ کی طاقتوں کا اندازہ لگانے میں ہمیشہ مبالغہ سے کام لیا۔ اور اب کہ نامساعدتِ ایّام سے پہلی مرتبہ

تمہاری آویزش ہوئی تو تم فوراً شکست کھا گئے۔ ان لوگوں کی طرف دیکھو جن کی زندگیاں بے حیائیوں اور بداعمالیوں سے لبریز ہیں۔ جن کا دامنِ شہرت بدنامی کے دھبوں سے سیاہ ہو چکا ہے لیکن اس پر بھی وہ دُنیا کے سامنے دندناتے ہوتے پھرتے ہیں اور دُنیا اُن سے مرعوب ہوتی ہے دُنیا کے ساتھ اُنہی ہتھیاروں سے جنگ کرو گے جو اُس نے تمہارے خلاف استعمال کئے ہیں تو فتحیاب ہو جاؤ گے اور اگر تم چھپ کر اندر بیٹھ گئے تو یاد رکھو تباہ ہو جاؤ گے۔ قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ تم سا انسان جس نے حقائق زندگی کا ابھی کچھ نہ دیکھا تھا احتشام جیسے گرگ باراں دیدہ کے جنگل میں جا پھنسا جس نے پہلے ہی وار میں تمہارے پرخچے اڑا دیئے۔ تم کہتے ہو کہ احتشام بے غیرت ہے۔ لیکن کبھی تم نے سوچا کہ دُنیا اُس کی بے غیرتی اور دناءت کا علم رکھنے کے باوجود اُس کا ساتھ دے رہی ہے۔ اور تم غیرت مند و شریف النفس ہو کر بھی ابنائے زماں کے ہاتھوں خوار ہو رہے ہو۔ عزیز دوست! اس جہان میں کمزوری کا نام موت اور قوت کا نام زندگی ہے۔ یہاں طاقت کے دیوتا کی پرستش ہوتی ہے اور ضعف و انحطاط کے پجاریوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ جو شخص طعن خلق سے ڈرتا ہے وہی مٹ کر رہ جاتا ہے۔ اور جو دھڑلے سے سماج کے خودساختہ معیارِ اخلاق ضابطہ معاشرت کو پسِ پشت ڈال کر لوگوں کو دعوتِ مبارزت دیتا ہے وہی پھلتا

پھولتا ہے۔ حق و صداقت کو کوئی نہیں جانتا۔ طاقت کی قدر ہے، دولت کی قدر ہے۔ پروپاگنڈا کی قدر ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ بے حیائی و ضمیر فروشی کی قدر ہے۔ مَیں نہیں کہتا کہ تم بھی بے حیائی اور ضمیر فروشی کا جامہ پہن لو۔ میرا مدعا یہ ہے کہ دُنیا کی رائے کو بالکل اہمیّت نہ دو۔ جمہور کی تعریف و مذمت کے ساتھ اپنی مسرّت اور اپنے رنج کو ہرگز وابستہ نہ کرو۔ جو لوگ ہر کام میں عوام کی سندِ خوشنودی ہی کو معراج کامرانی سمجھتے ہیں وہ آخرکار عوام ہی کے ہاتھوں ذبح ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی انفرادیت ضائع کر بیٹھتے ہیں۔ اور اُن کی زندگی کا انحصار عوام کالانعام کی ہر لحظہ بدلتی ہوئی رائے پر ہوتا ہے۔ مَیں تمہارے اس خیال سے اتفاق کرتا ہوں کہ لوگوں کے سامنے اپنی صداقت و برات کے ثبوت پیش کرتے پھرنا کمینگی کی بدترین صورت ہے۔ دُنیا کو کسی معاملہ میں حکم بنا لینا ذہنی تنزل کے علاوہ ارادے کی کمزوری، اخلاق کی پستی اور فہم و ادراک کی بے حسی کی علامت ہے۔ تم نے غلطی کی کہ لاہور چھوڑ کر چھاؤنی چلے آئے۔ تمہارے یہاں آجانے کو لوگ فرار سے تعبیر کرکے تمہاری بزدلی پر خندہ زن ہیں تمہیں چاہیئے تھا لاہور میں رہتے اور وہیں رائے عامہ کو سرپائے استحقار سے ٹھکرا کر اپنے عزم و ارادہ سے مخالفت کے بادلوں کو پارہ پارہ کر ڈالتے۔ بہرحال اب کہ تم لاہور سے چلے آئے ہو اور کالج جانا

بھی تم نے عملاً ترک کر دیا ہے میری بھی رائے ہے کہ دہلی چلے چلو۔ وہاں بھی قانون کی تعلیم کا معقول بندوبست ہے اگر چاہو گے تو دہلی یونیورسٹی میں داخلہ کا انتظام ہو سکتا ہے۔

شہید نے سر کو نفی میں جنبش دیتے ہوئے کہا "یہ نہیں ہو سکتا۔ چھاؤنی میں رہنے سے یہ فائدہ ہے کہ میں لاہور سے باہر بھی ہوں اور لاہور کے اندر بھی ہوں۔ جہاں اطمینان و شہرت کو کھویا ہے انہیں حاصل بھی وہیں کرونگا۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ جس چیز کو لاہور میں کھو چکا ہوں اُسے دہلی میں تلاش کروں۔ میں نے تم سے ایک نہایت اہم بات کا ذکر نہیں کیا۔ احتشام کی لڑکی سے نکاح کرتے وقت میں نے پانچ ہزار کا مہر باندھ دیا تھا۔ اور اب احتشام نے میرے خلاف اُسی پانچ ہزار کا دعوےٰ دائر کر رکھا ہے۔ عدالت سے سمن جاری ہو چکے ہیں لیکن چونکہ میری جائے قیام کا صحیح علم ایک آدھ شخص کے سوا کسی کو نہیں اس لئے اب تک تعمیل نہیں ہو سکی۔"

میں نے افسوس و حسرت کے ساتھ کہا۔ "تو یوں کہو کہ تم نے اپنے ہاتھ پاؤں کاٹ دینے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔ بالفرض اگر سمن کی تعمیل سے تم کچھ مدت گریز کرنے میں کامیاب بھی ہو گئے تو کیا عدالت تمہاری غیر حاضری کو نظر انداز کر کے تمہارے خلاف یک طرفہ ڈگری صادر نہیں

کر سکتی ؟ احتشام تمہیں دق کرنے کی ہر ممکن تدبیر کو کام میں لانے والا انسان معلوم ہوتا ہے۔ اور اگر ڈگری ہو گئی تو روپیہ کہاں سے لاؤ گے؟"

"آہ میں کیا بتاؤں۔ یہاں کھانے کو نہیں ملتا، تم پانچ ہزار کی رقم کا ذکر کرتے ہو۔"

میں نے شہید کو اس دوران میں پہلی مرتبہ یاس انگیز تاسف کے ساتھ بے قرار ہوتے دیکھا۔ اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں دبا لیا۔ اور جب نظریں اوپر اٹھائیں تو اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے چمک رہے تھے مجھے اس پر رحم آیا۔ یہ نوجوان جو ہمیشہ بنا ٹھنا رہنے میں مشہور اور دنیا کے شور و غوغا کو حقارت آمیز تبسم سے دیکھ کر اپنے حال پر نازاں رہنے کا عادی تھا آج اپنے ذکی الحس جذبات کے ہاتھوں اپنی ہی ایک معمولی سی غلطی کو پہاڑ بنا کر اس بوجھ کے نیچے پسا جا رہا تھا۔ اس نے دوسری طرف منہ پھیر کر آنکھوں کو رومال سے خشک کرتے ہوئے کہا "جہاں تک مجھے علم ہے احتشام کو روپیہ کی ہوس نہیں۔ اس کی شدید خواہش ہے کہ کسی طرح مجھے قید خانے بھجوا دے۔ اگر میرے خلاف ڈگری ہو گئی اور میں روپیہ ادا نہ کر سکا تو احتشام کی یہ خواہش ضرور پوری ہو کر رہے گی۔"

میں نے خلوصِ دل سے شہید کو دہلی چلنے کی دوبارہ دعوت دی۔ لیکن وہ میانمیر میں رہنے پر مصر تھا۔ بالآخر میں نے اُسے مشورہ دیا کہ وہ

والد کے پاس چلا جائے۔ اُس کی موجودہ قابلِ رحم حالت دیکھ کر اُن کی شفقت پدری ضرور جوش میں آئیگی۔ اور اُس کے مصائب کا ایک حد تک خاتمہ ہو جائیگا۔ مگر اُس کے دماغ میں یہ بات پایۂ یقین تک پہنچ چکی تھی کہ والد اُسے ہرگز معاف نہیں کرینگے۔

ان تکلیف دہ رُوحانی، جسمانی اور اقتصادی قیود میں شہید کو گرفتار چھوڑ کر میں مجبوراً دوسرے روز دہلی لوٹ آیا۔ روانہ ہوتے وقت مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنی بے استطاعتی کا شدید احساس ہؤا۔ اگر میں صاحبِ حیثیت انسان ہوتا تو یقیناً پانچ ہزار کی رقم شہید کے حوالے کر کے اُسے اس عذاب سے نجات دلا دیتا۔ میرے دہلی آجانے کے چند ہی ہفتے بعد احتشام نے اپنے اثر و رسوخ سے شہید کے خلاف عدالت سے پانچ ہزار کی ڈگری حاصل کر لی۔ اور جب شہید نے اس رقم کے ادا کرنے سے معذوری کا اظہار کیا تو احتشام نے بلا توقف اُس کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کرا دیئے۔ آسمان نے اپنے ترکش کا آخری تیر چلا دیا اور ذلت و رسوائی کے لبالب بھرے ہوئے پیالے میں تباہی کا آخری قطرہ اگرا۔ جس بات کا تصوّر ہی جسم کے رونگٹے کھڑے کر دیتا تھا آخر اُس نے واقعیت و حقیقت کا جامہ پہن لیا۔ اور شہید کی خستگی و درماندگی کے محضر پر گویا بربادی کی آخری مہر ثبت ہو گئی۔

اپنی اس دردناک مصیبت میں بھی شہیدؔ نے میرے پاس آنا گوارا نہ کیا۔ شاید اُس کے غرور نے اجازت نہ دی کہ وہ اپنی عزّت و نیک نامی کے جنازے کو کندھا دینے کے لئے اُس دوست کو انتخاب کرے۔ جس کی نظروں میں اُس کے عروج و کمال کے شاندار دنوں کا نقشہ ہنوز باقی تھا۔ وہ انتہائی سراسیمگی اور انتشار کے عالم میں کسی چور کی طرح لوگوں کی نگاہوں سے چھپ کر ایک رات چپکے سے پشاور بھاگ گیا۔ اُس کے سامنے دو ہی راستے تھے، فرار یا جیل۔ اُس نے مقدّم الذکر راستے کو ترجیح دی کیونکہ اُسے یقین تھا کہ لاہور یا لاہور کے قرب و جوار میں رہنا قید خانہ میں داخل ہونے کے برابر تھا۔ وہ کسی ایسے مقام پر جانا چاہتا تھا جہاں اُس کے چلے جانے کا دشمنوں کو سان گمان بھی نہ ہو۔ اسی لئے اُس نے پشاور پسند کیا۔ اُس کے بہت دُور کے قرابت داروں میں ایک شخص پشاور میں بہ سلسلہ ملازمت مقیم تھا اور شہیدؔ اُسی کے پاس گیا تھا۔

یہ شخص اتفاق سے مدت کے بعد ایک مرتبہ مجھ سے ملا اور اُس نے شہیدؔ کے ورودِ پشاور کی کیفیت ان الفاظ میں بیان کی کہ "جسم پر صرف ایک قمیص اور پاجامہ، پاؤں میں پھٹا ہوا بوٹ، سر پر بغیر پھندنے کے میلی سی ترکی ٹوپی۔ داڑھی کے بال، جنہیں کئی روز سے اُسترا نصیب نہ ہوا تھا، چیونٹیوں کی طرح چہرے کو سیاہ کئے ہوئے سر کے بال پریشان

اور سفر کی وجہ سے گرد آلود۔ جیب میں صرف ڈیڑھ روپیہ کی ریزگاری، ہمراہی میں ایک بستر اور ٹرنک۔ اس وضع قطع میں شہید پشاور کے اسٹیشن پر اُترا۔"

اُس کے میزبان کا قول ہے کہ "جب شہید اُس کے مکان پر پہنچا۔ تو اُس کے چہرے سے وحشت اور دیوانگی کے آثار ٹپک رہے تھے۔ جنہیں دیکھ کر اُس کو پہچاننا تک مشکل ہو گیا تھا۔ وہ خوف زدہ ہو کر اُس خرگوش کی طرح جو شکاری کتّوں سے بچ کر اپنے بھٹ کی طرف بھاگ رہا ہو۔ بار بار پیچھے مُڑ کر دیکھتا تھا کہ شاید اب بھی کوئی دشمن اُس کا تعاقب کر رہا ہو۔"

وہ کم و بیش ڈیڑھ برس پشاور میں رہا۔ ابتدائی دو مہینے تو اُس نے کامل تعطل اور بیکاری میں بسر کر دیئے۔ اُس کا ذہنی اختلال ایسی خطرناک صورت اختیار کر گیا تھا۔ کہ وہ کوئی کام دل جمعی اور یکسوئی سے نہ کر سکتا تھا۔ مستقبل کے اندیشے، ماضی کا غم، حال کا افسوس، یہ سب خوفناک بھوت ہر وقت اُس کے دل و دماغ پر سوار رہتے تھے۔ وہ اپنے اندر صرف علمی و ادبی کام کی استعداد رکھتا تھا۔ اور اب پیہم تفکّر و انتشار سے اُس کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ جب کبھی قلم اور کاغذ لے کر بیٹھتا تو گھنٹوں یونہی جھنجھار رہتا۔ اور خیالات دماغ کی اُلجھنوں سے نکل کر زبانِ قلم تک

پہنچنے سے قبل ہی منتشر ہو جاتے تھے۔ وہ جھنجھلا کر اُٹھ کھڑا ہوتا اور اپنی بے بسی پر کبھی رنج و غصہ اور کبھی غم و الم کے آنسو بہانا شروع کر دیتا تھا۔ ایک وقت تھا کہ وہ ازراہِ تفاخر و تعلّی اپنے آپ کو الفاظ کا بادشاہ کہا کرتا تھا اور اب خود اُس کے جذبات اظہار کے لئے بے تاب تھے۔ لیکن اُس کی زبان گنگ ہو گئی تھی اور قلم ٹوٹ گیا تھا۔

مسلسل مغموم و پریشان رہنے سے اُس کے دماغ میں ایک لکیر سی بن گئی تھی۔ اور خیالات کی رو اُسی لکیر پر چلنے کی عادی ہو چکی تھی۔ وہ ہزار ہا وقت اپنی توجّہ کسی اور طرف مبذول کرنے کی کوشش کرتا تھا کبھی کوئی دلچسپ کتاب پڑھتا، اخبار کا مطالعہ کرتا یا پشاور کی سیر گاہوں اور آدمیوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے بازاروں کی سیر کرتا تھا لیکن پھر پھر کر اُس کے خیالات کا سلسلہ اُسی مرکز پر آ ٹھہرتا تھا جہاں سے نکال لینے کی اُس نے سعیِ بلیغ کی تھی۔ کئی کئی دن وہ گھر کی چار دیواری سے باہر قدم نہ رکھتا یہ خیال ہی کہ وہ مفرور مجرم کی حیثیت سے یہاں روپوش ہے خود اُسے اپنی نظروں میں ذلیل کر رہا تھا۔ اُس کے میزبان نے حد درجہ ملاطفت و محبّت سے اُسے مشورہ دیا کہ وہ اس فرصت میں قانون کی کتابیں ہی دیکھنا شروع کر دے تاکہ آئندہ سال خانگی طور پر امتحان دے سکے۔ لیکن اُس نے اپنے دماغ کو عاجز و درماندہ اور اپنے خیالات کو بے ربط و پریشان پا کر یہ مشورہ

قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جو شخص دس منٹ بھی کامل یکسوئی سے کسی مسئلہ پر غور کرنے کے قابل نہ تھا اُس کے لیے قانونی موشگافیوں کا مطالعہ تقریباً ناممکن سی بات تھی۔ پھر اُس کے عزیز نے یہ بھی کہا کہ اگر شہید چاہے تو اُس کے لیے پشاور میں کہیں ملازمت کا بندوبست ہو سکتا ہے بلکہ شہید نے ملازمت سے بھی انکار کر دیا۔ اس غربت و بیکسی میں بھی لاہور، کامیابی، عروج، تمکنت اور وجاہت کے خواب ہنوز اُس کے دماغ میں چکر لگا رہے تھے۔ یہ تو ممکن تھا کہ وہ چند ماہ یا ایک آدھ سال کے لئے گذر اوقات کی خاطر کہیں چھوٹی موٹی سی عارضی نوکری کر لے لیکن یہ اُسے کسی صورت گوارا نہ تھا کہ ہمیشہ کے لئے کوئی حقیر سا ذریعہ معاش اختیار کر کے تمام عمر قعرِ گمنامی میں پڑا رہے۔ اُسے رہ رہ کر یقین آتا تھا کہ افلاس و مصیبت اور ذلت و حقارت کے یہ بادل ایک نہ ایک دن ضرور چھٹ کر رہیں گے اور اُس کے مطلع حیات پر یقیناً کامیابی و مسرت کا آفتاب طلوع ہوگا۔

رنج و اندوہ کا طوفان آہستہ آہستہ گذرتا گیا اور شہید کے خیالات پر غم و غصّہ کی جس خوفناک تندی نے غلبہ پا رکھا تھا وہ بھی وقت کے ساتھ ساتھ کم ہوتی گئی۔ دو مہینے کے بعد اُس کے دل و دماغ کی حالت کسی حد تک اعتدال پر آ گئی۔ اور اُس نے سکون کے ساتھ حالاتِ ناساعد

کا مقابلہ کرنے کا عزم راسخ کر لیا۔ اُس نے اپنے دوستوں، عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ ہر قسم کی خط و کتابت بند کر رکھی تھی تاکہ اپنی موجودہ جائے پناہ کو پردۂ خفا میں رکھ سکے۔ لاہور میں کسی کو اس کی نقل و حرکت کا صحیح علم نہ تھا اور اُس کے یکایک غائب ہو جانے کو لوگ تعجب اور تاسف کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ دو مہینے بیکاری میں بسر کر دینے کے بعد اُس نے خیال کیا کہ یوں اپنے میزبان کے لئے بارِ خاطر بنے رہنا سخت شرمناک بات ہے۔ اُس نے خود بھی کوشش کی اور اُس کے میزبان نے بھی اپنے اثر و رسوخ سے کام لیا اور چند روز کے اندر اُسے پشاور کے بعض امراء کے بچّوں کی تعلیم و تدریس کا کام مل گیا۔ یہ کام ایک حد تک اُس کی طبیعت کے موزوں اور ذوق کے مطابق تھا۔ چنانچہ اس نے پوری سرگرمی کے ساتھ اپنے فرائض ادا کرنا شروع کر دیئے۔ قلیل عرصہ میں اس کی شہرت بحیثیت ایک قابل معلّم اور اتالیق کے شہر بھر میں پھیل گئی اور اُسے اس کثرت سے کام ملا کہ فراغت کا وقت بچانا اس کے لیے مشکل ہو گیا مالی لحاظ سے اُس کی حالت کافی سدھر گئی تھی۔ جسمانی و دماغی صحت بھی ترقی کر گئی تھی۔ اور وہ ایک اعتبار سے مطمئن زندگی بسر کرنے لگا تھا۔ لاہور جانے کا خیال اُس کے دل کی گہرائیوں میں بدستور انگڑائیاں لے رہا تھا اور کبھی کبھی اُسے خیال آتا کہ اگر وہ واپس لاہور چلا جائے تو کیا ہو گا۔

وہ اپنی تعلیم کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے سخت بے تاب تھا لیکن لاہور جاکر باعزت زندگی بسر کرنے اور تعلیمی مصارف مہیّا کرنے کے وسائل سراسر مفقود تھے۔ اُس نے یہاں ایک وکیل سے مشورہ کر کے معلوم کیا کہ ڈگری کا روپیہ ادا نہ کرنے کے باعث دیوانی عدالت سے جو وارنٹ گرفتاری جاری ہوتے ہیں اُن کی میعادِ عمل تاریخ اجراء سے لے کر ایک خاص وقت تک جس کا تعیّن عدالت پہلے ہی کر دیتی ہے محدود ہوتی ہے۔ اگر اس میعاد کے اندر شخصِ مطلوبہ گرفتار نہ ہو سکے تو وارنٹ عدالت متعلقہ میں واپس چلے جاتے ہیں اور مدعی جب چاہے اُن کو دوبارہ جاری کرا سکتا ہے۔ اُس نے سوچا کہ اس لحاظ سے اُس کی گرفتاری کے جو وارنٹ جاری ہوئے تھے اب تک یقیناً عدالت میں واپس بھیجے جا چکے ہونگے لیکن اگر وہ لاہور چلا گیا اور احتشام نے دوبارہ وارنٹ جاری کرا دیئے تو پھر کیا ہوگا؟ یہی ایک خیال تھا جو بار بار پیدا ہو کر اُس کے لئے سوہانِ روح ثابت ہو رہا تھا اور وہ پشاور سے جنبش نہ کر سکتا تھا۔ کبھی کبھی ہندوستان سے باہر جانے کا خیال بھی اُس کے دماغ میں نمودار ہوتا تھا۔ لیکن یہ خیال دلچسپ ہونے کے ساتھ ہی ناممکن العمل بھی تھا۔ کیونکہ غیر ملک، بالخصوص بلادِ مغرب میں جانے کے لئے سرمایہ درکار تھا، اور شہید کی موجودہ حالت یہ تھی کہ وہ اپنی حد درجہ

غیر یقینی اور غیر مستقل آمدنی میں صرف جان و جسم کا رشتہ بحال رکھے ہوئے تھا۔

ڈیڑھ سال انہی خیالات کی بھول بھلّیاں میں ٹاپک ٹوئیے مارتے بسر ہو گیا اور خلافِ توقع شہیدؔ کے میزبان کا ایک دُور دراز مقام پہ تبادلہ ہو گیا۔ اب شہید کے لئے دو ہی صورتیں تھیں، یا پشاور میں رہے یا پشاور چھوڑ دے۔ اُسے یقین ہو گیا تھا کہ پشاور میں مزید قیام قطعاً بے سود ہے۔ چنانچہ ہمّت و استقلال سے کام لے کر اس نے لاہور جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ اس کبھی نہ ختم ہونے والے تذبذب" اس جان لیوا خلش اور اس مصیبت ناک انتظار سے تنگ آگیا تھا۔ اُس نے تمام پہلوؤں پر غور کر کے ارادہ کر لیا کہ وہ بدترین مصائب کا سینہ سپر ہو کر مقابلہ کرے گا۔ وہ مشکلات کی عمیق وادیوں اور تکالیف کی دشوار گذار گھاٹیوں کو عزمِ صمیم کی قوّت سے عبور کر لے گا، لیکن موجودہ دورِ تعطّل کو ہرگز طول نہ دیگا۔ ان خیالات و عزائم کے ماتحت اُس نے پشاور کو الوداع کہی۔

دسمبر کی ایک صبح تھی جب وہ لاہور کے اسٹیشن پر اُترا۔ ضبط کی ہزار کوششوں کے باوجود اُس کے قلب میں اضطراب اور دماغ میں ہیجان برپا تھا۔ بارش ہو کر ابھی ابھی مطلع صاف ہوا تھا اور سرد ہوا

تیزی سے چل رہی تھی۔ اُس نے اوورکوٹ کا کالر اُوپر اُٹھا کر کانوں کو
ڈھانپ لیا اور ٹرنک سے گرم اُونی ٹوپی نکال کر سر پر اوڑھ لی جس
سے اُس کے چہرے کا نصف حصّہ اچھی طرح چھپ گیا۔ اس اہتمام سے
صرف سردی سے محفوظ رہنا ہی مقصود نہ تھا بلکہ وہ اپنے آپ کو
لوگوں کی نگاہوں سے بھی بچانا چاہتا تھا۔ جب وہ اسٹیشن کے اندرونی
حصّے سے نکل کر باہر ڈیوڑھی میں آ کر کھڑا ہوا تو اس کے اعصاب میں ایک
کپکپی سی دوڑ گئی۔ لاہور کی خوشنما کشادہ سڑکوں کا جال اور تر و تازہ گھاس
کے خُوبصورت وسیع قطعے اُس کی نظروں کے سامنے بکھرے پڑے تھے۔
مسافروں کی گہما گہمی اور قلیوں کا شور بدستور موجود تھا۔ ریل کے ملازم
اپنے فرائض کی ادائی میں بہت مستعدی سے اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے
تھے۔ پولیس کے سنتری اپنے افسر کے سامنے نہایت متانت و وقار
سے اپنی اپنی جگہ کھڑے انتظام میں مصروف تھے۔ اور مسافروں سے
لدے ہوئے تانگے شہر کی سمت بھاگے چلے جا رہے تھے۔ غرضکہ
لاہور اپنی تمام دلآویزیوں اور ہنگامہ خیزیوں کے ساتھ زندہ تھا۔ اور
شہریار ؟ . . . . وہ ایک کونے میں کھڑا
حسرت بھری آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ بہت سے حسیّات و
جذبات جو مدّت سے سوئے پڑے تھے اب آناً فاناً جاگ اُٹھے تھے۔ اُسے

لاہور پہنچ کر فکر ہوئی کہ اب کس طرف کا رُخ کرنا چاہیئے۔ پہلے اُس نے چھاؤنی جانے کا ارادہ کیا لیکن پھر خود ہی یہ خیال ترک کر دیا۔ اُس کے ہمراہ کچھ سامان تھا جسے اُس نے اسٹیشن پر ایک سرکاری ملازم کی حفاظت میں رکھوا دیا اور خود تن تنہا پیدل نکل کھڑا ہوا۔ آج وہ اُسی بلدۂ حسن و موسیقی اور مدینۂ شعر و شباب میں موجود تھا۔ جہاں سے ڈیڑھ سال قبل وہ چوروں کی طرح چھپ کر بھاگا تھا۔ اُس کی رگوں میں خون تیزی سے حرکت کر رہا تھا۔

وہ سڑکوں پر چلتا رہا۔ کوٹھیوں، بنگلوں اور راہ گیروں کو حیرت کی نگاہ سے دیکھتا رہا۔ دن اُسے معمول سے زیادہ روشن اور ہوا معمول سے زیادہ خوشگوار معلوم ہوتی تھی۔ امپریس روڈ طے کر کے اپنی محبوب سڑک میکلوڈ روڈ پر پہنچا۔ اُن ہوٹلوں اور قہوہ خانوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا جہاں، اُس نے اپنے دورِ بہاریہ میں دوستوں کی صحبت میں کئی کئی گھنٹے قہقہوں اور بذلہ سنجیوں میں بسر کئے تھے۔ چپّہ چپّہ پر عہدِ ماضی کی رُوح پرور داستانوں کی یاد اُس کے دماغ میں برق آسا سُرعت کے ساتھ تازہ ہو رہی تھی۔ وہ کچھ عرصے کے لئے اپنی موجودہ درد انگیز حالت کو بھول گیا۔ اور محسوس کرنے لگا کہ وہ آج سے چند سال قبل والا شہید ہے جو لاہور کی زندہ دل ہنگامہ پرور اور معمورِ مسرت آبادی کا ایک فرد تھا جہاں سے مختلف سمتوں کو

سڑکیں جاتی ہیں۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے رُکا اور سوچنے لگا کہ مال کا رُخ کروں یا انارکلی کی طرف چلوں۔ وہ اب تک آبادی سے کتراتا اور انسانوں کے ہجوم سے بچتا ہوا آ رہا تھا۔ شہر میں داخل ہونے سے اُسے گھبراہٹ سی محسوس ہوتی تھی۔ لیکن اُس نے فوراً ہی فیصلہ کر لیا کہ انارکلی ضرور جاؤں گا۔ وہ اپنے پُرانے کالج کے قریب سے گُذرا جہاں اُس نے زندگی کے بہترین چار سال نہایت نیک نامی سے بسر کئے تھے۔ ایک درخت کے نیچے کھڑے ہو کر اُس نے کالج کے احاطے اور اُس کی عمارت پر نظر دوڑائی۔ طلبہ دو دو چار چار کی ٹولیوں میں ہنستے کھیلتے اور گپیں لگاتے ہوئے ٹہل رہے تھے۔ کچھ گھاس کے میدان میں بیٹھے مصروفِ مطالعہ تھے اور باقی کمروں میں اُستادوں کے لیکچروں سے مستفید ہو رہے تھے۔ چند قدم آگے جا کر اُسے ہوسٹل کی سہ منزلہ خوبصورت عمارت نظر آئی۔ اُس کا دل بلّیوں اُچھلنے لگا۔ اُس نے چاہا کہ اندر داخل ہو کر اُس کمرے کی دہلیز کو بوسہ دے جہاں اُس نے بی اے کا آخری سال بصد شان و شوکت بسر کیا تھا۔ اُس کے قدم کسی مقناطیسی قوت کے زیرِ اثر پھاٹک کی طرف اُٹھے لیکن فوراً ہی رُک گئے۔ وہ اس ارضِ پاک کو جہاں مسرت، بےفکری، اطمینان، اور فارغ البالی کی روحیں بستی تھیں حزن و ملال اور رنج و بیکسی کی آہوں سے ملوث کرنے کا مجاز نہ تھا۔ مجبوراً وہ بےبس پجاری کی طرح

جو دیوتاؤں کے حکم کے ماتحت مقدس قربان گاہ کو چھونے کے حق سے محروم کر دیا گیا ہو اُس نے سڑک پر کھڑے کھڑے نیاز مندانہ بن کر ہوسٹل کی دیواروں، دریچوں اور دروازوں کو خراجِ عقیدت پیش کرنا شروع کیا۔ بالائی منزل کی مشرقی جانب ایک کمرے کی کھڑکیاں کھلی تھیں۔ اُسے یاد آ گیا کہ بی اے کا سالِ اوّل اُس نے اسی کمرے میں گذارا تھا۔ یونیورسٹی کے امتحان کا ہوّا سر پہ نہ تھا اور خدا ہی جانتا ہے کہ یہ سال کن کن دلچسپیوں دلآویزیوں اور شرارتوں سے لبریز تھا۔ وہ حیران تھا کہ اگر اس کمرے کے در و دیوار کو قوتِ گویائی عطا ہو جائے تو وہ اپنے موجودہ مکین کو عہدِ رفتہ کے کیسے کیسے عجیب و غریب اور دلچسپ افسانے سُنائیں۔ نہیں معلوم اب اس کمرے میں کون رہتا ہے۔ اُس کا ذوقِ آرائش کیسا ہے اور اُس نے کمرے کا سامان کس ترتیب سے سجا رکھا ہے۔

شہید انہی خیالات میں محو گرد و پیش سے بالکل بے خبر اُس دیہاتی کی طرح جو لاہور میں پہلی مرتبہ وارد ہوا ہو سڑک کے کنارے کھڑا چونے اور گارے کی بلند عمارت کو ٹکٹکی باندھے تک رہا تھا کہ ایک موٹر زور سے ہارن بجاتی ہوئی عین اُس کے قریب سے گذری اور وہ اس شور سے چونک کر ہوش و حواس کی دُنیا میں لوٹ آیا۔ ایک لمبی سانس لے کر اور آنکھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ دھیرے دھیرے نیلے گنبد کی

طرف چل پڑا۔ انار کلی میں داخل ہوا تو تانگوں، بائیسکلوں اور موٹروں کے شور، پیدل چلنے والوں کے اژدحام اور دکانوں کی کثرت کے باعث اُس کی توجہ تخیّل کی دُنیا سے نکل کر واقعیّت کے عالم میں آگئی۔ وہ ہر راہ رو کو غور سے دیکھتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ کئی آشنا راستے میں ملے لیکن وہ آنکھ بچا کر چپکے سے نکل گیا۔ ایک چھوٹے سے ریسٹوران میں داخل ہو کر اُس نے پیٹ بھر کر ناشتہ کیا۔ خلوئے معدہ کی حالت میں اتنی دیر تک پیدل چلنے سے اُس کی اشتہا خوب چمک اُٹھی تھی۔ جب انار کلی ختم کر کے لوہاری دروازے کے چوک میں پہنچا تو اُس نے اخبار فروش سے ایک تازہ پرچہ خریدا اور سامنے باغ میں ایک بنچ پر جا بیٹھا۔ افتتاحیہ، مختصر مقالات اور خبریں پڑھ چکا تو اُس کی نظر اشتہارات پر پڑی۔ ایک مشہور مقامی روزنامہ کے مہتمم کی طرف سے اشتہار شائع ہوا تھا، کہ اُنہیں ایک قابل مترجم کی ضرورت ہے جو تعلیمی لحاظ سے گریجوایٹ ہو اور بے تکلفی سے انگریزی سے اُردو اور اُردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنے کی اہلیّت رکھتا ہو۔ شہید نے دو تین مرتبہ اشتہار کی عبارت پڑھی اور پھر اخبار ہاتھ سے رکھ کر گہری سوچ میں پڑ گیا۔ "اگر اُسے یہ اسامی مل جائے تو کیا ہی اچھا ہو۔ لاہور میں روزگار میسّر آجائیگا اور وہ شاید اس طرح اپنی تعلیم کو بھی حدِّ اختتام تک پہنچا سکے۔"

امید ایک برقی رو کی طرح اُس کے جسم میں سنسناہٹ کے ساتھ دوڑ گئی اور اُس کا چہرہ جذبات کے تہیج سے سُرخ ہو گیا۔ نصف گھنٹہ وہ سوچتا رہا۔ ممکنات و ناممکنات کی دُنیا کو اُس نے خیال ہی خیال میں چھان مارا۔ پھر امید و بیم کی شورش سے لڑکھڑاتے ہوئے جسم کو لے کر اُٹھا۔ اخبار فروش سے اس روزنامہ کے دفتر کا پتہ دریافت کیا اور جلدی کے خیال سے تانگہ لے کر منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہو گیا۔ دفتر میں پہنچ کر مہتمم کے سامنے حاضر ہو کر اُس نے اپنی آمد کی غرض بتائی۔ اُسے یہ معلوم کر کے گونہ اطمینان ہُوا کہ ابھی جگہ خالی تھی۔ اگرچہ ایک سے زیادہ امیدوار قسمت آزمائی کر چکے تھے۔ مہتمم نے اُسے ایڈیٹر کے کمرے میں بھیج دیا۔ کہ آخری انتخاب انہی کے ہاتھ میں تھا۔ ایڈیٹر ادھیڑ عمر کے آدمی تھے۔ عینک شیشوں کے اندر سے اُن کی آنکھوں کی چمک ذہانت اور معاملہ فہمی کو واضح کر رہی تھی۔ شہید جب حرفِ مدعا زبان پر لایا تو اُس نے کوشش کی کہ بہترین الفاظ میں اپنا مافی الضمیر ادا کرے۔ وہ اس راز سے واقف تھا کہ پہلی ملاقات میں دوسرے کو متاثر کر لینا گویا مستقبل کی کامیابی کا پورا زینہ طے کر لینے کے برابر تھا۔ ایڈیٹر کے استفسار پر اُسے اعتراف کرنا پڑا کہ اُس نے آج تک کسی اخبار میں کام نہیں کیا اور نہ اُسے صحافت کا اصلی تجربہ ہی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ ایک تعلیم یافتہ شخص کے لئے جو بالالتزام اخبارات کا مطالعہ کرتا ہو، جسے ہند

اور بیرون ہند کی سیاسی و معاشرتی تحریکات کا پورا علم ہو اور جس نے اقتصادیات، تاریخ ایسے علوم کو کالج میں طالب علم رہ کر پڑھا ہو اخباری اصطلاحات پر ایک ہی دن میں عبور حاصل کر لینا چنداں مشکل نہیں۔

شہیدؔ نے بر سبیل تذکرہ اپنے مختصر افسانوں اور ادبی مضامین کا بھی ذکر کر دیا جو "سامری" کے فرضی نام سے ملک کے مشہور ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہتے تھے ایڈیٹر نے احترام آمیز نظروں سے شہیدؔ کو دیکھا۔ وہ "سامری" کے نام سے شائع ہونے والی تحریروں کو کئی مرتبہ خراج تحسین ادا کر چکا تھا۔ دل میں وہ شہیدؔ کی قابلیّت اور ادبی استعداد کا قائل ہو گیا تھا۔ اس کے معقول دلائل، اُس کے پُر شکوہ لیکن حد درجہ شگفتہ اندازِ گفتگو اور اُس کے صحیح لب و لہجہ نے اُس کے لئے انکار کی کوئی گنجائش نہ رکھی تھی۔ یونہی اتمامِ حُجّت کے لئے اُس نے پاس پڑا ہوا ایک انگریزی اخبار اُٹھا کر شہیدؔ کے حوالے کر دیا اور ایک مضمون پر نشان لگا کر کہا کہ اس کا ترجمہ کر دیجئے۔ یہ مضمون ایک نوجوان کی ناکام حیاتِ معاشقہ کی المناک روداد تھی، جس نے اپنی محبوبہ کے تغافل اور سرد مہری سے تنگ آکر خودکشی کر لی تھی۔ شہیدؔ نے ترجمہ پر بمشکل پندرہ منٹ صرف کئے ہوں گے اور "شکستِ قیمت دل کی صدا کیا" کے دلچسپ عنوان سے خبر مرتب کر کے ایڈیٹر کے پیش کر دی۔ عنوان کی جاذبیّت اور زبان و محاورہ کی خوبیوں نے ایڈیٹر کو مرعوب کر دیا اور اُنہوں نے مزید تفحص و جستجو کے بغیر شہیدؔ کے کام پر خوشنودی

کا اظہار کر کے اُسے ملازم رکھ لیا۔ ستّر روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کی اور وقت آنے پر آئندہ ترقی کا وعدہ بھی کیا۔

شہیدؔ نے اس عنایت و ذرہ نوازی کا صمیمِ قلب سے شکریہ ادا کیا۔ اور اپنی مسافرت اور غربت کا ذکر کر کے عرض کیا کہ اگر ایڈیٹر صاحب اجازت دیں تو وہ دو ایک روز کے لئے دفتر ہی میں قیام کر لے۔ تاکہ اس دوران میں اطمینان سے اپنے لئے کہیں علیحدہ مکان کا بندوبست کر سکے۔ ایڈیٹر نے بخوشی اجازت دیدی۔ اور وہ اپنی رگ رگ میں مسرت و ابتہاج کا طوفان سمیٹ کر دفتر سے نکلا تاکہ اسٹیشن جاکر اپنا سامان لے آئے۔ ستّر روپے اس وقت اس کی نگاہ میں ستّر ہزار کے برابر تھے اور وہ خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ تمام راہ بے خبری کے عالم میں چلتا رہا۔ پاؤں رکھتا کہیں تھا اور پڑتا کہیں تھا۔ واپس آیا تو اس نے اُسی روز سے باقاعدہ کام شروع کر دیا۔ شام تک اخبار کے لئے ضروری خبروں کا ترجمہ کرتا رہا۔ اطمینان و سکون حاصل ہو جانے کی وجہ سے وہ اپنے اعصاب میں نئی زندگی عود کرتی ہوئی محسوس کر رہا تھا اور ایڈیٹر اُس کی صلاحیت فنی استعداد کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

شام کے قریب وہ بہ فراغِ خاطر دفتر سے نکلا۔ آج وہ اپنے تئیں ایسا ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا گویا کئی من بوجھ اُس کے سر سے اُتر گیا ہے۔ وہ ذمہ داری کی گرانباریوں اور پابندیوں سے آزاد ہو کر اُس شخص کی مانند جو وقت کو

اپنے گھر کا غلام سمجھتا ہو بے فکری سے سڑکوں پر گھومتا رہا۔ مال پر پہنچا تو اُسے معاً مزنگ کا خیال آیا اور ساتھ ہی احتشام کے متعلق اُس کے تصوّرات میں ہلچل سی پیدا ہو گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ صبح ہی سے، جب سے وہ لاہور میں وارد ہوا تھا، اُسے رہ رہ کر احتشام کا خیال آ رہا تھا اور وہ حیران تھا کہ اگر احتشام کو اُس کی آمد کی اطلاع مل گئی تو کیا ہو گا۔ لیکن اُس انسان کی طرح جو تمام مصلحتوں اور اندیشوں کی طرف سے آنکھ بند کر کے جان ہتھیلی پر لے کر نکل آیا ہو۔ وہ ہر مصیبت کا خیر مقدم کرنے پر آمادہ تھا۔

لارنس کے بُت کے قریب پہنچ کر اُس کے پاؤں نے خود بخود مزنگ کی راہ اختیار کر لی۔ وہ سڑک کے کنارے تاریکی میں چلتا رہا۔ دُور سے اُسے احتشام کے مکان کا بالاخانہ نظر آیا اور اُس کا دل اضطراری طور سے دھڑکنے لگا۔ کسی قدر فاصلہ پر کھڑے ہو کر اُس نے مکان اور اُس کے احاطے پر ایک نظر دوڑائی۔ در و دیوار سے کچھ بے رونقی سی ٹپکی پڑتی تھی۔ صرف دو کمروں میں لمپ روشن تھے۔ ایک تو اُسے یاد آ گیا کہ باورچی خانہ تھا اور دوسرا غالباً زنانخانہ کا کوئی حصّہ تھا۔ برآمدہ، پائیں باغ، مردانہ نشست گاہ، سب تاریکی کے پردے میں چھپے ہوئے تھے۔ احاطہ میں ایک آدمی بھی چلتا پھرتا معلوم نہ ہوتا تھا۔ بیس منٹ کے قریب شہید وہاں کھڑا رہا۔ لیکن دو لمپوں کی روشنی کے سوا مکان میں کسی قسم کے آثارِ حیات نظر نہ آتے تھے۔ وہ

آگے نکل گیا۔ بے شمار خیالات اُس کی لوحِ دماغ پر متحرک تصاویر کی طرح ناچ رہے تھے۔ بعض بھولی ہوئی شخصیتیں ماضی کے دھندلکے میں سے نکل کر اُس کی آنکھوں کے سامنے آموجود ہوئی تھیں۔ اُسے وہ دن یاد آیا جب وہ پہلے پہل اس مکان میں ایک اجنبی کی حیثیت سے داخل ہوا تھا۔ پھر وہ زمانہ بھی اُس کی نظروں کے سامنے پھر گیا جب اُس نے ایک حد تک مالکانہ حیثیت سے اس مکان میں بودوباش اختیار کی تھی۔ اور پھر دردناک انجام کی یاد اُس کے حافظے نے بہ سُرعت تمام تازہ کر دی جب اُس نے انتہائی خستگی اور درماندگی کے عالم میں بہ چشمِ اشکبار و دلِ خونچکاں اس چاردیواری کو خدا حافظ کہا تھا۔

وقت گذر گیا۔ لیکن باتیں یاد تھیں۔ خدا جانے اب اس مکان میں بسنے والے کس حال میں ہیں اور شہید کو کن لفظوں میں یاد کرتے ہیں۔ اس دوران میں ایک ہستی کا خیال بار بار شہید کے دماغ میں پیدا ہوتا اور وہ ہر بار اُسے مٹانے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن جس شدّت سے وہ مٹاتا اُسی تندی سے وہ دوبارہ نمودار ہو کر اُس کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کر لیتا تھا۔ کسی چیز کو یاد رکھنے کا شاید آسان طریقہ یہی ہے کہ اُسے بھول جانے کی کوشش کی جائے۔ شہید تخیّلات کی دُنیا میں محو تھا۔ اس کی چشمِ تصوّر کے سامنے مختلف شکلیں بن بن کر بگڑ رہی تھیں لیکن اُس کے نہاں خانۂ دماغ

میں ایک ہی ہستی تھی جس کا نقشِ سعیٔ پیہم کے باوجود نہ مٹتا تھا۔ یہ احتشام کی لڑکی تھی۔ اُس کے ہونٹوں سے ایک سرد آہ نکلی۔ وہ سوچنے لگا کہ "گردشِ لیل و نہار بھی کیا کیا رنگ دکھاتی ہے۔ جب اُس نے بصد شوق و ارمان اس لڑکی سے رشتۂ مودّت باندھا تھا تو کسے معلوم تھا کہ آسمان اپنا ترکش خالی کرنے کے لئے اُسی کو نشانہ بنائے بیٹھا ہے اور جامِ مسرّت اُس کے لبوں تک پہنچتے پہنچتے تلخابۂ حیات میں مبدّل ہو جائے گا۔ وُہ شبہائے عشرت و روزہائے شادکام کا متوقع تھا۔ لیکن وا حسرتا کہ اُس کی ہر رات کانٹوں پر لوٹ لوٹ کر اور اُس کا ہر دن آتشِ سوزاں میں جل جل کر بسر ہوا۔ نامساعدتِ ایام کی کوئی تلخی نہ تھی جس کا ذائقہ اُس کے کام و دہن نے نہ چکھا اور حالاتِ ناسازگار کی کوئی سختی نہ تھی۔ جس کا تجربہ اُس کے دل و دماغ کو حاصل نہ ہوا ہو لیکن ......" اُس نے پھر ایک لمبی سانس لی اور اپنے ہی دل میں کہا۔ "خدا کا شکر ہے کہ مَیں ان آب و آتش کے طوفانوں سے زندہ بچ نکلا۔"

شہید نے مترجم کی حیثیت سے بڑی مستعدی کے ساتھ کام شروع کر دیا۔ قیام کے لئے اُس نے راوی روڈ پر ایک مختصر سا مکان بھی کرائے پر لے لیا۔ کچھ روپے اُس کے پاس موجود تھے جنھوں نے اُس کے ابتدائی اخراجات کی کفالت کر دی اور پھر ماہ بماہ اُسے تنخواہ ملنے لگی جس سے

وہ اپنی زندگی نہایت سہولت سے بسر کرنے کے قابل ہو گیا۔ رفتہ رفتہ اُس نے بے تکلفی سے لاہور کی سڑکوں، سیر گاہوں اور تماشا گاہوں میں آنا جانا شروع کر دیا۔ اب شام کو اُس نے اُسی پرانی سج دھج سے، ہاتھ میں لکڑی لے کر، بدن پر کبھی سوٹ کبھی شیروانی اور سر پر سرخ ٹوپی پہن کر سیر کے لئے نکلنا شروع کیا۔ دوست آشنا ملتے تو بڑی سرگرمی سے علیک سلیک ہوتی تھی لیکن شہید ان کے استفسارات کا تفصیلی جواب دینے کی بجائے رمز و کنایہ سے صرف یہ ظاہر کر دیتا تھا کہ وہ ہمہ درجہ مسرور و مطمئن زندگی بسر کر رہا ہے۔ اور گفتگو اس انداز سے کرتا تھا گویا اس کے حال میں اُس کے ماضی کا قطعاً کوئی دخل نہیں ظفر۔ عنایت۔ جمیل وغیرہ سبھی ملتے اور شہید کو خوش پوشاک، شاداں و فرحاں اور سر بلند و گردن کشاں پا کر دل میں حیران ضرور ہوتے تھے۔ وہ حقیقتاً اپنے سابقہ طرزِ عمل پر نادم ہو رہے تھے اور چاہتے تھے۔ کہ شہید سے از سرِ نو ربط و ضبط بڑھائیں۔ لیکن شہید جس پر چودھویں صدی کی شعلہ آشنا دوستیوں کا پول اچھی طرح کھل چکا تھا احتراز و کنارہ کشی کو ترجیح دیتا تھا۔ اُسے صرف ایک خلش بے چین کئے دیتی تھی۔ اور وہ احتشام کا خدشہ تھا۔ وہ حیران تھا کہ احتشام کہاں ہے، اگر لاہور میں ہے اور شہید کی موجودگی سے باخبر ہے تو کیوں خاموش ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی ہمدرد راز آشنا سے ملاقات ہو تو تفصیل سے معاملات دریافت کرے ورنہ یوں وہ ہرگز کسی سے اس موضوع پر گفتگو کرنے کو تیار نہ تھا۔ وہ اپنے طرزِ بود و ماند، اپنے

اطوار و حرکات، اور انداز معاشرت سے لوگوں پر یہی ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ ہر قسم کے تفکرات و خدشات سے پاک خوش و خرّم زندگی بسر کر رہا ہے۔

ایک روز اتفاقیہ اُسے اپنا پرانا ہم سبق دوست شفیق مل گیا جو قانون کے آخری امتحان سے فارغ ہو کر اب وکالت شروع کرنے کی فکر میں سرگرداں تھا۔ شفیق نے اُسے بتایا کہ "تمہارے لاہور سے چلے جانے کے بعد جب احتشام کو اپنے عزائم مشئومہ میں ناکامی نصیب ہوئی تو تمہارے اس طرح یکایک غائب ہو جانے کا کچھ عرصے تک یہاں خوب چرچا رہا۔ اکثر لوگ تمہارا تمسخر اڑاتے تھے۔ احتشام اپنی روسیاہی کو چھپائے رکھنے کی غرض سے نت نئی تہمتیں تمہارے خلاف تراشتا تھا۔ اور وہ تمام عیوب و نقائص جن کا ایک انسان میں موجود ہونا ممکن ہو سکتا ہے تمہاری طبیعت کا خاصہ بیان کئے جاتے تھے۔ میرے تمہارے مراسم کا ایک زمانہ کو علم تھا۔ اس لئے جب کبھی مجھے کسی شناسا سے ملنے کا اتفاق ہوتا تو اکثر و بیشتر گفتگو کا موضوع تمہاری ہی ذات ہوتی تھی۔ لوگ بغرض استفسار نہیں بلکہ بطورِ استہزا تمہارے متعلق پوچھتے رہتے اور بات بات میں طعن و تشنیع کے چبھتے ہوئے کلمات استعمال کرتے تھے۔ وقت اسی طرح گذرتا گیا اور تمہیں لاہور سے گئے ہوئے ابھی شاید پورا ایک سال نہ ہوا تھا کہ یہاں ایک عجیب واقعہ رُونما ہوا۔ احتشام کی لڑکی گھر سے زر نقد اور زیور کی صندوقچی لیکر ایک نوجوان کے ساتھ بھاگ گئی۔ احتشام نے اس حادثہ پر پردہ ڈالنے کی بے حد

کوشش کی لیکن بات نکل چکی تھی اور احتشام ندامت و شرمندگی کے ساتھ ذلّت و رسوائی کے تاریک گڑھے میں ایسا گرا کہ آج تک نیچے ہی نیچے دھنسا چلا جاتا ہے۔ مدت تک وہ اپنے مکان کی چار دیواری کے اندر بند رہا اور دنیا کو منہ نہ دکھا سکا۔

تم جانتے ہو جمہور کا حافظہ تو زیادہ قوی نہیں ہوتا۔ تمہاری غیر حاضری کی وجہ سے لوگ آہستہ آہستہ تمہیں فراموش کر گئے تھے کہ دفعتہً یہ واقعہ ظہور پذیر ہوا اور شدید ردِ عمل کے ساتھ لوگوں کی ہمدردی تمہاری طرف لوٹ آئی۔ سب تمہیں حق بجانب ٹھہرانے لگے اور جو کچھ تم نے کیا تھا وہ متفقہ طور پر شریفانہ اور غیرتمندانہ فعل قرار دیا جانے لگا۔ احتشام اب کس منہ سے تم پر بہتان طرازی کر سکتا تھا۔ جن ہتھیاروں سے وہ تمہارے خلاف مصروفِ پیکار تھا خود انہوں نے اُسے ایسا زخمی کیا کہ وہ اٹھنے کے قابل بھی نہ رہا۔ جس تن دہی اور چالاکی سے اُس نے رائے عامہ کو تمہارے خلاف مشتعل کیا تھا اُسی تن دہی سے اس کا ردِ عمل شروع ہوا۔ اور آج یہ حالت ہے کہ احتشام کو لاہور کے شرفا۔ اور ذی عزت اصحاب کے حلقہ میں شامل ہونے کی جرأت تک نہیں رہی۔ وہ شاذ و نادر ہی گھر سے نکلتا ہے اور لوگوں کو تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ لاہور میں ہے یا کہیں باہر چلا گیا ہے۔"

شہید کے چہرے پر سرخی سی دوڑ گئی اور اطمینان و کامیابی کے لہجہ میں کہنے لگا۔ "شفیق! میں نہ کہتا تھا کہ وقت ہی سب سے بڑا منصف ہے۔ وقت ہی کھوٹے کھرے اور حق و باطل کی پہچان کا ذریعہ ہے۔ اور وقت ہی دودھ کا دودھ

اور یانی کا پانی کر دکھاتا ہے؟ وقت ہی نے ہمارے درمیان فیصلہ کیا اور یاد رکھو یہی فیصلہ ناطق، برحق اور اٹل ہے۔"

شہید نے اپنی زندگی کے تمام گوشوں کو مامون و مصئون پاکر اُسی شانِ بے نیازی اور آئین خود داری سے رہنا شروع کیا جو ایک زمانہ میں اُس کا شیوۂ خصوصی مشہور تھا۔ لوگوں کو شرفِ دوستی بخشنے میں وہ بہ نسبت سابقہ بہت زیادہ بخیل اور محتاط ہو گیا تھا جس طرح ایک بیمار جسم زمانۂ علالت ختم کرنے کے بعد مرض کی سمیّت سے صاف ہو کر بہت جلد توانائی حاصل کرنا شروع کر دیتا ہے اور خود فطرت حصولِ صحت میں ہر قدم پر اُس کی ممد و معاون بن جاتی ہے۔ اسی طرح نفسِ انسانی جب زہرِ غم سے پاک ہو کر آرام و راحت سے ہمکنار ہوتا ہے تو خود بخود گذشتہ رنج و اندوہ اور یاس و حرماں کو بھول کر دنوں ہی میں مسرّت و شادمانی حاصل کر لیتا ہے۔ شہید اب طمانیتِ قلب اور رُوحانی انبساط کا مالک تھا کہ اس میں معمولی حوادثِ روزگار کا رخنہ انداز ہونا ممکن نہ رہا تھا۔

تیز و تند طوفانوں میں سے گذر کر اور فلک بوس لہروں سے دست و گریباں ہو کر جب بصد مشقّت و ہزار دشواری ساحلِ مراد تک رسائی نصیب ہو تو جس دیوانہ وار قوّت سے کنارے کو پکڑا جاتا ہے اُس کا اُس نحیف و زار گرفت سے کیا مقابلہ جو لبِ دریا کھڑے ہو کر موجوں کا تماشا دیکھنے والے سبک سارانِ ساحل کے نازک ہاتھوں کو حاصل ہے۔ شہید کے پاؤں اب ایک مضبوط چٹان پر

قائم تھے جہاں سے اُنہیں اُکھاڑنا بادِ مخالف کے جھونکوں کے لئے چنداں آسان نہ تھا۔ محبّت، دوستی، مخالفت، تموّل، عسرت، صحت، علالت، غم، مسرّت یہ سب چیزیں وہ یکے بعد دیگرے دیکھ چکا تھا۔ اور اب حیاتِ انسانی کے بہت سے پہلو اُس کی آنکھوں کے سامنے بے نقاب تھے۔ وہی لوگ جو ایک زمانہ میں اُسے ہدفِ طعن بنا چکے تھے اب اس گرمجوشی کے ساتھ ملتے تھے۔ گویا ماضی اور ماضی کے واقعات کبھی معرضِ وجود میں آتے ہی نہ تھے۔ وہ اس اخوّت نما منافقت کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتا تھا لیکن جب اُسے معلوم ہوا کہ زندگی اسی دھوپ چھاؤں اور بہروپ کا نام ہے تو اُس نے اپنے جذبات و احساسات کو یکسر علیحدہ رکھ کر خاموشی سے اس ناٹک کا تماشا دیکھنا شروع کر دیا۔

اخبار میں کام کرتے ہوئے اُسے سات مہینے گذر چکے تھے اور عملۂ ادارت پر وہ اپنی قابلیّت کا سکّہ اچھی طرح بٹھا چکا تھا۔ اُس کی جسمانی اور دماغی حالت نہایت اعلیٰ اور اقتصادی حالت کافی تسلّی بخش ہو گئی تھی۔ اب اُس نے اپنی ہمّت کے میدان کو مزید وسعت دینے کا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ جب نئے تعلیمی سال کا آغاز ہوا تو وہ فوراً لاء کالج میں داخل ہو گیا۔ اُس پر کام کی اہمیّت بخوبی روشن تھی اور وہ خوب جانتا تھا کہ اخبار کی ملازمت جاری رکھتے ہوئے قانون کا مطالعہ شروع کرنا سخت کٹھن منزل تھی۔ لیکن اُس نے

تہیّہ کر لیا تھا کہ وہ اس تعلیمی سلسلے کو جو حالات نامساعد کی وجہ سے غیر تکمّل رہ گیا تھا ختم کر کے چھوڑے گا۔ دوستوں کے بغیر زندگی گذارنے کی اہلیّت تو وہ اپنے اندر پیدا کر ہی چکا تھا۔ اب اُس نے اپنے تفریحی مشاغل کو حذف کر کے مطالعہ کے لئے وقت بچانا شروع کیا۔ آہستہ آہستہ وہ بہت خوش اسلوبی سے اپنی جدید و قدیم مصروفیتوں کو پہلو بہ پہلو سرانجام دینے کے قابل ہو گیا۔ پہلا سال اُس نے کامیابی سے ختم کر لیا تو اُس کے والد نے بالواسطہ خواہش ظاہر کی کہ شہید اپنی تعلیمی ضروریات کے لئے اُن سے کچھ ماہانہ رقم لے لیا کرے۔ لیکن شہید نے بصد شکریہ اس پیش کش کو قبول کرنے انکار کرتے ہوئے نہایت ادب و انکسار سے عرض کیا کہ وہ اس بارے میں حتی المقدور اپنا بار خود ہی اُٹھائے گا اور جو کچھ وہ اپنی غلطیوں سے ضائع کر چکا ہے اُسے بحدِّ امکان اپنے ہی دست و بازو سے حاصل کریگا۔ دوسرے سال اُس نے قانون کے آخری امتحان میں کامیابی حاصل کر کے گویا اپنے دامنِ شہرت کے سب داغ دھو کر اپنے مستقبل کو ماضی کے بندھنوں سے کلیتہً آزاد کر لیا

اس عرصہ میں مَیں شہید کے حالات و کوائف سے ایک حد تک بیخبر ہی رہا۔ مجھے کاروبار کی مصروفیتیں اور آب و دانہ کی کشش دہلی سے مدراس اور مدراس سے بنگلور لئے پھرتی رہی۔ دو اڑھائی سال جنوبی ہند میں بسر کرنے کے بعد مَیں واپس دہلی آیا۔ اور یہاں آئے چند ہفتے ہوئے تھے کہ اچانک ایک

روز شہید صاحب آدھمکے۔ اُس کی چال ڈھال، لباس کی تراش خراش اور چہرے کی بشاشت سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ حضرت اُس فضا میں سانس لے رہے ہیں جہاں تنگدستی کی بجائے فراخی، دُکھ کی جگہ سُکھ، اور مایوسی کی بجائے امید و کامرانی کی ہوائیں چلتی ہیں۔ جب ہم تفصیل سے ایک دوسرے کے حالات دریافت کر چکے تو اُس نے اپنی رام کہانی کو ختم کرتے ہوئے کہا۔

"ہر شخص کی تباہی اور بربادی کے ظاہری اسباب اگرچہ مختلف ہوں لیکن باطنی سبب ایک ہی ہوتا ہے۔ اور وہ تمام ناکام اشخاص میں مشترک ہے۔ جو انسان اپنے خیالات پر قابو کھو دے اور ضبطِ نفس کی قوت سے محروم ہو جائے اُس کے ایک ہاتھ میں تم آفتاب دے دو اور دوسرے میں ماہتاب۔ اُس کے قدموں میں بیش قیمت خزانے لا کر ڈال دو اور اُس کے سر پر دُنیا کے سب سے بڑے شہنشاہ کا تاج لا کر پہنا دو۔ لیکن وہ کامیابی سے ہمیشہ محروم اور اصلی طاقت سے بے بہرہ رہے گا۔ یاد رکھو۔ خیال کی طاقت دُنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ خارجی زندگی باطنی زندگی کا عکس ہے۔ کامیاب اور ناکام انسان میں یہی فرق ہے کہ خیالات کامیاب انسان کے غلام ہوتے ہیں اور ناکام انسان خود خیالات کا غلام ہم ظاہری اشیاء کو طاقت و توانائی کا منبع اور مخزن سمجھ کر دیوانہ وار اُن کے پیچھے بھاگتے ہیں لیکن یہ حقیقت ہمیشہ ہماری آنکھوں سے اوجھل رہتی ہے کہ وہ طاقت جو پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہٹا دے جو تقدیر کو

کی روانی کو تھام لے اور جو زمین کا سینہ چیر کر مادرِ گیتی کے انمول خزانوں کو باہر کھینچ لائے صرف ہمارے نفس کو میسّر ہے۔

تم میرے ان الفاظ کو محض میرے زورِ بیان پر محمول نہ کرو۔ یہ ایک صداقت ہے روشن و بیّن اور ایک حقیقت ہے واضح و مبرہن، جس کی شہادت تاریخ عالم کے ہر صفحے پر ثبت ہے۔ نپولین نے جب غنیم کے ٹڈی دل لشکر کے سامنے اپنے چند ہزار سپاہیوں کے ساتھ لودی کا پل عبور کرنا چاہا تو دشمن کی گولیاں ساون کے مینہ کی طرح برس رہی تھیں اور پل پر قدم رکھنا گویا براہِ راست موت کے منہ میں جانا تھا۔ سپاہیوں نے اس حالت میں پُل عبور کرنے سے انکار کر دیا تو نپولین، جو حیرت انگیز شجاعت و بسالت کا مالک انسان تھا، آگے بڑھا اور نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ پُل پر سے گذر گیا۔ سالارِ عسکر کی یہ مثال دیکھ کر سپاہی دیوانہ وار دشمن کی فوج پر ٹوٹ پڑے اور آناً فاناً میدانِ جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ نپولین کے اس طرح بچ جانے کو تم اتفاق سے تعبیر کرو گے لیکن میرے نزدیک یہ اُس بہادر کی مشہورِ عالم قوتِ ارادہ و جمعیتِ خاطر کا ایک عظیم الشان مظاہرہ تھا۔

ابھی پچھلے دنوں پشاور میں مجھے ایک ترکی فوجی افسر سے ملنے کا اتفاق ہوا جو افغانستان کی راہ واپس اپنے وطن کو جا رہا تھا۔ یہ شخص خلافتِ عثمانیہ کے وقت فوج میں کسی اچھے عہدے پر ممتاز تھا اور جنگِ عظیم میں کئی موقعوں پر دادِ شجاعت بھی دے چکا تھا۔ اُس کے جسم پر متعدد زخموں کے نشان تھے۔ ایک

روز میں نے اُس سے پُوچھا کہ یہ بتائیے کہ جب آپ جنگ میں شامل ہوتے ہیں اور معرکۂ کشت و خون برپا ہوتا ہے۔ اُس وقت آپ کے دل میں موت کی دہشت پیدا نہیں ہوتی اور ہلاک ہو جانے کے خیال سے آپ گھبراتے نہیں؟"

اُس نے ایک لطیف استعارے میں مجھے جواب دیا کہ "جنگ میں شریک ہونا تو ایک طرف رہا آپ نے تو کبھی میدانِ جنگ کا نقشہ بھی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ اس لیے آپ اُن جذباتِ تہوّر و مردانگی اور اُس جوش و خروش کا ہرگز اندازہ نہیں لگا سکتے جِس سے لڑائی کے وقت ایک سپاہی کا سینہ آتشکدہ بنا ہوتا ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ ہر گولی کی دو آنکھیں ہوتی ہیں۔ اور جب وُہ بندوق کی نالی سے نکلتی ہے تو سیدھی دشمن کے سینہ کا رُخ کرتی ہے جہاں آکر وہ دیکھتی ہے کہ اس سینے میں دل ہے یا نہیں۔ اگر اُسے سینے میں دل نظر آجائے تو واپس چلی جاتی ہے اور اگر اُسے معلوم ہو کہ وہاں دل نہیں تو بے تحاشا سینے کے اندر گھس جاتی ہے۔"

"اُس ترک افسر کا یہ شاعرانہ جواب مجھے مدت العمر نہیں بھول سکتا۔ حقیقت یہی ہے کہ جس سینے کے اندر دل ہے وہ دُنیا کی سب سے بڑی آفت کا مقابلہ کر کے موت کو حیات اور مصیبت کو راحت میں تبدیل کر سکتا ہے اور جس شخص کا سینہ دل کی تڑپ سے محروم ہے وہ طوفان کی آمد سے پہلے ہی بجلی کی چمک اور بادل کی گرج سے خوفزدہ ہو کر موت کی آغوش میں پہنچ جاتا ہے۔ میری چند سالہ

پریشانیوں کے اسباب بظاہر کچھ ہی ہوں لیکن یہ امرِ واقع ہے کہ حقیقی سبب ایک ہی تھا۔ اگر میں اپنے خیالات پر قابو رکھ کر انہیں بے راہ رو ہونے سے بچا لیتا تو یقیناً حوادث کے بھنور میں گرفتار نہ ہوتا۔ میری نگاہ میں میرا بدترین اور ناقابلِ عفو فعل یہ ہے کہ میں نے اپنے معاملے میں دُنیا کو حکم بنانے کی کوشش کی۔ میری خودداری کو تباہ کرنے اور خود مجھے اپنی نظروں میں ذلیل کرنے کی اس سے مکروہ مثال کیا ہو سکتی ہے کہ میں نے حق و انصاف کے لئے سماج کو پکارا درحالیکہ میں جانتا تھا کہ سماج کبھی اُن لوگوں کا ساتھ نہیں دیتی جو ہر رطب و یابس میں بلا چون و چرا اُس کے سامنے سرِ تسلیم جھکانا نہیں جانتے۔ مجھے چاہیئے تھا کہ خاموشی سے واقعات کی رفتار کا ملاحظہ کرتا اور انجام و نتائج کو وقت کے حوالے کر دیتا کہ وقت کا فیصلہ ہمیشہ غیر جانب دارانہ اور رد و رعایت کی آلودگیوں سے پاک و صاف ہوتا ہے۔

"جو ہونا تھا ہو چکا۔ سفرِ زندگی میں طوفانوں کا پیش آنا مقدرات میں داخل ہے ہر انسان کو زود یا بدیر ان طوفانوں سے دو چار ہونا ہے اور میرا عقیدہ ہے کہ طوفانوں میں سے گذرے بغیر زندگی مکمل نہیں ہو سکتی۔ لوہا جب تک آہنگر کے ہتھوڑوں سے پس کر نہ رہ جائے فولاد نہیں بنتا۔ آتشِ غم نفس کو بہت سی آلائشوں سے صاف کر کے حیاتِ انسانی کے متعلق ہمارا نقطۂ نگاہ یکسر تبدیل کر دیتی ہے۔ لیکن ماضی کی ناکامیوں اور ایّامِ رفتہ کے دکھوں کو بھول جانا ہی

قرینِ مصلحت ہے۔ کتنے ہی لوگ ہیں کہ اُن کی زندگیاں محض اس لئے جہنم زار بن گئیں کہ وہ ماضی کی تلخیوں اور مصیبتوں کو فراموش نہ کر سکے اور کتنے ہی انسان ہیں کہ انہوں نے اپنی زندگیوں کو صرف یادِ ماضی سے مسموم کر کے تباہ کر لیا۔ یقین مانو ہماری موجودہ خوشی کی قاتل یہی دو چیزیں ہیں، غمِ ماضی اور فکرِ فردا ہم حال کی ذمہ داریوں کا بار اُٹھانے سے محض اس لئے معذور ہیں کہ ہمارے کاندھے گئے گذرے دنوں کی تلخ اور بے سود یاد کے بوجھ سے دبے جا رہے ہیں۔ چند روز ہوئے میرے ایک ستم ظریف کرم فرمانے ازراہِ ہمدردی میرے گذشتہ واقعات کو موضوعِ کلام بنانا چاہا تو میں نے عرض کیا کہ جو وقت گذر گیا وہ لفظاً و معناً گذر گیا۔ اس لئے گڑے مردے اُکھاڑ کر از سرِ نو بین و بکا میں مصروف ہونے سے کچھ حاصل نہیں۔

"خوشی ایک اضافی چیز ہے اور ہر شخص کے لئے خوشی کا علیحدہ علیحدہ معیار ہے۔ تم نے ابھی میرے متعلق کہا تھا کہ میں جنّت الحمقاء میں گرفتار ہوں۔ یاد رکھو ہر شخص کی اپنے اپنے حالات، واقعات اور معیارِ عیش و نشاط کے مطابق الگ الگ جنّت ہے اور وہی جنّت ہم میں ایک دوسرے کے نزدیک جنّت الحمقاء ہے کون کہتا تھا کہ میرے اُفقِ حیات پر کبھی آفتاب طلوع ہو گا۔ لیکن بگڑ کر بننے، اُجڑ کر بسنے اور گر کر اُٹھنے میں بھی ایک کیف و مسرت ہے جو اس شخص کو ہرگز حاصل نہیں جو تمام عمر نہ کبھی گرا اور نہ تباہی سے دوچار ہوا۔ جن نے شبِ غم

کی تاریکی کو آنسوؤں سے دھو کر صبحِ مسرّت کا درخشاں چہرہ نہیں دیکھا وہ خوشی کی حقیقی اور پائیدار لذّتوں سے واقف نہیں ہو سکتا۔ میں نہیں کہتا کہ صحت کی قدر جاننے کے لئے بیمار پڑنا یا فارغ البالی کی آسائش پہچاننے کے لئے تنگدستی کے شدائد میں مبتلا ہونا ضروری ہے۔ میرا مدعا یہ ہے کہ زندگی چونکہ ایک طویل جدوجہد کا نام ہے جہاں تعطّل کو موت اور ٹھہر جانے کو ہلاکت سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس لئے اگر ہم اپنا سارا زمانۂ حیات کشاکشِ عمل میں گذار دیں تو سمجھ لینا چاہیئے کہ زندگی کا مقصد حاصل ہو گیا۔ تخلیقِ انسانی سے قدرت کو صرف عمل مقصود تھا۔ قرآن جہاں کہتا ہے کہ جن و انس کی پیدائش صرف اس لئے ہوئی کہ عبادت کریں وہاں عبادت سے مراد بھی عمل ہے۔ جدّوجہد ہی ہماری زندگیوں میں ایک جزوِ مشترک ہے۔ بادشاہ ہو یا فقیر، امیر ہو یا غریب ہر شخص کشاکشِ عمل میں گرفتار ہے۔ منازل کی بلندی و پستی میں امتیاز ہو سکتا ہے، مدعا و مقصود کی کمتری و برتری میں فرق ممکن ہے، لیکن اس حقیقت سے انکار محال ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنی اپنی بساط کے مطابق قطعِ منزل و حصولِ مقصد کی تگ و دو میں مصروف ہے۔ ہر انسان چھوٹے پیمانے پر خود ایک خالق ہے اور ان تخلیقی قوّتوں کو ضائع کرنے کا نام ہی گناہ ہے۔ عملی نقطۂ نظر سے بُرا کام کرنے والا انسان اُس شخص سے بہتر ہے جس کی قوّتیں زنگ آلود ہو کر بیکار ہو چکی ہیں۔

جس قسم کی زندگی گذشتہ چند برس میں نے بسر کی ہے وہ کوئی غیر معمولی

انوکھی یا اچنبے کی چیز نہ تھی کہ لوگ یوں حیران ہو ہو کر میری طرف انگلیاں اُٹھاتے پھریں۔ ناکامی زندگی کا ایک جزو ہے اور جو شخص کُل کو دیکھنا چاہتا ہے وہ کل کے مختلف اجزاء دیکھے بغیر کیونکر رہ سکتا ہے اگر زندگی کی تعریف کیجائے تو کہا جائیگا کہ یہ نشیب و فراز، عروج و پستی، ناکامی و کامرانی، تندرستی و بیماری اور اُمید و بیم کا ایک مرقع ہے۔ گویا زندگی کی کامل اور صحیح تعریف میں خوشی کے ساتھ غم اور رنج کے ساتھ مسرت کا آنا لازمی ہے۔ پھر اگر مَیں نے زندگی کے حسین و روشن رُخ سے لطف اندوز ہونے کے بعد کچھ عرصہ کے لئے اس کے تاریک اور درشت پہلو سے متصل رہ کر اپنے دل و دماغ کے لئے سامانِ عبرت و بصیرت حاصل کر لیا تو یقیناً وہی ہوا جو فطرت کا تقاضا اور آئینِ قدرت کا مدعا تھا۔ آگ کی خاصیّت ہے کہ وہ ہر چیز کو جلاتی ہے۔ اگر ہم اس آگہی کے بعد اپنا ہاتھ آگ میں رکھیں تو اُس کے جل جلنے سے ہمیں حیرت نہیں ہوتی۔ کیونکہ علّت و معلول کے سلسلہ میں ان طبعی نتائج کا ظہور ضروری ہے۔ اسی طرح جب زندگی کے متعلق ہمیں بخوبی معلوم ہے کہ یہاں پھولوں کے پہلو بہ پہلو کانٹے بھی ہیں، تو مرغزاروں میں گھومنے اور باغوں میں گل چینی کرتے ہوئے کانٹا چُبھ جانے سے شکوہ و شکایت کا دفتر کھول بیٹھنا یا گریہ وزاری سے آسمان سر پر اُٹھا لینا ایک مضحکہ انگیز حماقت نہیں تو کیا ہے؟"

سوزِ ناتمام کے متعلق چند رائیں

سر محمد یعقوب

"عاشق صاحب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے افسانوں کے واسطے ہندوستانی زندگی، ہندوستانی تجربات اور ہندوستانی جذبات منتخب کرتے ہیں اور اُن کے اظہار کے لئے ایسے سلیس اور دلکش الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کے ذہن میں کیریکٹر تصویری ہیئت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ خوبی بہت کم فسانہ نگار حضرات میں پائی جاتی ہے۔"

ڈاکٹر سر شفاعت احمد خاں

"سوزِ ناتمام ایک شاندار تصنیف ہے جس میں عاشق حسین بٹالوی کی انشا پردازی کی تمام امتیازی خصوصیات موجود ہیں۔ زبان کی پاکیزگی، خیالات کی بلندی اور اندازِ تحریر کی سحر آفرینی نے اسے ادب اُردو میں ایک نمایاں مقام دے دیا ہے۔"

ڈاکٹر سر گوکل چند نارنگ

"سوزِ ناتمام ادبیات میں ایک بلند مرتبے کی اہل ہے۔ عاشق حسین بٹالوی کو اُردو زبان پر حیرت انگیز قدرت حاصل ہے اور جس مہارت فن اور قابلیت کے ساتھ آپ افسانوں میں نفسِ انسانی کا تجزیہ کرتے اور افرادِ قصّہ کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کو بے نقاب کرتے ہیں وہ ایک نوجوان مصنّف کے لئے قابلِ صد تحسین ہے۔"

جسٹس مرزا سر ظفر علی

"زبان کی روانی، اظہارِ مطالب کی قوت، ادائے بیان کی ندرت، تراکیب کی جدت اور فقرات کی شگفتگی کے اعتبار سے اُردو ادب کے موجودہ دَور میں شاید ہی اس سے بہتر کتاب لکھی گئی ہوگی"۔

خواجہ حسن نظامی

"عاشق حسین صاحب نے جابجا اپنے سیدھے سادے لفظوں میں حیاتِ بشری کے نشیب و فراز اور معاشرتی کشاکش کے فلسفوں کو جس خوبی سے ادا کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ اُس کی داد نہ دینا ایک بڑا جرم ہے"۔

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی

"معمولی اور روزمرہ کے واقعات کو دلچسپ بنانا اور واقعیت کو نغزیت کا یعنی کلاسیکل رنگ دینا عاشق صاحب کو خوب آتا ہے۔ اسلوبِ بیان اُنہوں نے ایسا رنگین اختیار کیا ہے جو از حد دلآویز ہے۔ عاشق حسین صاحب اُس طرزِ خاص کے اہل ہیں جس کو نباہنا اور دلچسپ بنانا ہنسی کھیل نہیں"۔

ملک برکت علی ایڈووکیٹ ایم۔ ایل۔ اے

"سوزِ ناتمام کے افسانے دُنیا کے نشیب و فراز اور زندگی کے حقائق کا ایسا دلکش مرقع پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والا مسحور ہو جاتا ہے۔ زبان اور اندازِ بیان کی خوبیوں کے اعتبار سے یہ کتاب اس دَور کی بہترین ادبی تصانیف میں نمایاں جگہ پانے کی مستحق ہے"۔

مولانا منصور احمد مرحوم ایڈیٹر "ادبی دُنیا"

"عورت کی فطرت، گناہ کی اصلیّت اور انجام، معاشرت کی خامیاں اور خرابیاں، زندگی اور زندہ دلی ان افسانوں کے مضامین ہیں اور اُن کو جس بے باکی اور قدرت کے ساتھ مصنّف نے نباہا ہے اُس کی نظیر ہمیں اپنے اہل قلم میں بہت کم ملتی ہے۔"

سیّد عبداللہ بریلوی ایڈیٹر روزنامہ "بمبئی کرانیکل"

"بعض افسانوں کے کردار اس قدر دلچسپ ہیں کہ کہانی ختم کرنے پر بھی اُن کی شخصیت کا طلسم پڑھنے والے کے دل ودماغ پر طاری رہتا ہے اور انسان چشمِ پُرنم کے ساتھ اُن کو خدا حافظ کہنے پر مجبور ہوتا ہے۔ ان کہانیوں کا اہم ترین حصّہ وہ ہے جہاں افرادِ قصّہ ایک دوسرے سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ یہیں مصنّف نے اپنی حیرت انگیز قادر الکلامی کو کام میں لاکر عہدِ حاضر کے پر پیچ معاملات اور فطرتِ انسانی کے دقیق اسرار کی نقاب کشائی کی ہے طرزِ تحریر میں سلاست اور روانی ہے۔ آورد کا نام و نشان نہیں۔"

مرزا محمد سعید صاحب دہلوی ایم۔ اے۔ آئی۔ ای۔ ایس

"عاشق صاحب کی ادبی کوشش بحیثیت مجموعی بہت کامیاب ثابت ہوئی ہے اور اُن کے افسانوں میں کردار نگاری اور ترجمانی جذبات کی بہت اچھی مثالیں موجود ہیں۔"

مطبوعہ
انتظامی پریس حیدرآباد دکن